Scanned with CamScanner

ڈاکٹر منور ہاشمی نمبر

۵
سہ ماہی دھنک رنگ فتح جنگ

اُردو زبان وادب کی ضَوفشانیوں سے مزین
فتح جنگ سے نکلنے والا واحد مجلّہ

(جنوری، فروری، مارچ ۲۰۲۰ء)

نایاب پبلی کیشنز، اٹک (پاکستان)

مصنّفین کی تحریروں سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ مجلّہ ہذا کے مسودہ کی پروف خوانی عرق ریزی سے کی گئی ہے تاہم اغلاط کے رہ جانے کے بارے میں ادارے کو مطلع کریں تا کہ اگلے ایڈیشن میں درستی کی جا سکے۔(ادارہ)

برائے خط کتابت:
☆ مکان نمبر 588، گلی نمبر 10 محلہ نگر اٹک کینٹ
☆ الحق کمپوزر ضلع کچہری اٹک
☆ پہلوان چوک فتح جنگ شہر

برقی پتہ: alhaqcomputer@gmail.com

موبائل نمبر:
(سرپرست اعلیٰ:0313-4749191)
(مدیر اعلیٰ:0312-5107270)
(مدیر:0332-5858567)
وٹس ایپ نمبر:0313-3780058

قیمت مجلّہ: -/900روپے

فہرست

انٹرویوز

شخصی مضامین/خاکے

شخصیت اور فن

ڈاکٹر منور ہاشمی بحیثیت نعت گو

ڈاکٹر منور ہاشمی بطور غزل گو

ڈاکٹر منور ہاشمی بطور اقبال شناس

ڈاکٹر منور ہاشمی بطور محقق

''حکایاتِ ہاشمی'' کا جائزہ

منظوم خراجِ تحسین

اداریہ(۱)

''نعت نمبر'' کی کامیاب اشاعت کے بعد ملک بھر کے ادیبوں نے ہمیں جس محبت سے نوازا، اس پر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے حبیبؐ کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کرنے کی سعادت سے بہرہ مند فرمایا تاہم ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''

ڈاکٹر منور ہاشمی عہد ساز شخصیت ہیں، ایسی ہستیاں مدت مدید کے بعد جنم لیتی ہیں۔ آپ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں اُردو سے محبت کرنے والوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ہم نے نعت نمبر کے آخری صفحے پر ڈاکٹر منور ہاشمی نمبر کا اعلان کر دیا تھا یوں پاکستان اور بیرون ممالک جہاں جہاں نعت نمبر پہنچا، ڈاکٹر صاحب سے محبت کرنے والوں نے ہمیں مضامین ارسال کرنا شروع کر دیے۔ اُن کے دوستوں اور شاگردوں نے بھی اُن کی شخصیت اور فن پر مضامین لکھے۔ اگر سارے مضامین من وعن شائع کر دیے جاتے تو زیر نظر شمارہ ہزار صفحات سے تجاوز کر جاتا یوں میری ہدایت پر مدیر سجاد حسین سرمد نے مضامین کا بغور مطالعہ کیا، جو اشعار بتکرار آتے تھے، انھیں کئی مقامات پر حذف کر دیا گیا۔ انھی مقامات پر اشعار کی تکرار نظر آئے گی جہاں شعر کے حوالے سے اچھوتا موقف نظر آتا ہے نیز ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے تعارفی مضامین میں سے کثیر حصے کو نکال دیا گیا ہے کیوں کہ آغاز میں مدیر اعلیٰ کی طرف سے اُن کا مفصل تعارف نامہ موجود ہے۔ میرے کئی جاننے والے دوست جو ہاشمی صاحب کے عقیدت مند تھے اور اُن پر مضمون لکھ چکے تھے، اُن سے معذرت کرنا پڑی جس پر ندامت ہے تاہم ایسا کرنا ہماری مجبوری تھی۔

ڈاکٹر منور ہاشمی ایک گوہر نایاب ہیں۔ ہمارا فرض تھا کہ اُن کی عظمت کا اعتراف کریں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہوئے۔ یقیناً یہ شمارہ علمی اور ادبی حلقوں میں مقبولیت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

حسین امجد
(سرپرست)

اداریہ(۲)

دھنک رنگ کا ڈاکٹر منور ہاشمی نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

علمی و ادبی دنیا کا یہ المیہ ہے کہ ہم زندگی میں کسی کی قدر نہیں کرتے۔ جن کے نظریات نے قوموں کی سمت کا تعین کیا ہے، اُن کی زندگی کا مطالعہ کریں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ یہ سلسلہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ میں یا میرے جیسے چند لوگ تاریخ عالم کے اس اجتماعی رویے کو قطعاً تبدیل نہیں کر سکتے البتہ کوشش کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ ہم زندہ قوم ہیں، ہمیں اپنے محسنوں کا احترام کرنا ہے۔ اگر ہم اپنی بقا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر منور ہاشمی اُردو ادب کا نمایاں نام ہے۔ شاعری، تنقید، صحافت اور بالخصوص اقبالیات کے حوالے سے اُن کی خدمات کا اعتراف ہر فورم پر کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فتح جنگ سے نکلنے والے ادبی رسالہ ''عروج'' کی سرپرستی بھی کرتے رہے ہیں۔ علم و ادب کے لیے اتنی خدمات اور فتح جنگ شہر سے تعلق خاطر کے باعث ''دھنک رنگ'' کا یہ فرض تھا کہ اُن کی عظمت کا اعتراف کیا جائے۔ الحمدللہ! آج ہم سرخرو ہیں اور ثابت کر دیا ہے کہ فتح جنگ کے باسی اپنے محسنوں کی قدر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر منور ہاشمی کا شکریہ ادا کروں گا کہ انھوں نے ہمیں اس قابل سمجھا اور اجازت دی کہ ہم حق محبت ادا کر سکیں۔

داؤد تابش

(مدیر اعلیٰ)

اداریہ (۳)

ڈاکٹر منور ہاشمی نمبر کا اعلان چھے ماہ قبل کر دیا گیا تھا۔ پاکستان اور دیگر ممالک میں مقیم ڈاکٹر صاحب کے دوستوں اور شاگردوں نے اس سلسلے میں بھرپور قلمی تعاون کیا، حوصلہ افزائی کی اور قابلِ رشک سمجھا۔ سچ پوچھیں تو ہم پر ''آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے'' والی کیفیت طاری ہے۔ میری درخواست پر ڈاکٹر صاحب نے اس نمبر کی اشاعت کی اجازت دی، ہنوز یہی سمجھ رہا ہوں کہ ایک خواب دیکھ رہا ہوں اور ابھی آنکھ کھل جائے گی! انھوں نے اپنی شخصیت اور فن کے حوالے سے نمبر ترتیب دینے کی ذمہ داری مجھ ہیچ مدان کو سونپی، اس احساس نے مجھے ادبی وقار اور اعتماد بخشا ہے۔ یقیناً یہ نمبر نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں ڈاکٹر صاحب سے محبت کرنے والوں کے لیے گراں قدر تحفہ ثابت ہوگا۔

حسین امجد اور داؤد تابش کی نگرانی میں یہ سفر خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہے، ان دونوں صاحبان کی علم دوستی قابلِ رشک ہے، جس کی مثالیں اس دور میں کم ہی نظر آتی ہیں۔ دیگر احباب میں محمود ناصر، ندیم افضال اور طلعت نورین سحر کا شکریہ ادا کروں گا۔ شمارہ ہٰذا کے بارے میں آپ کی آرا کا انتظار رہے گا۔

پچھلے دنوں معروف افسانہ نگار حامد سراج انتقال کر گئے۔ غفران کامل کے والد اور دلاور علی آزر کی والدہ کا انتقال ہوا۔ اللہ انھیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

سجاد حسین سرمد
(مدیر)

حمدِ باری تعالیٰ

جو اٹھا کے بارِ گناہ ہم تری بارگاہ میں آ گئے
نہ کوئی خطر نہ کوئی حذر کہ تری پناہ میں آ گئے

تری سطوتوں کے علم لیے ترے جاں نثار جو چل پڑے
ہوئے ریزہ ریزہ پہاڑ بھی اگر ان کی راہ میں آ گئے

جو غریب پست نصیب تھے، وہ بدل گئے، وہ سنور گئے
ہوئے دو جہاں میں وہ محترم جو تری نگاہ میں آگئے

ہوئی ہر طرف نئی روشنی ترے ذکر کی ترے فکر کی
کئی ماہتاب خیال کے جو شبِ سیاہ میں آگئے

جو ترے کلام کی عظمتیں مرے دل پہ کھلتی چلی گئیں
کئی انقلاب حیات کے مرے سال و ماہ میں آگئے

یہ ترے کرم کا کمال ہے جو میں گرتے گرتے سنبھل گیا
لگا یوں کہ حوصلے کوہ کے کسی مشتِ کاہ میں آگئے

پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی

نعتِ رسول مقبول

دم بدم پھیلتا جاتا ہے اُجالا دل میں
کوئی مہتاب یا اُن کی ہے تمنا دل میں

موت آئے تو مدینے کی فضاؤں میں مجھے
میں نے ارمان کوئی اور نہ رکھا دل میں

دشمنِ جاں بھی اگر آپ کے در پر آیا
اس نے بھی خلق کے پیکر کو اتارا دل میں

جسم کو ، روح کو اور ذہن کو ظاہر کر کے
میں جو بیٹھا تو خیال آپ کا اُترا دل میں

آپ کی نسبتِ عالی ہے حوالہ میرا
میں نے جو کام کیا پہلے یہ سوچا دل میں

یہ بھی شاید ہے مدینے کی زمیں کا ٹکڑا
جگمگاتا ہے کوئی نقشِ کفِ پا دل میں

وہی کیفیتیں راس آئیں منورؔ مجھ کو
دل مدینے میں رہے یا ہو مدینہ دل میں

پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی

سلام

غمِ حسین میں دل جس کا رو نہیں سکتا
قسم خدا کی وہ انسان ہو نہیں سکتا

لگا ہے داغ جبینِ فرات پر ایسا
کہ جس کو کوئی سمندر بھی دھو نہیں سکتا

غمِ حسین سفینے کا ناخدا ٹھہرا
کوئی بھنور بھی اسے اب ڈبو نہیں سکتا

حسین تیری صدا گونجتی ہے ہر جانب
یزید وقت لحد میں بھی سو نہیں سکتا

مثالِ روحِ رواں ہے ہمارے جسموں میں
یہ سانحہ تو فراموش ہو نہیں سکتا

عروقِ دینِ نبی میں رواں ہے خونِ حسین
ابد تلک اسے اب کچھ بھی ہو نہیں سکتا

حسین تیری شہادت ہی حدِ فاصل ہے
کوئی بھی کفر کو حق میں سمو نہیں سکتا

نہیں یہ لفظ منوؔر، یہ اشک ہیں میرے
کہ اس طرح کوئی موتی پرو نہیں سکتا

پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی

تعارف نامہ ڈاکٹر منور ہاشمی

داؤد تابش

(مدیر اعلیٰ دھنک رنگ)

ہر عہد میں ایسی ہستیاں ضرور ہوتی ہیں جو اپنے ماننے والوں کے لیے سمت نمائی کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ ہر شعبۂ زندگی میں ایسے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ ادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اُردو ادب میں کئی ادیب ایسے ہیں جو نام کماتے ہیں اور جن کے علمی کمالات سے مدت مدید تک استفادہ کیا جاتا ہے۔ ایسا اسی صورت میں ہوتا ہے جبکہ کلام میں فنی و فکری حوالوں سے امکانات کے جہاں روشن ہوں۔ میر، غالب، مومن اور مصحفی کے ادوار میں اُن جیسے یا فنی کمال میں اُن سے بڑھ کر کئی شعرا تھے لیکن چونکہ اُن کا کلام عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں تھا اور جامعیت سے معریٰ تھا، لہٰذا زندگی میں تو کسی نہ کسی طرح انھوں نے اپنا نام بنا لیا لیکن بعد ازاں مورخ نے اُن کے شعری مرتبے کا تعین کرتے ہوئے محض تاریخی اہمیت دے کر ادبی حوالے سے نظرانداز کر دیا۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کا تعلق اُردو ادب کے اُن شعرا میں ہوتا ہے جن کی ادبی خدمات کو مدت دراز تک یاد رکھا جائے گا۔ ان کی ادبی خدمات کا کینوس وسیع ہے اور مختلف جہات کا حامل ہے۔ شاعر، ناقد، محقق، مدرس اور اقبال شناس ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف انتظامی عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔

آپ کا اصل نام سید منور شاہ ہے۔ آبائی علاقہ ساہیوال (پنجاب) ہے۔ یکم جنوری ۱۹۵۷ء کو سید عبداللطیف شاہ کے ہاں پیدا ہوئے جو خود بھی فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے۔ آپ کا قلمی نام منور ہاشمی ہے۔ ''منور'' بطور تخلص استعمال کرتے ہیں جبکہ بعض مقامات پر ''ہاشمی'' بھی تخلص کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اقبالیات کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا جبکہ آپ کی پروفیشنل تعلیم بی ایڈ ہے۔

ڈاکٹر صاحب مختلف عہدوں پر فائز رہے جن کی تعداد سترہ کے قریب ہے جن میں انتظامی امور اور تدریسی سرگرمیاں شامل ہیں۔ انتظامی عہدوں پر متعین رہنے والے تخلیق کار اپنے فن کی تشہیر میں کوئی دقیقہ فروگزاشت اٹھا نہیں رکھتے لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہاں بھی خود کو نمایاں کرنے کے لیے ان کھوکھلے حربوں کا سہارا نہیں لیا کیونکہ انھیں اپنے علمی مقام سے کماحقہٗ آشنائی ہے۔ اُن کی ملازمتوں اور دیگر مصروفیات کی فہرست حسب ذیل ہے:

۱۔ چیئرمین شعبہ اُردو، نادرن یونیورسٹی نوشہرہ (۲۳ نومبر ۲۰۱۸ء)

۲۔ اسسٹنٹ پروفیسر وفاقی اُردو یونیورسٹی اسلام آباد (۲۰۰۹ء تا ۲۰۱۲ء)

۳۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر پاکستان ایمبیسی کالج جدہ (۱۹۹۳ء۔۲۰۰۶ء)

۴۔ مینجنگ ڈائریکٹر ''روز'' ٹیلی ویژن اسلام آباد (۲۰۰۷ء تا ۲۰۰۹ء)

۵۔ ڈائریکٹر ریسرچ ایسٹرن ٹیلی ویژن نیٹ ورک (۲۰۰۶ء تا ۲۰۰۷ء)

۶۔ سینئر پروڈیوسر ریڈیو پاکستان راولپنڈی (۱۹۸۳ء تا ۱۹۹۳ء)

۷۔ صوبائی اسکاؤٹ آرگنائزر بلوچستان (۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۱ء)

۸۔ وزٹنگ پروفیسر (اُردو) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد (۲۰۰۳ء تا ۲۰۰۴ء)

۹۔ وزٹنگ پروفیسر (اُردو) کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ سعودی عرب (۲۰۰۲ء تا ۲۰۰۳ء)

۱۰۔ وزٹنگ پروفیسر (اُردو) مدینہ یونیورسٹی، مدینہ، سعودی عرب (۲۰۰۲ء تا ۲۰۰۳ء)

۱۱۔ رکن ایگزیکٹو کونسل پاکستان رائٹرز گلڈ

۱۲۔ سابق رکن ایڈوائزری کونسل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

۱۳۔ رکن نصاب کمیٹی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

۱۴۔ صدر عالمی اُردو مرکز جدہ

۱۵۔ رکن قومی نصاب کمیٹی (تشکیل کردہ وزیراعظم پاکستان)

درج بالا فرائض اور ملازمتوں کی فہرست دیکھنے کے بعد اُن کی ادبی خدمات پر نظر دوڑائیں تو حیرانی دو چند ہو جاتی ہے کہ اتنی مصروفیات کے باوجود ہاشمی صاحب پرورشِ لوح و قلم کرتے رہے۔ اُن کا علمی، تنقیدی، شعری اور صحافتی سرمایہ نہ صرف مقداری بلکہ معیاری حوالے سے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اُن کی مطبوعہ کتب کی تعداد بارہ ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ سوچ کا صحرا''، (مطبوعہ ۱۹۸۰ء) (شاعری)

۲۔ کربِ آگہی، (مطبوعہ ۱۹۸۳ء) (شاعری)

۳۔ نخلستان، مطبوعہ (۱۹۸۸ء) (نثر)

۴۔ پردیسی کی یاد (مطبوعہ ۱۹۹۰ء) (ناولٹ)

۵۔ بے ساختہ (مطبوعہ ۱۹۹۵ء) (شاعری)

۶۔ لوح بھی تو قلم بھی تو، (مطبوعہ ۱۹۹۹ء) (نعتیہ شعری مجموعہ)

۷۔ نیند پوری نہ ہوئی، (مطبوعہ ۲۰۰۵ء) (شاعری)

۸۔ عملی صحافت (جامعاتی نصاب)

۹۔ غزل اے غزل (کلیاتِ غزل)

۱۰۔انتخاب مومن (مرتبہ)

۱۱۔فیضِ اقبال (مضامین)

۱۲۔تجزیات (تحقیقی مقالہ جات)

پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان ''اقبال کی اردو شاعری میں فطرت نگاری'' منتظرِ اشاعت ہے۔ یہ مقالہ سندھ یونی ورسٹی، حیدرآباد سے ۲۰۰۲ء میں تکمیل آشنا ہوا ہے۔ نیز ''اقبال کے اثرات معاصرین پر'' کے عنوان سے مضامین کا مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی خوش بخت ہیں کہ اللہ تعالی نے انھیں زندگی میں عزت وشہرت سے نوازا۔ مختلف القابات، خطابات اوراعزازات سے نوازے گئے۔ یونیورسٹی سطح پر آپ کے علم وفن پر تحقیقی مقالے لکھے گئے۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔منور ہاشمی بطور غزل گو (ایم فل) جی سی یونیورسٹی فیصل آباد۔

۲۔منور ہاشمی (شخصیت اور فن) ایم اے، وفاقی اُردو یونیورسٹی اسلام آباد

۳۔منور ہاشمی کی غزل میں رومانویت، ناردرن یونیورسٹی نوشہرہ۔

۴۔منور ہاشمی کی غزل میں سماجی شعور، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی فیصل آباد

۵۔منور ہاشمی کی غزل کا فکری وفنی جائزہ، ایجوکیشن یونیورسٹی لاہور

ہاشمی صاحب کو حکومت کی طرف سے جن خطابات سے نوازا گیا اُن میں: محسنِ اُردو، خادمِ اُردو، سفیرِ علم وادب اوراُردوادب کا شیخ سعدی، شامل ہیں۔ اگر اُن کی خدمات اوراُردو کے لیے دی گئی قربانیوں کا جائزہ لیں تو یہ اعزازات اپنی کم دامانی کا نقشہ پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ آپ کی خدمات کے سامنے ان خطابات کی اہمیت کم ہے تاہم نفسانفسی اور مادیت پرستی کے اس دور میں ایک ادیب کے لیے یہ بھی گراں بہا سرمائے سے کم نہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی خدمات کو سراہتے ہوئے مختلف ادبی تنظیموں کی طرف سے بھی ایوارڈز سے نوازا گیا جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ایشین ایوارڈ	۲۔دھن چوراسی ایوارڈ	۳۔بولان ایوارڈ
۴۔اقبال ایوارڈ	۵۔محسنِ اُردو ایوارڈ	۶۔نشانِ جامعہ ایوارڈ
۷۔بہترین اُستاد ایوارڈ	۸۔نشانِ اُردو ایوارڈ	۹۔رومی ایوارڈ
۱۰۔اہلِ قلم ایوارڈ	۱۱۔نشانِ فضیلت ایوارڈ	

۱۲۔نشانِ کارکردگی ایوارڈ (وفاقی اُردو یونیورسٹی)

یادرہے کہ علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئرپورٹ لاہور کا نام رکھنے کا اعزاز بھی آپ کو حاصل ہے۔

ڈاکٹر صاحب مختلف اخبارات ورسائل کے ساتھ بھی وابستہ رہ چکے ہیں جن میں ''گروپ ایڈیٹر'' پاکستان گروپ

آف نیوز پیپرز ،سینئر سب ایڈیٹر روزنامہ نوائے وقت ،ڈپٹی ایڈیٹر روزنامہ زمانہ کوئٹہ،ایڈیٹر انچیف ماہنامہ دنیائے اُردو اسلام آباد،ایڈیٹر روزنامہ میزان کوئٹہ،ایڈیٹر انچیف القلم جدہ،سرپرست سہ ماہی عروج فتح جنگ شامل ہے۔مختلف ادبی تنظیموں کی سرپرستی کے ساتھ ملک اور بیرونِ ملک ادبی سیمناروں، مشاعروں اورادبی پروگراموں میں آپ کواعزاز کے ساتھ مدعو کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی زیرِ نگرانی چودہ پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جا چکے ہیں جبکہ ایم فل پر درجنوں معیاری کام آپ کے سایۂ شفقت میں طے پا چکے ہیں۔ایچ ای سی کے منظور شدہ جرائد میں آپ کے مضامین اعزاز کے ساتھ شائع ہوتے ہیں نیز بیرونِ ملک اُردو ادب کے حوالے سے نکلنے والے جرائد میں آپ کے مضامین کوقدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ان دنوں اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ سمبلی ڈیم روڈ اسلام آباد میں رہائش پذیر ہیں۔ناردرن یونیورسٹی نوشہرہ میں ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز کے عہدے پر متمکن ہیں اور تدریسی امور بھی سرانجام دے رہے ہیں۔ جامعہ ناردرن میں آپ کی سرپرستی میں طلباء کی ادبی تنظیم ’’بزمِ عشاقِ اُردو‘‘ ادبی اورتخلیقی سرگرمیوں میں مصروف ہے نیز نوشہرہ میں ’’جدت پسند مصنفین‘‘ بھی آپ کی زیرِ نگرانی کام کررہی ہے جس کے باقاعدہ اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔

انٹرویوز

(۱)

سوال: پاکستان میں تخلیق ہونے والا ادب عالمی سطح پر کس معیار کا حامل ہے؟

جواب: اس وقت پوری دنیا میں نسبتاً کم درجے کا ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ انٹرنیٹ کا تسلط ہے۔ موبائل ٹیکنالوجی نے انسان سے فراغت کے لمحات چھین لیے ہیں۔ اس کے پاس غور وفکر کے لیے ذرا سا وقت بھی نہیں اسے لکھنے اور ادب تخلیق کرنے کا شوق ضرور ہے مگر اس شوق کی تکمیل کے لیے سوچنے اور توجہ کے لیے وقت نہیں ہے۔ سطحی قسم کا ادب تخلیق کر کے وہ نمائش کے لیے پیش کر دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ پوری دنیا اسے پسند کرے۔ پاکستان کے اندر بھی یہی صورت حال ہے جو شاعر یا نثر نگار کبھی اپنی غزل کی تخلیق پر گہری توجہ مرکوز کرتا تھا اب وہی توجہ اپنی سطحی قسم کی تخلیق کی تشہیر پر صرف کرتا ہے۔ ہمارا یہ المیہ ہے کہ ہم احساسات کی دنیا سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ادب احساسات کو لفظوں میں بیان کرنے کا نام ہے۔ آج ان لفظوں کو احساسات سے دور کر دیا گیا ہے۔ اب ان لفظوں کو صفحۂ قرطاس بھی نصیب نہیں۔ جو الفاظ کاغذ پر نہیں اُترتے وہ دلوں میں کیسے اثر کر سکتے ہیں۔ موبائل میں محفوظ رہنے والے الفاظ ایک لمحے میں اُڑ بھی جاتے ہیں۔ ان کا کوئی نقش اور اثر باقی نہیں رہ جاتا۔ پوری دنیا میں اس طرح ہو رہا ہے۔ احساسات سے عاری سطحی قسم کا ادب عموماً تخلیق ہو رہا ہے۔ پاکستان کا ادیب یا شاعر اسی المیے سے دوچار ہے۔

سوال: اس وقت کون سی صنفِ ادب زیادہ ترقی پذیر ہے؟

جواب: غزل آغاز شاعری سے آج تک تمام اصناف پر حاوی ہے۔ تمام اصناف سے مقبول ہے۔ آج بھی غزل ہی زیادہ لکھی جا رہی ہے۔ انٹرنیٹ والے شاعری بھی زیادہ غزل میں لکھتے ہیں کیونکہ پانچ سات اشعار پر مشتمل تحریر فیس بک پر فوراً آ جاتی ہے۔ اور فوراً اس پر ردِعمل بھی آنا شروع ہو جاتا ہے۔ غزل اپنے مضامین کے حساب سے بہت جاندار صنفِ سخن ہے۔ اس کی مقررہ اور مسلمہ حیثیت ہے۔ غزل کے ایک شعر میں ہزار صفحے کا پورا ناول سما جاتا ہے۔

سوال: ۔غزل میں تجربات کی نوعیت کیا ہے؟

جواب: غزل میں تجربے نہیں ہو سکتے بعض لوگوں نے اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے ایسے تجربے کرنے کی کوشش کی مگر ان تجربات کو کسی سطح پر پذیرائی نہ مل سکی ایسے لوگ نمایاں ہونے کے بجائے گمنام ہو چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ غزل میں ہیئت کے تجربات کی کوئی گنجائش نہیں کہ اپنی موجودہ ہیئت میں جو جاذبیت اور خوب صورتی رکھتی ہے۔ اس کا جواب نہیں البتہ نئے مضامین اور افکار کی اس میں بہت زیادہ گنجائش رہتی ہے۔

سوال: آپ نے بھی غزل کو ذریعہ اظہار اپنایا۔ غزل کو ترقی دینے اور مقبول عام صنف بنانے میں آپ کا بھی ایک اہم کردار ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی مرحوم نے آپ کی ایک کتاب میں لکھا تھا کہ شاعروں کے ہجوم

میں آپ نے اپنی انفرادیت ثابت کردی ہے۔آپ اپنی انفرادیت کے حوالے سے خود کیا کہتے ہیں؟

جواب: میں خود نہیں کہتا، ڈاکٹر وحید قریشی مرحوم جیسے عظیم محقق اور نقاد کی رائے کیا کافی نہیں؟ اپنی غزل پر تبصرہ کرنا میرے لیے ناممکن ہے، میری کتابیں موجود ہیں انہیں پڑھ کر کوئی شخص بھی اپنی رائے قائم کرسکتا ہے۔ میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ جب شاعروں کے پاس نئے مضامین ہیں یا پرانے مضامین کے اظہار کا جدید اسلوب ہے ان کی غزل انفرادیت کی حامل ہے۔ضروری نہیں کہ لفاظی کے ذریعے تحریر کو بھاری بھرکم بنایا جائے الفاظ جتنے آسان ہوں گے تفہیم اور ابلاغ اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے،جس شعر کا ابلاغ مشکل ہو وہ منفرد نہیں ہوسکتا۔

سوال: نثری نظم بھی تقریباً پانچ دہائیوں سے میدان میں ہے پہلے پہل اس کی بہت مخالفت ہوئی لیکن آہستہ آہستہ اس کو حمایت اور پذیرائی حاصل ہوتی گئی آپ کا اس حوالے سے کیا خیال ہے؟

جواب: میں نے اس کی ہمیشہ مخالفت کی ہے آج بھی اس کا سب سے بڑا مخالف ہوں ۔ میں اس کو آج بھی شاعری نہیں سمجھتا۔نظم اور نثر دو الگ الگ اصناف ہیں۔ یا نظم ہوتی ہے یا نثر ہوتی ہے۔کسی داڑھی مونچھ والے کڑیل جوان کا نام نازیہ، پروین رکھ دینے سے اس کی جنس تبدیل نہیں ہوسکتی۔یا کسی نازیہ پروین کا نام پہلوان خان رکھنے سے وہ پہلوان خان نہیں بن سکتی۔ یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔نثری نظم لکھنے والے یہی حرکت کررہے ہیں۔اصل میں غزل گوئی میں ناکام رہنے والے چند شاعروں نے نثری نظم جیسی قباحت کا بیج بویا تھا۔آج مجھے بعض اچھے شاعروں پر حیرت ہوتی ہے جو اس نازیہ پروین کے پیچھے پڑے ہیں،ان کی اچھی غزلیں اور نظمیں بھی پس منظر میں چلی گئی ہیں ۔اگر نثری نظم کو شاعری تسلیم کرلیا جائے تو سرسید احمد خان، مرزا غالب، ابوالکلام آزاد اور ان سے بھی پہلے کی ساری نثر کو نظم کہنا پڑے گا۔

سوال: فروغِ ادب کے لیے کام کرنے والے اداروں کے حوالے سے آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: ان اداروں کے حوالے سے یہی عرض کروں گا کہ ان کی عقل و دانش پر رونا آتا ہے۔ان اداروں نے فروغ علم وادب کے علاوہ سب کچھ کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مناسب شخص مناسب جگہ پر نہیں ہوتا۔ادبی اداروں کو دہاڑی لگانے والے لوگوں کے سپرد کردیا جاتا ہے۔کچھ مفاد پرست لوگ ان کے گرد جمع ہوجاتے ہیں ان کی مشاورت سے کام ہوتے ہیں ان کے معیار کے مطابق کام ہوتے ہیں خالص ادیب اور شاعر ان اداروں سے باہر ہوتے ہیں۔دو نمبری اور جعلسازی فروغ پا رہی ہے۔

سوال: ان اداروں کے ذریعے ہر سال ادیبوں اور شاعروں کو حکومتی ایوارڈز ملتے ہیں آپ کیا کہتے ہیں اس حوالے سے؟

جواب: اچھے تخلیق کار کو حکومتی ایوارڈ کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ اہل علم میں اگر اس کو پذیرائی حاصل ہے تو اس کے لیے سب

سے بڑا اعزاز یہی ہوتا ہے آج کل دیکھنے میں آرہا ہے کہ بعض نام نہاد شاعر اور ادیب ایوارڈز حاصل کرنے کے لیے سفارش کرواتے ہیں حکومت کی قریبی شخصیات سے تعلقات بناتے ہیں۔ رشوتیں دیتے ہیں اور ایوارڈز حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، خالص ادیب محروم رہ جاتے ہیں۔ آپ خود ہی سوچیں اس صورتحال میں سچے اور سُچے ادب کا فروغ کیسے ہو سکتا ہے۔ گزشتہ ایک حکومت نے تو اپنے سیاسی کارکنوں کو ادبی اعزازات سے نوازا۔ ان لوگوں کا ادب سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ اس پر یہ چالاکی بھی کی جاتی ہے کہ اعزازات کے لیے چنے والی فہرست میں ایک آدھ اچھے شاعر یا ادیب کا نام بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بعض اوقات اپنے ضمیر کی آواز پر ایوارڈ لینے سے انکار بھی کر دیتے ہیں۔ حکومت کو اس نظام کی اصلاح کرنی چاہیے ہمارے ہاں بے شمار حقیقی شاعر ادیب موجود ہیں جو افکار کے خزانے اپنے پاس رکھتے ہیں ایسے افکار جن سے قوموں کی تشکیل ہوتی ہے ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

سوال: آپ ایک ماہرِ اقبالیات بھی ہیں، آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس دور میں فکرِ اقبال کی کس حد تک ضرورت ہے؟

جواب: آج فکرِ اقبال کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے کیونکہ آج قوم ایک مرتبہ پھر اپنی تشکیل کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ فکرِ اقبال ہی سے کبھی ایک قوم تشکیل پائی تھی۔ جس قوم نے ایک ملک کے حصول کے لئے جدوجہد کی۔ آج وہ ملک پھر ایک نئی قوم کے حصول کا مطالبہ کر رہا ہے۔ فکرِ اقبال پر عمل کا طالب ہے۔ یاد رکھیں صرف اقبال کے افکار ہی قوم کو قوم بنا سکتے ہیں۔ اقبال کے فلسفۂ خودی کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے کی ضرورت ہے میں کہا کرتا ہوں کہ اقبال نے شعر نہیں فیصلے لکھے ہیں ان فیصلوں کی روشنی میں قوم کی نئی تشکیل ہونی چاہئے اور ملک عزیز پاکستان کی نئی تعمیر چاہئے۔

سوال: آپ اُردو ادب کے بہترین استاد سمجھے جاتے ہیں، ایک بڑی جامعہ میں تدریس کے فرائض ادا کر رہے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ جامعات میں ایسے اذہان پائے جاتے ہیں جو ادب کی خدمت میں کام آسکیں؟

جواب: ضرور تیار ہوں گے۔ جو طلبہ و طالبات اس وقت ایم فل اور پی ایچ ڈی کر رہے ان کی صلاحیتوں سے انکار نہیں۔ انہیں جلا بخشنے اور تحریک دینے والے اساتذہ کی کمی ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جنہوں نے تدریس کا شعبہ قومی خدمت کے جذبے کے تحت اپنایا ہو۔ تدریس و تعلیم ایک عبادت ہے۔ بہت کم لوگ اس عبادت کا لحاظ رکھتے ہیں۔ جعلی ڈگریوں والے اساتذہ کی بھی بھرمار ہے۔ اس طرح بعض ان پڑھ لوگ پڑھے لکھے افراد کی تعلیم پر مامور ہیں۔ حکومت کو اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ یونیورسٹیوں کے سربراہوں کو اس صورتحال کا جائزہ لینا چاہئے۔ میں ایک استاد ہوں مجھے اللہ نے ایک بڑی ذمہ داری کے لیے منتخب کیا ہے۔ میں آج آپ کو بتا رہا ہوں کہ میں نے زندگی بھر اس کو عبادت ہی سمجھا اور کلاس میں باوضو ہو کر جاتا ہوں تا کہ نمازِ علم باحسن طریق ادا ہو سکے۔

(محمد نعیم، نارتھ سٹار، ۶ر نومبر ۲۰۱۶ء)

(۲)

سوال: آپ کی نظر میں موجودہ زمانے کی ادبی تخلیقات کا معیار کیسا ہے؟

جواب: میری ناقص رائے کے مطابق آج کے زمانے کی ادبی تخلیقات کا معیار کم درجے کا ہے۔ انٹرنیٹ اور دیگر الیکٹرانک میڈیا نے ہم سے غور وفکر کے لمحات چھین لیے ہیں۔ ہمیں بہت سی سہولتیں میسر ہیں، انہی کی وجہ سے ہم ''سہل پسند'' ہوتے جا رہے ہیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ سطحی قسم کا ادب تخلیق کر کے نمائش کے لیے پیش کر دیا جاتا ہے اور ستائش باہمی کی انجمنیں اپنے من پسند قلم کاروں کو پروموٹ کر رہی ہیں۔ ایک وقت تھا کہ جب ارباب قلم ایک ایک حرف پر پوری توجہ دیتے تھے، آج المیہ یہ ہے کہ لفظوں کو صفحۂ قرطاس کے بجائے فیس بک کی زینت بنا دیا جاتا ہے اور وہاں سے ملنے والی داد و تحسین کو معتبر سمجھا جا رہا ہے۔

سوال: موجودہ زمانے میں کون سی صنفِ سخن سب سے زیادہ لکھی جا رہی ہے؟

جواب: اُردو ادب کا کثیر سرمایہ نظم کی صورت میں موجود ہے لیکن غزل کا اپنا ایک انداز ہے۔ شاعری کے آغاز ہی سے غزل تمام اصنافِ سخن پر حاوی ہے اور سب سے مقبول صنف سخن بھی غزل ہے۔ غزل کے ایک شعر میں پوری بات کہہ دی جاتی ہے اور مشکل سے مشکل مضمون بھی غزل کے ایک شعر میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ غزل کہنا بہت مشکل ہے، کیوں کہ اس کا ہر شعر ایک نیا مضمون لیے ہوئے ہوتا ہے۔ آج کے زمانے میں غزل کے بے شمار شعرا اور شاعرات موجود ہیں، جب کہ نظم کہنے والوں کی تعداد کم ہے۔ غزل کے شعری محاسن سے انکار ممکن نہیں۔ غزل مشکل ادوار سے گزری ہے، لیکن غزل آج بھی تندرست وتوانا ہے اور اس کی ترقی کا سفر جاری ہے۔

سوال: غزل گوئی میں تجربات کی نوعیت کیا ہے؟

جواب: ہر زمانے میں غزل میں تجربات ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ بعض لوگوں نے خود کو نمایاں کرنے کے لیے غزل میں کچھ تجربات کیے، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ غزل میں ہیئت کے تجربات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ غزل اپنی موجودہ ہیئت میں جو رچاؤ رکھتی ہے، اس کا جواب نہیں۔ غزل میں ردیف قافیوں کی ہم آہنگی سے جو غنائیت پیدا ہوتی ہے، وہ قارئین وسامعین کی روح میں اُتر جاتی ہے۔ غزل کی مترنم بحروں میں کہے گئے اشعار بہت لطف دیتے ہیں۔ البتہ، غزل میں نئے نئے مضامین اور استعارے شامل کیے جا سکتے ہیں۔

سوال: کیا آپ نے کسی سے سادہ کاغذ پر اصلاح لی یا کسی کو سادہ کاغذ پر اصلاح دی ہے؟

جواب: میں نے نہ تو کسی کو سادے کاغذ پر اصلاح دی ہے اور نہ ہی کسی سے اصلاح لی ہے۔ باری تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں پیدائشی شاعر ہوں۔ شاعری ایک خداداد صلاحیت ہے جو ہر کسی کو نہیں ملتی۔

سوال: کیا آپ اپنے اساتذہ کے نام بتانا پسند کریں گے؟

جواب: مجھے کسی استاد سے باقاعدہ اصلاح کا موقع نہیں مل سکا، جس طرح علامہ اقبالؒ ''رومی'' کو اپنا مُرشد کہتے ہیں۔اسی طرح، میں بھی اقبالؒ کے انہی معنوں میں اقبالؒ کو اپنا مُرشد یا استاد کہنے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔میرے والدِ محترم حضرت مجروح کلہر وی اُردو، فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ان کے شاگردوں میں آج کل کے کافی مشہور شعرا شامل رہے ہیں۔ مجھے اپنے والد سے بھی استفادہ کا موقع نہیں مل سکا، میری کئی غزلیں اور نظمیں شائع ہو کر جب میرے والد کے علم میں آئیں تو انہیں پتا چلا کہ میں شاعر بن چکا ہوں۔میں نے ان سے اصلاح کی خواہش ظاہر کی، مگر انہوں نے فرمایا کہ اب ضرورت نہیں ہے، بس اشعار کہتے رہو۔

سوال: آپ کا نظریۂ ادب کیا ہے؟

جواب: میرا نظریۂ ادب وہی ہے، جو کہ علامہ اقبالؒ کا تھا۔اقبالؒ اس وقت کے رائج شدہ کسی نظریے کے قائل نہیں تھے۔وہ سمجھتے تھے کہ ادب کو اپنی ذات کے ساتھ ساتھ قومی زندگی سنوارنے کا کام کرنا چاہیے۔میں سمجھتا ہوں کہ ادب کو اخلاقیات اور مذہبی حدود کا پابند ہونا چاہیے۔بے لگام ادب زہرِ قاتل سے کم نہیں۔

سوال: آپ آج کل کے نقادوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

جواب: آج کا نقاد اپنی ذمے داریاں احسن طریقے سے نہیں نبھا رہا۔گروہ بندیوں کی وجہ سے ہر نقاد بلاوجہ تعریف و مذمت میں مصروف ہے۔اس وقت کوئی بڑا نقاد نظر نہیں آ رہا۔کسی بھی فن پارے کو تعصب یا جانب داری کی نگاہ سے دیکھا جائے تو نقد و نظر کا مقصد پورا نہیں ہو سکے گا۔معذرت کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آج کل یہی تنقیدی رویہ عام ہے۔

سوال: کیا نعت نگاری کو اصنافِ سخن میں شامل کیا جا سکتا ہے؟

جواب: نعت کو 1980ء سے قبل الگ صنفِ سخن نہیں سمجھا جاتا تھا، مگر اب نعت نگاری ایک الگ اور مکمل صنفِ سخن ہے۔میرے خیال میں جب ایک خاص چیز لکھنے والے موجود ہوں اور ایسے لکھنے والے جو اس چیز کے علاوہ کچھ اور نہیں لکھتے ہوں، وہ تو چیز الگ صنفِ سخن بن جاتی ہے نعت لکھنے والے صرف نعت ہی لکھتے ہیں۔نعت بالکل الگ صنفِ سخن کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔

سوال: کیا نعت نگاری میں تنقید کی گنجائش نکلتی ہے؟

جواب: نعت نگاری میں تنقید کی گنجائش بہر حال ہوتی ہے، کیوں کہ کچھ لوگ نعت لکھتے لکھتے حساس معاملات کو بھی چھیڑ لیتے ہیں۔ایسی صورت میں رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔علاوہ ازیں، فنی طور پر نعت کو دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔محض جذبات کا اظہار ہی کسی تحریر کو شہ پارہ نہیں بناتا اور بہت سے معاملات فن ہوتے ہیں، جن سے کسی تحریر کو سنوارا جاتا ہے۔محاسن شعری کے بغیر کوئی تخلیق قابلِ قدر نہیں ہوتی۔نعت نگاری کے لیے نقاد بھی بہت پڑھے لکھے اور شرعی معاملات کو سمجھنے والے ہونے چاہئیں۔نعت میں اگر خدانخواستہ کوئی شرک کا پہلو آ جائے تو جب تک نعت صفحۂ قرطاس پر موجود رہے گی، شاعر گناہ گار

ہوتا رہے گا، آخرت کا حساب کتاب اپنی جگہ۔ یہ باتیں آخر کون بتائے گا؟

سوال: کسی بھی قلم کار کی سنیارٹی فکس کرتے ہوئے کن امور کا خیال رکھنا ضروری ہے؟

جواب: سنیارٹی فکس کرنے کا کوئی پیمانہ اس وقت رائج نہیں۔ جس شاعر کی لابی مضبوط ہے، وہی سینئر بن جاتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ جس کے شعری مجموعے زیادہ ہوں، اسے سینئر سمجھا جائے لیکن شاعری کا معیار بھی تو دیکھنا چاہیے مگر یہ کون دیکھے گا۔ سنیارٹی فکس کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس شاعر کی شاعری پر نقادوں نے بہت تحسین کی ہو اور وہ عمر میں بھی بڑا ہو، اسے سینئر سمجھا جائے، مگر غیر جانب دار نقاد کہاں سے لائیں؟

سوال: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ متشاعر خواتین وحضرات کی تقریب پذیرائی میں شریک ہونا چاہیے؟

جواب: متشاعروں کے لیے تقریب کرنے والے ظلم کرتے ہیں، ادبی ذوق رکھنے والوں کے ساتھ بھی اور متشاعر خواتین وحضرات کے ساتھ بھی، ایسی تقریب میں مستند شعرا اور شاعرات کا جانا مناسب نہیں ہے، کیوں کہ اس طرح غیر ادبی لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ شاعر اور متشاعر کو ایک جیسا مقام مل جاتا ہے۔ یہ ظلم نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

سوال: ترقی پسند تحریک نے اُردو زبان وادب پر کیا اثرات مرتب کیے؟

جواب: ترقی پسند تحریک ایک نظریاتی ڈراما تھا، جو بہت جلد اپنے اثرات زائل کر بیٹھا۔ اس تحریک کے پیچھے غیر ملکی نظریات کار فرما تھے، اس لیے یہ تحریک ہماری مٹی سے ہم آہنگ نہ ہوسکی۔ اس کے تحت اخلاقیات سے عاری لٹریچر پڑھنے کو ملا، تخلیقی سطح پر کوئی خاص ترقی نہیں ہوسکی۔ دوسرے ملکوں کی خدمت کی کوشش کی گئی، بڑے ادیبوں اور شاعروں کا مذاق اڑایا گیا، دینی شعائر اور قومی اقدار پر حملوں کو ترقی پسندی سمجھا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ سلسلہ زیادہ عرصہ نہ چل سکا اور جیسے جیسے شائستہ مزاج شاعروں اور ادیبوں کو ترقی پسندی کے اصل چہرے سے آگاہی ہوئی، وہ اس تحریک سے کنارہ کش ہوتے گئے، تاہم اس ترقی کے نتیجے میں اُردو نظم اور افسانے کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اس وقت ترقی پسند مصنفین کی یہ انجمن پاکستان میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ لاہور، ملتان اور کراچی میں ایسے افراد، جن کو قومی دھارے میں شامل نہیں کیا جاتا، وہ ''ناراض ادب'' تخلیق کرتے ہیں، جنھیں ہمارے ترقی پسند قلم کار اپنا ساتھی شمار کرتے ہیں۔ اب حکومت کی گود میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ صرف مفاد اور خود غرضی کو سامنے رکھتے ہیں، حکومت کوئی پیش کش کردے تو ساری ''ترقی پسندی'' غائب ہوجاتی ہے۔

سوال: آپ مبتدی قلم کاروں کے لیے کیا پیغام دیں گے؟

جواب: نو واردانِ ادب کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ مطالعے کو شعار بنائیں۔ اتنا پڑھیں، اتنا پڑھیں کہ کوئی رجحان، کوئی رویہ ان کی نظر سے اوجھل نہ رہے۔ اس کے بغیر حقیقی ادب کی تخلیق ناممکن ہے اور اس کے بغیر انفرادیت بھی حاصل نہیں کی جاسکتی، اس کے علاوہ، اپنے قومی تقاضوں کا بھی خیال رکھیں۔ ملک وقوم کو کس قسم کے ادب کی ضرورت ہے، یہ بات ضرور یاد رکھیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کوئی اقبال نہیں بن سکتا، لیکن ان کے افکار سے رہنمائی حاصل کرکے ملک وقوم کی خدمت ضرور کی جاسکتی ہے!!

(ڈاکٹر نثار احمد نثار، جسارت، یکم اپریل ۲۰۱۷ء)

(۳)

سوال: تصوف کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: میں چوں کہ اقبال کا مرید ہوں، لہٰذا میری رائے وہی ہے جو اقبال کی تھی۔ اقبال عجمی فلسفۂ تصوف کے خلاف تھے بلکہ اُن کا مردِ مومن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی ہے اور اُن کے نزدیک تصوف کی کڑیاں حضرت علیؓ کی ذات سے ملتی ہے، جو انھوں نے کہا، وہ تصوف ہے، جو نہیں کہا اُس کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں۔ اقبال نے اپنے ایک فارسی شعر میں رہبانی اور دنیا سے بے رغبتی دلانے والے تصوف کی مذمت کی ہے، جس میں عمل نام کی چیز نہیں۔ بقول اقبال: عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ۔

سوال: علامہ پرویز کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اقبال کو سمجھا ہے۔ وہ کس حد تک درست کہتے ہیں؟

جواب: پرویز کا تعلق اقبال سے نہیں بلکہ سرسید سے ہے۔ معجزات کا انکار کرنا جیسے حضرت موسیٰؑ کے عصا کا سانپ بننا اور دریائے نیل کا راستہ دینا، پرویز صاحب ان سے انکار کرتے ہیں جبکہ اقبال انھیں مانتے ہیں۔ جہاں تک توحید کا تعلق ہے، اس عقیدے میں پرویز نے اقبال سے فیض حاصل کیا ہے لیکن رسالت کے معاملے میں ان کا اقبال سے کوئی تعلق نہیں۔ اقبال تو عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، رسول اللہؐ کی ذات سے محبت اُن کے رگ و ریشے میں سرایت کیے ہوئے ہے جبکہ پرویز کے رسالت مآبؐ کے بارے میں نظریات غلط ہے۔ وہ احادیث کو نہیں مانتے، اس بارگاہ میں عشق و محبت بلکہ احترام تک کو خاطر میں نہیں لاتے۔

سوال: آپ کی نظر میں اقبال کی فکر کو ترویج دینے میں کلیدی کردار کس کا ہے؟

جواب: فکرِ اقبال کی ترویج کے لیے آج تک کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی، صرف دن منا لینے پر اکتفا کیا گیا ہے، اُن کی یاد میں جلسے منعقد کر لینا ہی کافی نہیں تھا لیکن صد افسوس کہ ہم نے اقبال کے کلام سے روشنی حاصل نہ کی۔ شاعروں نے بھی صرف نقل اتارنے کی کوشش کی لیکن اُس مقصد اور فکر کو آگے نہ بڑھا سکے کیوں کہ جب تک فکر آپ کی شخصیت کا حصہ نہ بن جائے، تب تک اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ سیماب اکبر آبادی نے اقبال کا لباس پہن کر اُن کا تتبع کرنے کی کوشش کی، کچھ شاعروں نے اُن کے مضامین کو اپنایا لیکن اُن کا مقصد محض دوسروں سے نمایاں ہونا تھا۔

سوال: ظفر اقبال کے تتبع میں ہونے والے شعری تجربات کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: ان لوگوں نے شاعری کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ غزل کا اپنا فریم ہے، اس سے ہٹ کر لکھی ہوئی غزل، غزل کی تعریف پر پوری نہیں اُترتی۔ غزل میرؔ کی وراثت ہے، اِسے میرؔ کے طرز سے ہٹ کر نہیں چلایا جا سکتا۔ نئے تجربات غزل کے لیے عظیم خطرہ ہیں جن کی حوصلہ شکنی ضروری ہے۔ اگر نئے تجربات کرنے ہیں تو دیگر اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرنی چاہیے۔

سوال: ادبی گروہ بندیوں اور لابیز نے ادب پر کیسے اثرات مرتب کیے ہیں؟

جواب: یہ گروہ بندیاں مفید ہیں کیوں کہ ادب مقابلے میں تخلیق ہوتا ہے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ گروہوں کے قائد عظیم ہوں، تب ہی وہ اپنے پیشواؤں کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ جیسے احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے زیرِ سایہ لکھاریوں نے اچھا ادب تخلیق کیا۔ اس کے برعکس اگر گروہوں کے قائد کا اپنا علمی معیار نہ ہو تو ادب کو نقصان پہنچتا ہے کیوں کہ وہ سمت نمائی نہیں کر پاتا۔ آج کل شخصیت پرستی نہیں ہے بلکہ شہروں کے نام پر گروپ بنے ہوئے ہیں جیسے لاہور، کراچی، ملتان وغیرہ۔ وہاں بھی دبستان نہیں بن سکے، اس کی وجہ لوگوں کی مصروفیات اور مالی مسائل ہیں جس وجہ سے محافل باقاعدگی سے نہیں ہوتیں، لوگوں کو مل بیٹھنے کا موقع میسر نہیں آتا، نتیجتاً انھیں ایک بات پر متفق نہیں کیا جا سکتا۔ یہی باعث ہے کہ اب کوئی تحریک دیکھنے میں نہیں آتی۔ ادبی دھڑے بندیوں کا ایک نقصان ہوتا ہے کہ اچھے شعرا کو بعض دفعہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مجید امجد کی مثال دیکھ لیں، نیز ایک اور معروف شاعر عارف شفیق ہیں اور صابر ظفر ہیں جو درجنوں کتب کے مصنف ہیں لیکن گم نامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ عارف شفیق کا مشہور شعر ہے:

غریبِ شہر تو فاقوں سے مر گیا عارفؔ
امیرِ شہر نے ہیرے سے خودکشی کر لی

سوال: موجودہ ادب اور ادیب کس تحریک سے متاثر ہیں؟ کیا ترقی پسند تحریک کامیاب رہی؟

جواب: ترقی پسند تحریک کا اثر اُس دور ہی میں ختم ہو چکا تھا۔ اب تو وہ قصۂ پارینہ بن چکی ہے۔ موجودہ ادب رومانوی تحریک کے زیرِ اثر ہے۔

سوال: تنقید کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟

جواب: تنقید کی نوعیت ایک ہی ہے اور وہ ہے عملی تنقید۔ جس کے بانی شبلی اور حالی ہیں۔ بعد کی ساری تنقید اسی کے زیرِ اثر ہے البتہ نام الگ الگ رکھ دیے گئے ہیں اور اصل تنقید میں تھوڑی بہت تبدیلی کر دی گئی ہے۔ تنقید میں ہمیشہ مثبت رویہ رکھنا چاہیے۔

سوال: جامعات میں ہونے والی تحقیق پر آپ کی رائے؟ اِسے کیسے بہتر بنایا جا سکتا ہے؟

جواب: یہ بہت مشکل کام ہے کیوں کہ یونیورسٹی میں جو طالب علم داخلہ لیتا ہے، یونیورسٹی اسے ڈگری دینے کی پابند ہے۔ جلد یا بدیر اسے ڈگری مل جاتی ہے۔ بالخصوص پرائیویٹ یونیورسٹی کا دارومدار ہی طلبا پر ہے۔ اساتذہ، طلبہ سے مطمئن ہوں یا نہ ہوں، یہ بات طلبا کی ڈگری کے راستے میں حائل نہیں۔ کورس ورک نے بھی تحقیق کو ناقص بنا رکھا ہے، کورس ورک کے دوران میں لڑکے لڑکیاں اساتذہ سے راہ و رسم بڑھا کر نمبر حاصل کر لیتے ہیں اور بعد ازاں کچا پکا کام لکھ کر سفارش کے ذریعے

ڈگری حاصل کر لیتے ہیں۔ جب میں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا تھا، اس وقت کورس ورک کا تصور نہیں تھا۔ ایم اے کے بعد ہم سال ہا سال مطالعہ کرتے رہے۔ میں نے گیارہ ہزار کتب کا مطالعہ کر رکھا ہے۔ میں نے ایک رجسٹر رکھا ہوا تھا، جو کتاب پڑھتا، اس کا نام، پبلشر کا نام، صفحات کی تعداد اور اس کتاب کا مرکزی خیال اپنے پاس نوٹ کر لیا کرتا تھا۔ اسی کی بنیاد پر ہم نے مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کی۔ ہمارے پیشِ نظر روپے کا لالچ نہیں تھا اور نہ ہی اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھوانے کا شوق تھا۔ اندرونی تحریک کے زیرِ اثر مطالعہ کیا تھا جبکہ آج کل کا طالب علم اس جذبے سے محروم ہو چکا ہے۔ سمسٹر سسٹم کو ختم کرنا چاہیے کیونکہ اس سسٹم کے تحت کوئی فیل نہیں ہو سکتا۔ جو شخص پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرتا ہے، اسے ہر فن مولا ہونا چاہیے۔ اُردو کے بارے میں ہر بات کا علم اسے ہونا چاہیے لیکن آج کا طالب علم اپنے تھیسس تک محدود رہتا ہے اور بعض دفعہ تھیسس کے بارے میں بھی مکمل واقفیت نہیں رکھتا۔

سوال: اُردو بطور قومی زبان کیوں رائج نہیں ہو سکی؟

جواب: بیوروکریسی اس کام میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ ضیاء الحق کے دور میں یہ تحریک شروع ہوئی تھی اور کچھ منسٹریاں اُردو میں کر دی گئی تھیں لیکن اُن کے جانے کے بعد وہ سلسلہ بھی بند کر دیا گیا۔ امیر لوگوں کے بچے باہر پڑھتے ہیں، انگریزی ان کے گھروں میں بولی جاتی ہے، لہٰذا انھیں اُردو زبان سے کوئی رغبت نہیں۔ نفاذِ اُردو کی جملہ تحریکیں محض خود کو نمایاں کرنے کا بہانہ ہیں، انھیں خود اُردو زبان سے کوئی سروکار نہیں اور نہ ہی اُردو سے کوئی جذباتی وابستگی ہے۔ آپ اندازہ کریں کہ وفاقی اُردو یونیورسٹی، ''اُردو یونیورسٹی'' کہلاتی ہے لیکن یونیورسٹی کے قیام کے آٹھ سال بعد یہاں اُردو کا شعبہ قائم کیا گیا۔

سوال: موجودہ ادب میں بڑا نام کس کا ہے؟

جواب: فراز، منیر نیازی، قتیل شفائی اور محسن نقوی جیسے شعرا گزر گئے، اس دور میں کوئی شاعر ان جیسی عظمت کا حامل نہیں ہے۔

(سجاد حسین سرمد، یکم دسمبر ۲۰۱۹ء)

شخصی مضامین/ خاکے

نور کا استعارہ ''ڈاکٹر منور ہاشمی''

ڈاکٹر فہمیدہ تبسم

وفاقی اردو یونیورسٹی۔اسلام آباد

ڈاکٹر منور ہاشمی کی علمی و ادبی شخصیت کے مختلف جہات پر بہت لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے لیکن میری نظر میں ان کی اسم با مسمیٰ ہستی کا سب سے دل پذیر گوشہ ان کا وہ حسن اخلاق ہے جس نے ان کے دوستوں اور طلبا و طالبات کو ان کا اسیر بنا دیا ہے۔وہ وفاقی جامعہ اردو میں رہیں یا نادرن یونیورسٹی نوشہرہ میں نور کا استعارہ بن کر تنویر ذات تقسیم کریں، کرنوں کا یہ تقسیم کنندہ ہر دل میں ایک خوش گوار احساس بن کر موجود ہے۔میں ڈاکٹر صاحب کو زمانۂ طالب علمی سے بحیثیت شاعر و ادیب جانتی تھی لیکن ان سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب ایم اے کے فوراً بعد میں نے پاکستان انٹرنیشنل سکول الخبر سعودیہ کے لیے انٹرویو دیا۔ڈاکٹر صاحب انٹرویو پینل میں موجود تھے۔بعد ازاں وفاقی اردو یونیورسٹی میں ڈاکٹر صاحب کی خوش گوار محبتیں میسر رہیں۔جب تک ادارے میں رہے اک شجر سایہ دار کی طرح اپنے دوستوں اور طلبا پر سایہ فگن رہے جامعہ کے پورے ماحول میں ان کی شخصیت کی بہار یہ تاثیر ماحول کو منور و معطر کیے رکھتی۔ڈاکٹر صاحب سے محبت کرنے والے ہمہ وقت ان کے گرد پروانوں کی طرح موجود رہے اور ساتھی اساتذہ کو بھرپور شفقت و محبت کا احساس رہتا۔مجھے ان کے گرد طلبا کا ہجوم دیکھ کر اقبال کا ایک شعر بار بار یاد آتا:

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ ہے پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق

ڈاکٹر صاحب عہد موجود کی قد آور ادبی شخصیت ہیں۔اعلیٰ رتبے کے نعت گو، غزل گو، محقق نقاد اور نثر نگار ہیں لیکن ان کے اندر کا درویش صفت انسان ان کا بنیادی تعارف ہے۔سرکار دو عالم سے محبت ان کا اثاثہ ہے اس کا اظہار ان کی نعت سے بھی ہوتا ہے اور ان کا عمل بھی اس کا غماز ہے کئی بار ایسا ہوا کہ کسی نے ان کی تواضع شیزان سے کرنا چاہی لیکن ڈاکٹر صاحب نے پینے سے احتراز کیا۔عقیدہ ختم نبوت سے ان کی عقیدت و محبت کا یہ عالم ہے کہ ایسے کسی فرد سے ہاتھ نہیں ملاتے جس کے بارے میں انہیں شبہ ہو کہ سرکار دو عالمؐ سے اس کی نسبت مشکوک ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے فنی مراتب تسلیم شدہ حقائق ہیں فکر و فن کے حوالے سے ان کی ذات تاریخ ادب کا اہم حصہ ہے لیکن ان کے شخصی خصائص بھی انہیں مقبول و ممتاز بنانے کے لیے کافی ہیں۔ڈاکٹر منور ہاشمی انتہائی زندہ دل، بذلہ سنج، خوشگوار مزاج کی حامل شخصیت ہیں جو ان کی محفل میں ایک بار بیٹھ گیا پھر اس کا حال اس شعر کے مصداق ہو جاتا ہے۔

ہر قدم پہ ادھر مڑ کے دیکھا
ان کی محفل سے ہم اٹھ تو آئے

وفاقی جامعہ اردو سے وابستگی کے آغاز سے تادمِ تحریر مجھے ان کی بھرپور شفقت حاصل رہی انہوں نے ہمیشہ برادر محترم کی حیثیت سے میرے ساتھ تعاون کیا۔ جب تک ڈاکٹر صاحب شعبہ اردو میں رہے طلبا و اساتذہ ان کی پر بہار شخصیت سے بہرہ ور ہوتے رہے اور جب وہ رخصت ہوئے تو جیسے بہاریں روٹھ گئیں۔ دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو آسانیاں تقسیم کریں جو اپنے گرد و پیش میں اتنے مقبول ہوں کہ ان کے آنے سے خوشی اور جانے کے بعد بھرپور ویرانی کا احساس پیدا ہو۔ ڈاکٹر صاحب اپنی شان دار شخصیت کی بنا پر دلوں پہ حکمرانی کا وصف رکھتے ہیں اس حکمرانی کے لیے انہیں کوئی جدو جہد نہیں کرنی پڑتی جو بھی ان سے ملتا ان کا اسیر ہو جاتا ہے۔ خوش بیان ہیں تو اس قدر کہ لفظ ان کی نطق میں زندگی پاتے ہیں۔ جس محفل میں موجود ہوں صدرِ محفل ہوتے ہیں۔ برجستہ مزاح اور خوش گوئی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی جامعہ اردو سے ریٹائرمنٹ میرے لیے بہت پریشان کن رہی۔ ان کے ہوتے ہوئے شفقت کا احساس رہتا۔ ان کی دعائیں ان کے مشورے اور ان کا گھمبیر معاملات کو ایک ہنسی میں ٹال دینے کا رویہ ہمیشہ میرے لیے اہم رہا۔ ڈاکٹر صاحب کے شخصی اوصاف پہ وسیع و دقیق مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن سے مل کر واقعی کہا جا سکتا ہے:

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

لیکن بہت ساری تفاصیل کو اختصار کے دائرے میں لاتے ہوئے میں فقط اتنا ہی کہنا چاہتی ہوں کہ ہم لوگ جو ان کی شفیق ہستی کے مسحور لوگ ہیں یقیناً بہت خوش قسمت ہیں کہ ان کے دور میں زندہ ہیں اور ایسے دائرہ حیات میں ہیں جہاں ڈاکٹر منور ہاشمی کی منور رفاقت بھی ہے۔

خاص ہے ترکیب میں شاعر منور ہاشمی

ڈاکٹر اسحاق وردگ

علامہ اقبالؒ نے یوں ہی تو نہیں فرمایا: ''خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی''

علامہ کے شعری وجدان کا میں تب نئے ادراک سے قائل ہوا جب مجھے ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب کے حلقۂ ادارت میں وقت گزارنے کا موقع ملا۔ منور ہاشمی اسم بامسمی شخصیت۔۔۔ جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے۔۔۔ چاہے کوئٹہ ہو یا اسلام آباد۔۔۔ سمندر پار جدہ ہو یا پھر نوشہرہ ہو۔ اس داستان کے ہر پڑاؤ پر ہاشمی صاحب نے علم وادب کا ایک چراغ کدہ آباد کیا۔

میں آٹھ نو برس سے نوشہرہ میں اردو ادب کے ویران ادب کدے میں زبان وادب کے فروغ کے لیے چراغ جلاتے جلاتے مایوسی کی دیوار سے لگ چکا تھا۔ ۲۰۱۲ء میں جب مجھے اٹھارہویں گریڈ میں ترقی ملی تو نوشہرہ کے نوتعمیر شدہ ایف جی ڈگری کالج میں بھیج دیا گیا۔ اسی کالج میں نوشہرہ کی تاریخ کا پہلا اردو، پشتو، ہندکو اور سرائیکی مشاعرے سے ادب کا پہلا چراغ جلایا۔ اس مشاعرے کے انعقاد میں کالج کے پرنسپل پروفیسر احسان اللہ خان مروت کی ادب دوستی خوب کام آئی۔ ابھی نوشہرہ کی سطح پر اردو کا یہ چراغ روشن ہوا ہی تھا کہ کچھ نامعلوم سمتوں سے ''باد مخالف'' اوڑھے ہوئے ادب دشمن پھونکیں مارنے پہنچ گئے۔ ایک کوشش ریڈیو پاکستان پشاور کے ادبی پروگرام ''بزم ادب'' کے زیر اہتمام ادبی مذاکرے ''نوشہرہ میں اردو ادب'' کی صورت میں کی۔

اس مذاکرے میں پروفیسر رئیس خان رئیس، پروفیسر نوید اقبال اور دیگر دوست شریک ہوئے اور اردو ادب پر جامع مکالمہ ریکارڈ ہوا۔ دوسری کوشش ریڈیو مشاعرے کی شکل میں سامنے آئی۔ ہر دو کوششوں کا مقصد یہی تھا کہ نوشہرہ کے اردو ادیب مین سٹریم میں آجائیں۔ ان کاوشوں نے کچھ عرصے کے لیے تحریک کا مزاج بھی اپنایا جب اردو شعر وافسانے سے وابستہ میاں لطیف شاہد جیسے رفیق ادب کی رفاقت میسر آئی۔ آخر بار بار کوشش کے بعد تھک ہار کر نوشہرہ میں اردو ادب کے احیا کے خواب کو بھاری پتھر سمجھ کر چوما اور ایک کونے میں بیٹھ گیا لیکن چند برس کے بعد جب مجھے شعبۂ اردو ناردرن یونی ورسٹی نوشہرہ میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر پی ایچ۔ ڈی کلاس کو پڑھانے کی ذمہ داری ملی تو یونیورسٹی کے در و دیوار پر ایک منور شخصیت کی روشنی کا احساس ہوا۔ افسردگی کے خول سے باہر نکلا اور سردیوں کی دھوپ جیسے فرحت بخش احساس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جس منور شخصیت کا ذکر اسلام آباد کے ادبی ایوانوں میں گونجتا تھا۔ قسمت کی مہربانی سے وہ نوشہرہ ہی میں ٹھنڈی چھاؤں کی طرح نصیب ہوئی۔

تو جناب یہ ہے ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب سے شرف ملاقات کا پس منظر۔ جب جب تاریخ ادبیات نوشہرہ میں اردو

ادب کا باب قلم بند ہوگا تو اس میں جلی حروف کے ساتھ لکھا جائے گا کہ "نوشہرہ میں جدید اردو ادب کے فروغ کا آغاز ڈاکٹر منور ہاشمی کی سرپرستی میں قائم ہونے والی انجمن "جدت پسند مصنفین سے ہوتا ہے" منور ہاشمی علم و ادب کا ایک چھتنار درخت کا نام ہے جن کے سائے میں گزارے گئے وقت کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔منور ہاشمی صاحب سے مکالمے میں شعر و ادب کی فلسفیانہ جہتیں آشکارا ہوتی ہیں۔سوال قدیم شعر کا ہو یا جدید شعر کا۔۔۔ذکر اقبالیات کا ہو یا غالبیات کا، میر کے غم سے شناسائی کا سوال ہو یا درد کے صوفیانہ لہجے کی وضاحت۔ڈاکٹر ہاشمی کی ذات سے علم کے جگنو نکلتے ہیں اور حاضرین محفل ان جگنوؤں کی روشنی میں شاہراہ ادب پر آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ہاشمی صاحب کا انداز تدریس منزل آشنائی کا سلسلہ ہے۔فکر اقبالؒ کے باب میں تو ان کا یہ قول تو آب زر سے لکھنے کے قابل ہے: "اقبال نے شعر نہیں کہے فیصلے لکھے ہیں"

فکر اقبال کے مشکل مقامات ہوں اور ڈاکٹر ہاشمی کا اسلوب بیان ہو تو مشکل سے مشکل گتھی آسانی سے سلجھ جاتی ہے۔میری خوش بختی ہے کہ بارہا ان محافل کا حصہ بنا جن میں ڈاکٹر ہاشمی چراغ ادب بن کر روشنی پھیلا رہے ہوتے۔یہ ادبی نشستیں کبھی شعبۂ اردو ناردرن یونیورسٹی میں برپا ہوتیں تو کبھی انجمن جدت پسند مصنفین نوشہرہ کے جلسوں میں۔ مکالمہ شعر سے شروع ہوتا اور شعور کی راہداریوں سے ہوتا ہوا ادب، ذات، زندگی اور سماج کے رشتوں کی دریافت کی اور نکل جاتا۔ ناردرن یونیورسٹی کے طلبہ جو بمشکل ہی اردو زبان میں ٹھیک سے ایک جملہ ادا کر سکتے، ڈاکٹر ہاشمی کے سائے میں وقت گزارنے کے بعد اردو بولنے اور لکھنے میں روانی دکھانے لگے۔ان طلبہ میں معراج الدین منتظر اور ہلال پختون یار میرے سامنے کی مثالیں ہیں۔ان طلبہ نے ڈاکٹر ہاشمی کے سائے میں ناردرن یونیورسٹی اور انجمن جدت پسند مصنفین کی محفلوں میں ادبی گفتگو میں حصہ لینا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے تخلیقی میدان میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

دراصل علم بانٹنے میں ڈاکٹر ہاشمی ایک فیاض طبع انسان ہیں۔وہ اپنے حصے کی شمع جلانے کے فریضے سے آگاہ ہیں۔ انہیں ادبی دنیا میں کسی سے خوف نہیں۔خوف زدہ ادیب نہ خود آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو آگے بڑھنے دیتا ہے۔وہ خوف کے ہاتھوں کھلونا بن جاتا ہے۔اس کے خیال میں اگر میں دوسروں کو پیچھے رکھوں تو تب ہی آگے بڑھ سکوں گا۔اس لیے وہ زندگی بھر دائرے کے چکر میں رہ کر سمجھتا ہے کہ میں نے بڑے ادبی معرکے سر کر لیے ہیں۔ڈاکٹر ہاشمی کی ذات میں خوف کا دور دور تک اندھیرا نہیں۔ان کے مزاج میں ایک تخلیقی ترنگ ہے۔ایک گہرے سمندر کی طرح ان میں لہریں تو اٹھتی ہیں لیکن اعلیٰ ظرفی کے طلسم سے ایک باوقار سکوت بھی ان کی شخصی وجاہت کا عکس بن جاتا ہے۔سکوت و سکون کی یہ لہریں ڈاکٹر ہاشمی کے چہرے پر اطمینان کے خدوخال مرتب کرتی ہیں اور آنکھوں میں اعتماد کی جھلک۔۔۔

یہ ان کی شخصیت ہی کا اعجاز ہے کہ شعبۂ اردو ناردرن یونیورسٹی کے طلبہ ان کے شاگرد کم اور عقیدت مند زیادہ نظر آتے تھے۔ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی سکالرز آرزومند ہوتے ہیں کہ ہمیں ڈاکٹر ہاشمی صاحب پڑھائیں۔خود مجھے ایک طالب علم نے بتایا کہ نصاب کے کچھ ایسے سوالات تھے جن پر ڈاکٹر ہاشمی نے مدلل انداز میں یوں روشنی ڈالی کہ لفظ و معنی اور فکر

واسلوب کے کئی پوشیدہ گوشے واضح ہوئے۔ان کے حلقہ ارادت میں وہ طلبہ بھی شامل ہیں جو باقاعدہ کمرۂ جماعت میں کبھی ان کے شاگرد نہیں رہے۔انہوں نے غیررسمی طور پر سوال وجواب کے انداز میں ڈاکٹر ہاشمی سے فیض اٹھایا۔بہت سارے طلبہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ہاشمی صاحب کو چلنے میں تھوڑی بہت دقت ہوتی ہے اس لیے وہ یونیورسٹی میں چلتے چلتے انہیں روک لیتے اوران کے سامنے نصابی سوالات کے جوابات رکھتے۔ان طلبہ کو جب انجمن جدت پسند مصنفین کے اجلاسوں میں ڈاکٹر ہاشمی کی باقاعدگی سے شرکت کی خبر ملی تو وہ ان نشستوں میں بھی حاضری دینے لگے۔انہی طلبہ کی تجویز پر انجمن کے صدر نے اقبال،شاعری کے فنی پہلو اور شاعری اور موسیقی کے رشتے جیسے دقیق موضوعات پر ڈاکٹر ہاشمی کے ساتھ مکالمے کی خصوصی نشستیں رکھیں۔

ایک ایم فل سکالر نے مجھے بتایا کہ کئی مہینوں سے مقالے کے لیے کسی موضوع سے میری ذہنی ہم آہنگی نہیں بن رہی تھی۔موضوع کے انتخاب میں ذہنی الجھن کا شکار تھا۔ڈاکٹر ہاشمی سے چند ملاقاتوں کے بعد ہی میرا یہ مسئلہ حل ہوا۔ناردرن یونیورسٹی سے پہلے ڈاکٹر ہاشمی فیڈرل یونیورسٹی اسلام آباد سے وابستہ رہ چکے تھے۔ملک کے طول وعرض میں ان کے زیرنگرانی مقالات مکمل کرنے والے سکالرز پھیلے ہوئے ہیں۔ان کے پاس ادبی وتحقیقی رسائل وکتب باقاعدگی سے آتی ہیں۔اس لیے تحقیق کی نئی سرگرمیوں سے انہیں آگاہی ملتی رہتی ہے۔

جب مجھے ڈاکٹر ہاشمی کے ساتھ ناردرن یونیورسٹی میں رفیق کار بننے کی سعادت ملی تو نئی سرگرمی سے نوشہرہ میں تنہائی کا شدید احساس دیتا رہا۔میری گزارش پر ڈاکٹر ہاشمی نے عثمانیہ ریسٹورنٹ میں لب دریا ظہرانے کی دعوت قبول فرمائی۔اس ملاقات میں جدید شعر پر ان سے طویل مکالمہ ہوا۔انہوں نے شفقت فرماتے ہوئے اپنی غزلوں کا انتخاب تحفے کے طور پر عنایت کیا۔مجھے حیرت ہے کہ کتنے ہی مقبول اشعار جو ذہن پر نقش ہیں وہ ڈاکٹر ہاشمی صاحب کے شعر نکلے۔ڈاکٹر ہاشمی کی شاعری فکر کے دبیز غلاف میں لپٹی ہوئی ہے۔ان کا طرز بیان اور نظام شعر ستر کی دہائی کے شعری اسلوب کا ہم مزاج ہے۔ان کی شاعری پر علاحدہ سے ایک مضمون باندھنے کی نیت ہے تاہم اتنا کہوں گا کہ اردو شاعری کے دامن کو وسعت دینے میں ڈاکٹر ہاشمی کا ذہن رسا بھی حصہ دار ہے۔

نوشہرہ کی اردو ادبی روایت پر ڈاکٹر ہاشمی کے کئی احسانات ہیں۔انجمن جدت پسند مصنفین کی تنقیدی نشستیں یونیورسٹی سے فاصلے پر منعقد ہوتیں۔ڈاکٹر ہاشمی نے ہماری گزارش پر انجمن کی سرپرستی قبول فرمائی تو پھر اسے عملی طور پر نبھایا بھی۔وہ باقاعدگی سے انجمن جدت پسند کے اجلاسوں میں شرکت فرماتے رہے۔وہ مقررہ وقت سے پہلے پہنچ جاتے اور دیر تک نوجوان اور سینئر ادیبوں سے محو گفتگو رہتے۔دشت ادب میں کئی برسوں کی سیاحی سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر ہاشمی ان ادبی نشستوں میں خالص علمی وادبی مزاج اور تخلیقی رویوں کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔اگر کبھی کبھار گفتگو سیاست کی طرف مڑ جاتی تو ڈاکٹر ہاشمی قرینے سے اسے ادب کی طرف موڑ دیتے۔اس محفل میں قوم پرست نظریے اور نظریہ پاکستان کے حامی

ادیب بھی شریک ہوتے۔ کبھی کبھار افسانے، غزل، نظم یا تنقیدی مضمون میں سے سیاسی پہلو پر بھی گفتگو کی گنجائش نکل آتی تاہم ڈاکٹر ہاشمی کی باوقار شخصیت کی برکت سے شرکاء فوراً ہی تنقیدی گفتگو کو ادب کی طرف موڑ دیتے۔ میرے نزدیک ڈاکٹر ہاشمی کی شخصیت میں یہ طلسم ریڈیو پاکستان کی ملازمت کی راہ سے آیا۔ ان کا انداز گفتگو، دھیما لہجہ، مدلل اور منطقی اسلوب مکالمہ، الفاظ کے نفسیاتی اثرات، آواز کے اتار چڑھاؤ کا صوتی آہنگ ان کی شخصیت کا جامع تعارف ہے۔ دورانِ تدریس ان کی شخصیت وعلمی انداز کی تاثیر منفرد انداز میں طلبہ کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ان کے لیکچر کا انداز وضاحتی ہے۔ وہ لفظ و معنی کی ایک ایک گرہ کھولتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ شاید یہ ہو کہ انہیں ایک ماہر نفسیات استاد کی طرح یہ کامل بصیرت حاصل ہے کہ میرے سامنے پشتون طلبہ کی اکثریت بیٹھی ہے۔ اس لیے ان کی ذہنی سطح پر اتر کر لیکچر دینا ہے۔

ان دنوں میرے حصے میں پی ایچ۔ ڈی ریسرچ سکالرز کو لسانیات وجدید ادب پڑھانے کا فریضہ آیا۔ میری کلاس کے سامنے ہی ڈاکٹر ہاشمی کلاس لے رہے ہوتے۔ مجھے کئی بار یہ منظر دیکھنے کو ملا کہ وہ کلاس سے نکلتے نکلتے بھی طلبہ کو کچھ نوٹس لکھوا رہے ہیں اور پھر ان سکالرز کی علمی تشنگی سوالات کی صورت میں سامنے آتی۔ میں کھڑکی میں سے دیکھتا کہ ڈاکٹر ہاشمی کی زنبیل میں علم وادب کا گم شدہ ورثہ ہے اور وہ نئی نسل کو علمی وادبی ورثہ کھلے دل اور روشن دماغ کے ساتھ منتقل کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر ہاشمی نے فکر اقبال کو پاکستانی طلبہ کے سامنے ایک عقیدے کے طور پر پیش کیا تاکہ وہ پہلے تربیت پاسکیں اور پھر تعلیم اور یہی تو فلسفۂ اقبال کا حاصل ہے جس سے ڈاکٹر منور ہاشمی کی وابستگی روح وجسم کے رشتے کی مثال ہے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی

مظہر شہزاد خان

ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے سبزہ زاروں سے میری شناسائی ۱۹۸۰ء سے ہوگئی تھی۔ جب میں گورنمنٹ کالج چکوال میں سالِ اوّل کا طالب علم تھا۔ خدا غریقِ رحمت کرے پروفیسر صادق کنجاہی کو، جو جوہری تھے اور دور سے ہی سونے اور تانبے کی پہچان رکھتے تھے۔ آپ اُردو، پنجابی اور فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ ان دنوں راولپنڈی ریڈیو سے ایک پروگرام ''کالج میگزین'' چلتا تھا جس کے پروڈیوسر خلیل انصاری مرحوم ہوتے تھے۔ صادق کنجاہی صاحب نے میرا نام اس پروگرام کے لیے لکھوا دیا۔ یوں مائیکروفون سے میری پہلی شناسائی ہوئی، جو آج تک جاری ہے۔ اس عرصے میں میری ملاقات ریڈیو پر ہی معروف شعراء ناصر زیدی اور منور ہاشمی سے ہوئی۔

منور ہاشمی مرنجاں مرنج، صاحبِ علم اور محبت سے بھرے ہوئے انسان ہیں۔ چونکہ مجھے بھی شاعری سے شغف تھا لہٰذا اُن کی شاگردی اختیار کی اور اُن کو اپنی شاعری دکھاتا۔ اُنھوں نے میرے اعتماد میں اتنا اضافہ کیا کہ ریڈیو کے مشاعروں میں پڑھانا شروع کر دیا جہاں اس وقت کے نامور شعرائے کرام شرکت فرماتے تھے۔ جن میں محترم سرور کامران، ماجد صدیقی، ناصر زیدی، احسان اکبر، انور مسعود، ضیا جالندھری، سرور انبالوی، انور فیروز، شمیم اکرام الحق، محمودہ غازیہ، اختر ہوشیار پوری، نثار ناسک، حکیم فضل الٰہی بہار، رشید نثار اور دیگر نامور شعرائے کرام شرکت فرماتے تھے۔ پروگرام کا نام ''نگارش'' تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے محترمہ شمع خالد، مرحوم نسیم الحق شمیم، عبدالحفیظ، آسیہ بخاری اور تنویر الٰہی کے ساتھ بھی ڈراموں اور دیگر پروگراموں میں حصہ لیا۔ اسی دوران منور ہاشمی اور ناصر زیدی کے ساتھ مختلف شہروں میں مشاعرے بھی پڑھے۔ منور ہاشمی ایک علمی و ادبی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد محترم جناب مجروح کلہروی فارسی کے جید شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ نے پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ایک فارسی لغت بھی لکھی ہے۔ مجھے ان سے ملنے کا بھی شرف حاصل ہوا۔ منور ہاشمی کے برادرِ خورد اور ہمارے پیارے دوست غضنفر ہاشمی بھی ایک اعلیٰ پائے کے غزل گو شاعر ہیں۔ غضنفر ہاشمی آج کل امریکہ میں مقیم ہے۔

منور ہاشمی ایک طویل مسافت کے کامیاب مسافر ہیں۔ روزنامہ میزان کوئٹہ کے ایڈیٹر بھی رہے پھر ریڈیو پاکستان میں شمولیت اختیار کی۔ آپ نے بے شمار ادبی پروگرام کیے۔ اور ان پروگراموں کے دوران راولپنڈی، اسلام آباد کے اَن گنت شعراء اور ادیبوں کو متعارف بھی کرایا۔ آپ نے نوجوان لکھاریوں کو بھی برابر مواقع فراہم کیے۔ اس دوران آپ کا تخلیقی سفر بھی جاری رہا۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ ''سوچ کا صحرا'' شائع ہوا۔ جسے ادبی حلقوں میں بے پناہ پذیرائی نصیب ہوئی۔ اس کے اشعار زبان زدِ عام بھی ہوئے۔ جیسے

منوّر سوچ کے صحرا میں ہر سو
مرے احساس کا لالہ کھلا ہے

سب کہتے ہیں دیپ سے دیپ جلانا ہے
کون منوّر پہلا دیپ جلائے گا

منور ہاشمی کی شخصیت ایک مضمون میں نہیں سموئی جا سکتی۔ آپ نے اقبالیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ریڈیو کے بعد آپ پاکستان ایمبیسی کالج جدہ میں ایک طویل عرصہ اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس دوران تخلیقی سفر جاری رہا۔ حال ہی میں آپ کی شاعری کی کلیات بھی شائع ہوئی۔ یہاں میں آپ کی ایک چھوٹی سی کتاب کا تذکرہ ضرور کروں گا۔ جو "نخلستان" کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب نوجوانوں کے لیے ایک بہترین رہنما کتاب ہے۔ جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے چھوٹے چھوٹے مگر نہایت اہم واقعات کو حکایات کی صورت میں لکھا ہے۔ اس کتاب نے میری شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کیا۔ منور ہاشمی ایک سچے کھرے مسلمان اور محبِ وطن انسان ہیں۔ ان کی شاعری میں جا بجا اس کا اظہار موجود ہے۔ عشقِ رسولؐ ان کی گھٹی میں ہے۔ آپ خاندانِ بنی ہاشم کے چشم و چراغ ہیں۔ لہٰذا ان کی عادات اور خصائل سے اس کا برملا اظہار ہوتا ہے۔

سورج کی روشنی سات رنگوں کا مجموعہ ہے

فرخندہ شمیم

افسانہ نگار/شاعرہ/معلمہ/میڈیا

فلکیات کے ماہرین نے تو کہا تھا کہ سورج کی روشنی سات رنگوں کا مجموعہ ہے لیکن کہیں کسی شاعر نے یقیناً ڈاکٹر منور ہاشمی کے لیے ہی کہا ہوگا کہ:

مجھ میں سورج کوئی منور تھا
روشنی بانٹتا رہا میں بھی

یوں تو ماہر تعلیم وتدریس، شناسائے صوت وصدا اور دبیز محقق پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

میرے نام کا ''نون'' منوّر اصل میں ایک معمہ
لاکھوں شرحوں میں ابھروں، اک نکتے میں دب جاؤں

ویسے میرے نزدیک بھی ڈاکٹر صاحب ایک معمہ ہی ہیں، جتنا کھوجو، اتنا الجھو۔۔۔ مگر یہ الجھن بڑی شگفتہ سی ہے۔ میں نے ابتدائی تعارفوں میں ڈاکٹر منور ہاشمی کو فقط ایک شاعر کے طور پر ہی جانا تھا اور کندھے اُچکا کر کہا تھا، شہر میں بے شمار شاعر گھوم رہے ہیں، ایک اور سہی!!

بے نیازی اپنی فطرت میں جو بسی ہے مگر گھومتا ہوا لٹو کسی مرکز پہ رک بھی جاتا ہے۔ میں جہاں رکی تھی، وہاں سیدہ قراۃ العین کا اظہار عقیدت ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ ڈاکٹر منور ہاشمی کے لیے پی ٹی وی میں میری یہ سادہ اور پرکاری کولیگ اس وقت کے ریڈیو پروڈیوسر منور ہاشمی کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے جارہی تھی، دفتر والوں کا گمان تھا کہ معصوم سی ایک لڑکی ایک پختہ کار شاعر کے چُنگل میں پھنس رہی ہے لیکن وہ ایک دبیز پناہ میں آ گئی تھی۔ پروفیسر صاحب کا وجدان شاید پہلے ہی بُنا گیا تھا، جبھی وہ لکھ رہے تھے:

پتھر مارنے والے اک دن خود پتھر ہو جاتے ہیں
راہِ وفا میں جو سہتے ہیں پتھر، زندہ رہتے ہیں
ظلم کے سیلِ خوں میں اک دن ظالم بھی بہ جاتا ہے
لشکر مرجاتا ہے اور بہتّر زندہ رہتے ہیں

ڈاکٹر منور ہاشمی کے ساتھ ایک پُرتاثیر ملاقات ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے ادبی پروگرام میں بھی ہوئی جس کے پروڈیوسر منور ہاشمی تھے۔ شبستانِ سخن کی جگمگاتی شمعوں کے بیچ میں بھی ایک ننھا سا ٹمٹماتا دیا بنی ہوئی تھی۔۔۔ صاحبان طرح

نے جب مجھے بھی سراہا تو میں حیران اور شادمان ہوگئی، تب پروڈیوسر منور ہاشمی نے میری حیرت رفع کرتے ہوئے کہا تھا ''ارے! آپ تو اچھی نظمیں کہتی ہیں، کہا کریں!!''

پھر ریڈیو کے متعدد مشاعروں میں میری شرکت ناگزیر سی ہوگئی تھی، اس کے بعد طویل وقت گزر گیا، زندگی اپنے اپنے مدار میں لوٹ گئی۔ ڈاکٹر منور ہاشمی اور اہلیہ کے بارے میں فقط اتنا جان سکی کہ وہ دونوں بچوں کے ساتھ سعودیہ شفٹ ہوگئے ہیں۔ امر اتفاق ہے کہ جس بلڈنگ میں دونوں منتقل ہوئے، وہاں میرے بڑے بھائی بھی معہ اہل خانہ رہائش پذیر تھے۔ ڈاکٹر صاحب سعودیہ میں شعبۂ تدریس سے وابستہ ہوئے تھے اور بلڈنگ کے بچے اپنے استاد کو اچھی طرح جانتے تھے۔ بچوں نے بتایا کہ ٹیچر اکثر بلیو رنگ کے لباس میں نظر آتے ہیں۔ مجھے اس رنگ کا ادراک اب ہوا ہے کیوں کہ ڈاکٹر صاحب شخصیت کو رنگوں سے ابھارنے پر یقین رکھتے ہیں، انھیں اس حقیقت کا پوری طرح احساس ہے کہ سرخ رنگ کی مدافعت کیسے کیسے اثرات مرتب کرتی ہے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کا سفرِ سخن تو بلاشبہ کئی دہائیوں سے تسلسل میں ہے۔ متعدد سنگِ میل بناتے اور عبور کرتے انھیں کئی برس ہوگئے ہیں۔ قومی اور عالمی مشاعروں میں رنگ جمانے کے علاوہ ان کا کلام اُردو، ہندی اور رومن زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ ان کے فن اور شخصیت پر متعدد مقالے تحریر ہوئے، اُردو کی مقبول ترین ویب سائیٹ ''ریختہ'' کے مطابق ڈاکٹر منور ہاشمی کی ادبی خدمات پر بھاگل یونیورسٹی بھارت، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد، رفاہ یونیورسٹی فیصل آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد اور وفاقی اُردو یونیورسٹی اسلام آباد نے ایم اے، ایم فل اور ڈاکٹریٹ کی سطح کے تحقیقی مقالہ جات لکھوائے اور شائع کرائے ہیں۔

ڈاکٹر ہاشمی کے زورِ تحقیق اور میدانِ نقد کا مرکزی دھارا غزل سے پھوٹتا ہے۔ پاکستان میں چھپنے والی ایک تحقیق کے مطابق ان کا شمار ملک کے ان دس بہترین غزل گو شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے غزل کی روایتی ساخت کو قائم رکھتے ہوئے اس کے اسلوب اور الفاظ کی کرافٹ میں نئے تجربات کیے ہیں۔ ڈاکٹر منظر ایوبی کے مطابق:

''ادبی رجحان کا اندازہ غزل کے موضوعات سے لگایا جاسکتا ہے۔ مضبوط بنیادوں والا ادب زندگی میں تبدیلیاں لا سکتا ہے۔''

یہ اقتباس اس مضمون سے کشید ہے جو ڈاکٹر منظر ایوبی نے ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزل گوئی پر تحریر کیا تھا۔ پروفیسر اکرم کنجاہی بھی ان کے موضوعات کی زمین کو اُردو غزل کے لیے بہت موافق اور زرخیز قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزلوں سے چند اشعار:

ہو نہ پائی کبھی تعمیر کی حسرت پوری
بہتے پانی پہ گھروندے کی بنا رکھی تھی

جس میں تو شامل تھا وہ کچھ اور تھا طرزِ حیات
اب جو گزرے جا رہی ہے زندگانی اور ہے

آنکھ، خواب اور غیر مرئی استعارے ڈاکٹر صاحب کی غزل کا خاصہ ہیں، مثال دیکھیں:

جب زمانے میں فقط افسردگی رہ جائے گی
میری آنکھوں میں کرن امید کی رہ جائے گی

صبح دم آجائے گا اس کا پیامِ معذرت
جس کی خاطر آنکھ شب بھر جاگتی رہ جائے گی

قریۂ جاں بھی ہے اور دعوتِ دیدار بھی ہے
آنکھ باقی نہیں لیکن ہے نظارہ باقی

ترے خیال کا دریا اتر نہ پایا مگر
ترے خیال کے دریا میں ہم اُتر بھی گئے

سعودی عرب میں قیام کے دوران وہ مقامی اُردو صحافت کے میدان میں بھی سرگرم رہے تھے۔ ریڈیو پاکستان کے علاوہ پروفیسر صاحب ٹی وی الیکٹرانک میڈیا سے بھی وابستہ رہے اور چند ٹی وی چینلز کے لیے خدمات دیں۔ ڈاکٹر صاحب کی نگارشات کو متعدد قومی اور عالمی اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

رہے یونہی جگمگاتا تیرا آفتابِ قسمت
تری صبحِ روز روشن کبھی شام تک نہ پہنچے

ڈاکٹر منور ہاشمی ایک ہمہ جہت شخصیت

پروفیسر عابد علی خٹک

پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی ایک درویش صفت انسان ہیں آپ کا علمی اور ادبی مقام پاکستان کے تناظر میں دیکھا جائے تو نہایت محترم ہے۔ پروفیسر منور ہاشمی ایک مایہ ناز ماہر تعلیم ہیں۔آپ کے طالب علم ہمیشہ اس بابت فخر کرتے ہیں کہ انہیں ایک دوست کی شکل میں ایک شفیق استاد میسر آیا ہے۔

علمی وتدریسی فرائض نبھانے کے ساتھ ساتھ آپ نے تخلیقی شعبوں کی بھی سرپرستی کی ہے۔ریڈیو پاکستان سے لیکر روزنی وی چینل کے فیچنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ڈاکٹر منور ہاشمی کی شخصیت پر بات کرنا آسان نہیں ہے کیونکہ ان کی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ماہر تعلیم ہیں، ملک کے صف اول کے شاعر ہے، صحافی ہیں، نقاد ہیں، نثر نگار ہیں اور ماہر اقبالیات بھی ہیں۔ممتاز عہدوں پر رہ کر انہوں نے اپنی ذات کو مفادات کے الجھن سے پاک رکھا ہے۔ریڈیو پاکستان میں جب وہ ڈائریکٹر پروگرامز تھے تو ملک کے نامور گلوکار کے تقاضے کے باوجود اپنا کلام انہیں نہیں دیا۔آپ سرکاری عہدے سے اپنی ذات کی تشہیر نہیں چاہتے تھے۔منور ہاشمی صاحب ایک سنجیدہ شخصیت ہیں۔مگر ان کی شخصیت کے شگفتہ اور لطیف پہلو بھی ہیں جن کا اظہار خاص خاص مواقع پر کرلیتے ہیں۔ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب کی شخصیت ملکی اور بین الاقوامی سطح پر پذیرائی حاصل کرچکی ہے۔آج کل آپ نادرن یونیورسٹی کے ڈین اور شعبہ اردو کے نگران ہیں۔ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب کا حوالہ ''فکر اقبال'' کے سلسلے میں سند کا درجہ رکھتا ہے۔اگرچہ اقبال پر جتنا محققانہ کام ہوا ہے۔اس پر عقیدت اور تقلید کا رنگ گہرا ہے۔ہاشمی صاحب اقبال کو صحیح معنوں میں قرآن کا مفکر تسلیم کرتے ہیں۔ہاشمی صاحب بھی قرآن کے افکار سے آشنا ہیں۔یہی وہ قدر مشترک ہے کہ ہاشمی صاحب بطور محقق اقبال انفرادی اور تخلیقی حیثیت کے حامل ہیں۔

ہاشمی صاحب ایک محب وطن اور سچے انسان ہیں۔ ان کا تعلق ایک سید گھرانے سے ہے۔آپ کے والد صاحب قرآن کے عالم اور اپنے عہد کے صاحب دیوان شاعر ہیں۔آپ کی تربیت میں والدین کی جھلک آج بھی بھرپور انداز سے متحرک نظر آتی ہے۔منور ہاشمی صاحب کی عقیدت ''محمد عربیؐ'' سے قابل دید ہے۔ان کا نعتیہ کلام مدینہ اور مکہ کی زیارت کے دوران تخلیق ہوا۔شعر میں نعت گوئی کا جو انداز اور اسلوب اپنایا گیا ایک بے مثل کاوش ہے۔منور ہاشمی کی شخصیت فکر اقبال کے حوالے سے گہرائی اور گیرائی کا مجسم پیکر ہے۔ایک دن راقم کے ساتھ گفتگو کے دوران فکر اقبال کا ایسا گوشہ منکشف کیا تو میں حیران ہوا۔ہاشمی صاحب نے ایک شفیق استاذ کی طرح فرمایا کہ اقبال بیک وقت پیش گوئی پیش کرتے ہیں اور اس کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔میں نے کہا وہ کیسے؟ تو فرمایا کہ دیکھو اقبال کے پہلے مصرعے میں پیش گوئی کے اشارات ہوتے ہیں جبکہ دوسرے مصرعے میں اس کا حل ہوتا ہے۔اس طرح انہوں نے مثالوں سے اقبال کے اس انداز اور اسلوب

سے وضاحت پیش کی ۔اس سے مجھے اقبال کی فکر کو سمجھنے کا اک نیا زاویہ سمجھنے کو ملا۔ پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی اگر چہ کم گو ہیں مگر جب بولتے ہیں تو ہر موضوع کی گرہ کھولتے ہیں۔ کسی ابہام کا شکار نہیں ہوتے ۔ زندگی کے بارے آپ کا نظریہ روایت اور جدت کا حسین امتزاج ہے۔ اپنی ثقافت سے قلبی پیوستگی ہے۔ گویا آپ کی شخصیت میں ملتانی اور اسلامی دونوں رنگ رچے بسے ہیں۔ ملتانی سے مراد ملتان جو آپ کی جائے پیدائش ہے اور اسلامی سے مراد اسلام آباد ہے جہاں آج کل رہائش پذیر ہیں۔ نجی زندگی میں ہاشمی صاحب کو میں نے ایک صابر، قناعت پسند اور اصولی شخص پایا۔ پاکستان میں ان کے ایم فل اور پی ایچ ڈیز کے طالب علموں کی تعداد کافی ہے۔ راقم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہاشمی صاحب اکثر میرے مہمان ہوتے ہیں بلکہ میں ان سے از راہ مذاق کہتا کہ ہاشمی صاحب لگتا ہے آپ میرے میزبان ہیں۔ انھوں نے برجستہ جواب دیا کہ خٹک صاحب! اور آپ میرے دل کے میزبان ہیں۔ 2011ء میں جب ہاشمی صاحب اردو یونیورسٹی اسلام آباد کے صدر شعبہ اردو تھے۔ میرا مقالہ دیکھنے کے بعد مجھے ایم فل کی پیشکش کی مگر بوجوہ میں اس کا فائدہ نہ اٹھا سکا۔ میری خوش بختی کے 2017ء میں ناردرن یونیورسٹی نوشہرہ میں ہاشمی صاحب سے اتفاقاً ملاقات ہوئی اور ہماری دوستی کو دوسرا جنم ملا۔ یہیں سے انہوں نے مجھے فکریات اقبال پر کتاب لکھنے کی ترغیب دی۔ میں شاہد ہوں کہ ہاشمی صاحب ایک علم دوست انسان ہیں۔ اپنے شاگردوں کے لئے آسانیاں پیدا کرتے ہیں۔ یہ شفقت انکی شخصیت کا ایک توانا روپ ہے۔

خیر الناس من ینفع الناس

آج تک نہ میں نے سنا ہے اور نہ ہی دیکھا ہے کہ منور ہاشمی نے کسی صلے کے لیے کچھ کیا ہو اللہ کی ذات اور اپنی ذات پر ان کا اتنا کامل یقین ہے۔ دوسروں سے کچھ لینے کے بجائے دوسروں کو نوازتے ہیں۔ نہ وہ گلہ کرتے ہیں نہ ہی فخر یہ لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں۔ مجھے کئی بار ہاشمی صاحب ہمراہ مشاعروں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ میرا مشاہدہ ہے کہ آپ کی شاعری میں ایک انفرادی رنگ ہے۔ کوئی لفظ، ترکیب یا خیال معیار سے کبھی نہیں گرتا۔ عموماً شاعر جسمانی حرکتوں سے اپنے اشعار میں شدت اور تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ہاشمی صاحب کا انداز بیان، اسلوب، لب ولہجہ تمکنت اور وقار کا عکس ہوتا ہے۔ ان کا معتبرانہ انداز شعر گوئی مجلس میں شریک احباب بے حد پسند کرتے ہیں۔ بالکل ایک استاد شاعر کی شان نظر آتی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ اس وقت ہمارے عہد کے ادب کو ایک بلند قامت شاعر نصیب ہوا ہے۔ آپ کے کلام کا تجزیہ کر لینے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ پچھلے کئی عشروں سے ادب پر تنگ نظری کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ ہاشمی صاحب نے سماج اور فرد کی فکری تربیت کا خوبصورت لہجہ اور انوکھے مضامین باندھے ہیں۔

ہم اپنی جاگتی آنکھوں میں خواب لے کے چلے
وہ کیا سوال تھے جن کے جواب لے کے چلے

اک قافلہ تھا ساتھ میرے جانے کیا ہوا
سب لوگ اک مقام پہ رستہ بدل گئے

کچھ اس طرح سے بسر کی ہے زندگی میں
غموں کی چھاؤں میں ڈھونڈی ہے سرخوشی میں

اس تحریر کا مقصد ہاشمی صاحب کی شخصیت کی پرتیں کھولنا ہیں مگر اشعار میں ان کی شخصیت جامع بن کر نکھرتی ہے۔ ہاشمی صاحب ایک خوش پوش انسان ہیں۔خوش گفتار اور نہایت سادہ مزاج ہیں۔مگر جوانی کے دنوں کا ذکر کیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ہاشمی صاحب عمر کے جس حصے میں آج ہیں کہ چوڑے چوڑے شانے، مضبوط جسامت، بھاری بھرکم ہیبت اور توانا صحت کے مالک ہیں تو جوانی میں کیا شان ہوتی ہوگی۔فرمایا کہ میں کوئٹہ سے رات دیر کو پہنچا اور گھر کے سارے افراد تقریب پر گئے ہوئے تھے۔اور مجھے سخت بھوک لگی تھی۔دسمبر کی سردیوں میں مجھے نیند نہ آئے۔تو باہر صحن میں بکریوں پر نظر پڑی۔میں نے ایک بکرے کو پکڑ کر خود ہی ذبح کیا اور خوب رج کے سالم بکرے کو کھالیا۔میں نے ہاشمی صاحب سے کہا یہ ممکن نہیں، ضرور آپ کے ہمراہ جنات بھی شریک ہونگے۔وہ ہنس پڑے کہ جہاں میں ہوں، وہاں جنات کا کیا لینا دینا۔ہاشمی صاحب سیاست پر بھی نظر رکھتے ہیں اور ان کی خاص جماعت سے انسیت بھی ہے مگر عوامی انداز کی نہیں۔چونکہ میرا کسی خاص پارٹی سے کوئی رشتہ نہیں مگر ایک پارٹی کے سربراہ کو قدرے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہوں جسے ہاشمی صاحب پسند نہیں کرتے۔ہم آپس میں کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کے پسندیدہ لیڈروں کی چھترول کر لیتے ہیں مگر بات اس سے آگے نہیں جاتی۔ہاشمی صاحب ماہر اقبالیات ہیں اور کون نہیں جانتا کہ فکر اقبال کے کے لطیف اور بلیغ نکات پر انہیں ملکہ حاصل ہے۔

ہاشمی صاحب کی شخصیت پہلودار ہے۔انکی دور رس نگاہیں پاکستانی سماج، ادب، سیاست، تعلیم اور معاشی مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔ایسی استاد شخصیت جو کہ فکرِ اقبال کے حوالے سے بھی منفرد ہو تو حکومت وقت کو انکی خدمات سے استفادہ کرنا چاہئے۔ہاشمی صاحب ملک کے گوشے گوشے میں کئی ادبی تحریکوں کے محرک ہیں۔خیبر پختونخوا، ضلع نوشہرہ میں ہاشمی صاحب کی بدولت ایک ادبی تنظیم انجمن "جدت پسند مصنفین" کا اجرا ہوا۔مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہاشمی صاحب کی نگرانی میں نے اس کی صدارت کی ہے اس انجمن میں طلبہ طالبات اور علاقے کے شعراء اور ادباء نے بھرپور انداز سے اس کو تقویت بخشی اور تربیت کا بھی اہتمام ہوتا رہا۔ہماری دعا ہے کہ ہاشمی صاحب جہاں جہاں بھی قدم رکھیں وہاں وہاں علم و دانش کے چشمے پھوٹیں۔ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے درمیان ایسے باشعور علم دوست انسان موجود ہیں جن کا جنون اور دانش و بینش آنے والی نسلوں کے لئے مینار ہیں۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

ڈاکٹر منور ہاشمی ۔۔۔روزنِ خیال سے!

اعجاز خان ساحر

یادوں کے خوب صورت جھروکوں سے ماضی کے عکس تلاشنا انسانی مزاج کا خاصہ بھی ہے اور عادت بھی۔ یہی یادا گر انسان کی محبوب شخصیات سے وابستہ ہوتو ماضی ماضی نہیں رہتا بلکہ ہر لحہ وصال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یادانسانی نفسیات میں منفی اور مثبت رویوں کی متحمل ایک ایسی کیفیت سے لبریز ہوتی ہے جو ہر صورت اپنا اثر دکھاتی رہتی ہے۔ کہیں ناصر کاظمی کی شاعری میں یاد کا استعارہ Apathy کا روپ دھار لیتا ہے تو کہیں فیض کی نظموں میں محبوب سے ہم کلامی کا باعث بنتا نظر آتا ہے۔ اُردوادب ہی کیا، دنیا بھر کے ادب میں ''یاد'' ایک استعارہ ہے جو ہمہ وقت مستعمل رہا۔ یہ یاد کہیں فطرت کے مضامین کا عنوان بنی تو کہیں عشقِ مجازی وحقیقی کی نمائندہ بن کر سامنے آئی۔ اُردوادب اور بالخصوص اُردو شاعری میں ''یاد'' کا استعارہ بطرزِ اظہار ہی نہیں بطرزِ روایت بھی تاریخ ادب کا حصہ رہا۔

آج جب اپنے محبوب دوست، ہم دمِ دیرینہ جناب ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب کی شخصیت اور فن کے لیے قلم اُٹھایا تو یہی ''یاد'' میرے لیے نورِ عین کا درجہ حاصل کر گئی۔ ویسے تو ڈاکٹر صاحب سے قلبی وذہنی ہم آہنگی کسی لفظی اظہار یے کی محتاج نہیں مگر جب اپنے خیالات کو لفظوں کا پیراہن دینے لگا تو سوچا کہ ڈاکٹر صاحب جیسی مقتدر علمی وادبی شخصیت کا تذکرہ کہاں سے شروع کروں۔

یہ کوئی سن ۸۴۔۱۹۸۳ء کا واقعہ ہے کہ محترم دوست جناب طارق مسعود صاحب (سب ایڈیٹر روز نامہ جنگ) راولپنڈی کی وساطت سے جناب منور ہاشمی سے پہلی ملاقات نصیب ہوئی۔ ایک طرف طارق مسعود کے ہاشمی صاحب کے لیے تعارفی کلمات اور دوسری طرف جناب ہاشمی کی خوب صورت اور دلکش شخصیت، حکمت وذہانت کی گواہی دیتی ہوئی روشن اور چمکدار آنکھیں، سیاہ گھنگھریالے بال، تیکھے نقوش اور مضبوط قد کاٹھ، جناب منور ہاشمی کی ظاہری درویشی سے اس بات کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ آپ اپنی ذات میں سمندر کا عنوان لیے ہوئے ہیں۔ طارق مسعود نے بطور شاعر اور پروڈیوسر ریڈیو پاکستان راولپنڈی آپ کا تعارف کرایا مگر جب ہاشمی صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا تو آپ کے علمی وفنی اختصاص کی پرتیں کھلنے لگیں۔ وقت گزرتا چلا گیا اور ڈاکٹر ہاشمی سے رفاقت ومحبت کا سلسلہ عقیدت میں ڈھلتا چلا گیا اور اُن سے ذاتی تعلق کا سلسلہ گھریلو تعلق میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے والد جناب عبداللطیف شاہ بھی علمی وادبی شخصیت کے مالک تھے، اُن کی معیت میں بھی بیٹھنے کا موقع میسر آیا جہاں سے علم وحکمت کی خوشبو روح کی سیرابی کا باعث بنتی رہی۔ اُن کی شاعری اور اندازِ گفتگو ذہن پر آج بھی دستک دیتا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جناب منور ہاشمی کے چھوٹے بھائی جناب غضنفر ہاشمی سے ملاقات کا سلسلہ ایک الگ مضمون کا تقاضا کرتا ہے۔

اس عرصے میں جناب منور ہاشمی فتح جنگ کی ادبی محافل کی رونق بنتے رہے اور مسلسل رہنمائی فرماتے رہے۔ اسی دوران منور ہاشمی صاحب، ملک غلام صابر مسعود، محمد صفدر حسرت، طارق مسعود اور بندۂ ناچیز کی مجموعی مساعی سے فتح جنگ سے پہلا ادبی مجلہ سہ ماہی ''عروج'' کا اجراء کیا گیا۔ ہاشمی صاحب کے بیرون ملک بسلسلہ روزگار جانے کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ بظاہر تعطل کا شکار رہا مگر دل اُن کی یاد اور محبت سے آباد رہا۔

ڈاکٹر منور ہاشمی سے عرصہ کے بعد دوبارہ رسمی ملاقاتوں کے سلسلے کا آغاز ایک خوب صورت واقعہ سے عبارت ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ سن ۲۰۱۸ء میں آرٹس کونسل راولپنڈی میں ایک مشاعرہ میں موجود تھا کہ جناب ہاشمی اس محفل میں تشریف لائے تو منصور آفاق، انجم خلیق، رحمان حفیظ اور دیگر دوستوں سے ملے اور مجھے درمیان میں چھوڑ گئے۔ میں سوچنے لگا کہ شاید مدت بعد آمنا سامنا ہوا ہے تو پہچان نہیں پائے مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب سب کو مل کر دوبارہ میرے پاس آئے اور کمال اپنائیت سے میرا نام لے کر مجھے گلے لگا لیا اور دیر تک بغل گیر رہے اور گویا ہوئے کہ آپ جیسے دوستوں کو بھلا میں کیسے بھول سکتا ہوں، میں نے آتے ہی آپ کو پہچان لیا تھا مگر چاہتا تھا کہ بعد میں وقت پا کر آپ سے ملوں!!! جب کبھی وہ منظر یاد آتا ہے تو دل اُن کی محبت سے سرشار ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی اب بھی فتح جنگ میں ادبی تنظیم ''چوپال انٹرنیشنل'' کے زیرِ اہتمام سجائی جانی والی ادبی تقاریب میں تشریف لا کر رونقوں کو دوبالا کرتے ہیں۔ میں اُن کی درازیٔ عمر اور علمی وسعت کے لیے ہمہ وقت دعا گو رہتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں ان کے دوستوں میں شامل ہوں اور اس کرم پر اپنے اللہ رب العزت کے حضور سجدہ ریز ہوں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے

شاہد نعیم

صدر، پاکستان جرنلسٹس فورم، نمائندہ خصوصی جنگ، جیو، جدہ سعودی عرب

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سعودی عرب کے شہر جدہ میں ایک خبر نے ہلچل مچادی۔ خبر کیا تھی کہ پاکستان کے نامور شاعر منور ہاشمی عمرے کی غرض سے جدہ تشریف لا رہے ہیں۔ مختلف ادبی تنظیموں نے پروگرام بنانا شروع کر دیے کہ ان کا استقبال کس طرح کیا جائے۔ یہ واقعہ ہے اپریل ۱۹۹۳ء کا۔ وہ آئے اور عمرے کے لیے مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ وہیں سے تمام مناسک کی ادائیگی کے بعد دیارِ حبیبؐ پہنچے اور وہاں سے جدہ واپسی ہوئی۔ اس سے پہلے کہ جدہ سے بھی واپسی ہو جاتی، پاکستان قونصل خانے نے ایک تقریب منعقد کی۔ اس تقریب میں جدہ میں مقیم پاکستانیوں کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے تمام نمائندوں نے شرکت کی اور منور ہاشمی کی علمی و ادبی باتوں سے جی بھر کے استفادہ کرنے کی کوشش کی۔ اس اجلاس میں قونصل جنرل اور پاکستان ایمبیسی کالج کے پرنسپل نے انھیں جدہ میں رک جانے کی درخواست کی۔ انھوں نے کہا، میں اسلام آباد میں اس وقت گریڈ 19 کا سرکاری ملازم ہوں۔ جواب ملا، یہاں مکہ اور مدینہ میں یہ معاملہ گریڈوں سے بہت آگے کا ہے۔ منور ہاشمی صاحب اس سے آگے کچھ نہ بول سکے، انھیں ویزہ دے دیا گیا اور وہ پاکستانی کالج سے وابستہ ہو گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے ان کے لیے سب انتظام کر رکھا تھا، اہلِ علم و ادب ان کے جدہ میں قیام سے بہت خوش تھے۔ غالباً وہ بارہ تیرہ سال یہاں موجود رہے۔ اس دوران ان کی پاکستان والی ملازمت بھی باقی نہ رہی مگر وہ ہر چیز سے بے نیاز جدہ میں پاکستانی بھائیوں کی خدمت پر مامور رہے۔ ہم چشم دید گواہ ہیں کہ وہ سارا سارا دن پاکستان کی خدمت کرتے تھے، ان کے پاس طلبہ کے علاوہ شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ان کی صحبت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بے شمار لوگ شاعر ادیب اور صحافی بن گئے۔ انھوں نے جدہ میں جو چشمۂ فیض جاری کیا، اس سے ہزاروں نے فائدہ اٹھایا۔ ہمیں وہ دن یاد ہیں جب ان کے دولت خانے پر رات کے دو دو بجے تک تشنگانِ علم کا ہجوم ہوتا تھا۔ منور ہاشمی کو ہم نے اپنی تھکن کا اظہار کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ مختلف موضوعات پر مختلف لوگوں کی رہنمائی ہو رہی ہے، ہر کوئی اپنی طلب اور بساط کے مطابق استفادہ کر رہا ہے، مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب انھوں نے جدہ میں عالمی اُردو مرکز کے قیام کا اعلان کیا۔ نسیم سحر، نور محمد جرال اور راقم الحروف ابتدائی طور پر اس تنظیم میں ان کے دست و بازو بنے لیکن بعد میں یہ تنظیم اتنی مضبوط ہو گئی کہ جدہ میں اس کے علاوہ کوئی اور تنظیم نظر ہی نہیں آتی تھی۔ پاکستانی سفارت خانہ اور قونصل خانہ اس تنظیم کی بھرپور سرپرستی اور تعاون کر رہا تھا۔ اس تنظیم کے زیرِ اہتمام ہر مہینے میں کوئی تقریب منعقد ہوتی تھی۔ ہنگامی نوعیت کی تقریبات بھی الگ سے تھیں۔ رفتہ رفتہ اُردو مرکز کا دائرۂ کار پھیلتا چلا گیا۔ مجلسِ اقبال کے نام سے ایک ذیلی ادارہ بھی قائم ہوا۔ اس ادارے کی سرگرمیاں الگ سے شروع ہو گئیں۔ فروغِ اقبالیات اس ادارے کا مقصد تھا۔ اس کی تقریبات میں تفہیمِ اقبال کے لیے بہت

کام ہوا۔ بعدازاں اُردو مرکز کا شعبۂ خواتین بھی قائم ہوگیا۔ اس شعبے کے تحت خواتین کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لیے بھرپور کام ہوا۔ یہ تنظیم خواتین کی واحد مصروفیت بن گئی تھی۔ اس طرح جدہ میں مقیم پورے پاکستانی برادری علمی و ادبی کاموں میں مصروف ہوگئی تھی۔ انھی صحت مند مصروفیات کی وجہ سے پاکستان کا نام روشن ہوا۔ پاکستان کے حوالے سے ہر قسم کے منفی تاثر کی نفی ہوئی۔ جدہ میں پاکستانی برادری کے لیے ان کی خدمات کا شمار ممکن نہیں۔ ایسے لوگ لاکھوں میں ایک ہوتے ہیں جو اپنا نقصان کر کے بھی دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ انھوں نے وہ کام کیے جو سفارت خانے بھی نہیں کر سکتے، وہ پاکستان کے حقیقی سفیر تھے، علم و ادب کی جو شمعیں انھوں نے روشن کیں، ان کی روشنی کبھی کم نہیں ہو سکتی۔ جدہ سے چھپنے والا عرب دنیا کا پہلا اور واحد اُردو اخبار ''اُردو نیوز'' بھی ان کی خدمات کا معترف رہا۔ اس اخبار کے لیے ان کی مساعی اور خدمات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اُردو زبان و ادب ان کی زندگی کا مشن تھا۔ اس مشن کی تکمیل کے لیے ہر لمحہ وقف رکھا۔ یہ ان کی اور ان کے ادارے کی کوششیں تھیں جن کی وجہ سے اُردو زبان خلیجی ممالک میں دوسری بڑی زبان کی حیثیت اختیار کر گئی۔ آج بھی بے شمار مشاعرے اور دیگر تقریبات کا انعقاد اس بات کا ثبوت ہے کہ ان مساعی کے پیچھے کوئی بڑی شخصیت تھی جس کے اثرات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ سابق وفاقی وزیر اور روزنامہ جنگ کے ممتاز کالم نگار ارشاد احمد حقانی کے یہ الفاظ کتنے درست اور ناقابلِ فراموش ہیں: ''جدہ میں دو سمندر ہیں، ایک پانی سے بھرا ہوا اور دوسرا علم سے۔'' علم سے بھرا ہوا سمندر جس کا نام منور ہاشمی ہے، اہلِ جدہ کے دلوں میں آج بھی مقیم ہے۔

جدہ میں قیام کے دوران ان کے اعزاز میں بے شمار تقاریب منعقد ہوئیں، سب سے بڑی تقریب ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل طائف میں ''جشنِ منور ہاشمی'' کے نام سے منعقد ہوئی جس میں پوری مملکت سعودیہ سے شاعروں اور ادیبوں نے شرکت کی اور انھیں اعزازات پیش کیے۔ اس کے علاوہ جدہ میں رہتے ہوئے جب انھیں پی ایچ ڈی ڈگری تفویض ہوئی تو ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑی تقریب کا انعقاد کیا گیا جو جدہ کے بہت بڑے لاثانی ہوٹل میں ہوئی۔ اس تقریب میں وہاں کے تمام پی ایچ ڈی ڈاکٹرز نے شرکت کی اور ڈاکٹر منور ہاشمی کو خراج تحسین پیش کیا۔ یہ تقریب چھ گھنٹے جاری رہی۔ اس میں انھیں مختلف تحائف اور اعزازات سے نوازا گیا۔ یہاں قیام کے دوران میں انھوں نے بے شمار عرب شہریوں کو اُردو زبان سکھائی۔ بعض تو اُردو کے شاعر بن گئے اور بعض نثر نگار۔ منور ہاشمی جدہ میں پاکستانیت کی علامت تھے۔ انھوں نے اپنے ملک کی عزت میں ہر لمحہ اضافہ کیا۔ ان کا لباس، ان کی گفتگو اور ان کی سرگرمیاں پاکستانیت کی شناخت کا باعث تھیں۔ وہ چلتا پھرتا قومی تشخص تھے۔

جدہ سے وہ اسلام آباد چلے آئے یعنی اب مکمل طور پر اسلام آباد کو میسر ہیں۔ عظیم شخصیات صرف خوش قسمت مقامات کو میسر آتی ہیں۔ فیض کے اس چشمے سے وہاں لوگ استفادہ کر رہے ہیں مگر یہاں لگائے ہوئے ان کے پودے بھی تناور درخت بن چکے ہیں جن کی چھاؤں سے ہم جیسے طالبانِ علم و محبت فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

میرا نام ہے منور، میرا کام روشنی ہے

محسن بخاری

یہ مارچ ۲۰۱۴ء کی بات ہے کہ میں نے فیڈرل اُردو یونی ورسٹی، اسلام آباد میں بطور ایم فل سکالر داخلہ لیا۔ یونی ورسٹی میں میرا پہلا دن تھا اس لیے یونی ورسٹی کا ماحول یک سر اجنبی تھا۔ کلاس شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت رہتا تھا اس لیے سوچا کہ صدر شعبہ کے دفتر جاوں اور ان سے ملاقات کر لوں۔ میں جب صدر شعبہ کے دفتر میں داخل ہوا تو دفتر میں صدر شعبہ کے علاوہ ایک اور بارعب اور پر وقار شخصیت بیٹھی ہوئی تھی۔ سلام اور دعا کے بعد میں اجازت لے کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ صدر شعبہ ڈاکٹر وسیم انجم نے اس بیٹھی ہوئی شخصیت سے میرا تعارف کروایا اور بتایا کہ یہ ہمارا ایم فل اردو کا نیا سکالر ہے اور اس کا تعلق آزاد کشمیر سے ہے۔ اس کے بعد وہ باہم گفت وشنید میں مصروف ہو گئے۔ دورانِ گفتگو مجھے معلوم ہوا کہ یہ پر رعب اور پر وقار شخصیت ڈاکٹر منور ہاشمی ہیں جو ایک محقق، ماہرِ تعلیم، ماہرِ اقبالیات ہونے کے ساتھ ساتھ قادر الکلام شاعر بھی ہیں۔ یہ تھا وہ پہلا مختصر تعارف جو بعد میں میرے لیے ایک انتہائی خوب صورت تعلق میں تبدیل ہو گیا اور یہاں تک کہ میں نے ڈاکٹر وحید قریشی جیسی ہمہ جہت شخصیت کے شاعرانہ پہلو پر تحقیقی کام بھی آپ ہی کی نگرانی میں سر انجام دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے اور آپ کے علمی فن سے استفادہ کا موقع بھی ملا ہے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی اپنے چہرے ہی سے ایک علمی و ادبی شخصیت نظر آتے ہیں۔ آپ تقریباً دوہرے بدن کے مالک ہیں۔ آپ کا چہرا گول، آنکھیں سنجیدہ مگر ایک خاص چمک سے بھرپور، ناک متوازن، نازک فریم کی عینک، رنگ گندمی، سر اور مونچھوں کے بال سفیدی مائل، سر کے بالوں اور مونچھوں کی تراش خراش سے آپ علامہ اقبال سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ آپ کی آواز آپ کی شخصیت کے عین موافق رعب دار اور پرکشش۔ لباس میں پینٹ، کوٹ اور ٹائی، میں نے آپ کو کبھی شلوار قمیص میں نہیں دیکھا۔ البتہ کچھ تصویروں اور ٹی وی پروگراموں میں ایسا ضرور دیکھا ہے جن میں آپ نے شلوار قمیص پہن رکھی ہو۔ خوش خوراکی آپ کی کمزوری ہے۔ کم کھاتے ہیں مگر نفیس، کھانے کی دعوتوں کو نہ صرف قبول کرتے ہیں بل کہ خود بھی دعوتوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ آپ میں وہ تمام اوصاف جو ایک مدبر، پر وقار اور بارعب شخصیت میں ہونے ضروری ہوتے ہیں موجود ہیں۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کی شخصیت کے اسرار و رموز میرے پر دورانِ تدریس وا ہوتے چلے گے۔ آپ جس درجے کی علمی، ادبی اور تحقیقی شخصیت ہیں تو ایسی شخصیات سے لوگ لاشعوری طور پر ایک رعب اور دوری محسوس کرتے ہیں مگر ڈاکٹر صاحب ایک ایسی درویش اور عاجز مزاج شخصیت ہیں کہ اتنی بڑی علمی و ادبی شخصیت ہونے کے باوجود ہر کسی کے ساتھ اچھے اور دل نشیں انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ اپنے دفتر میں آپ ایک ہمہ جہت انسان کے روپ میں جلوہ گر ہوتے تھے۔ کلاس کے بعد

آپ کے دفتر میں علمی، ادبی گفتگو کے ساتھ ساتھ مختلف سماجی اور عمرانی موضوعات بھی زیرِ بحث آتے۔ان سارے موضوعات پر میں نے ڈاکٹر صاحب کو جس قدر وسیع، مدلل اور باریکی کے ساتھ گفتگو کرتے سنا وہ آپ ہی کا ایک اعزاز ہے۔کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ سے کسی قسم کا علمی سوال کیا گیا ہو اور اس کا شافی جواب نہ ملا ہو۔اردو تاریخ و ادب ہو یا اسالیبِ نثر کا بیان، شاعری کی پر پیچ مباحث ہوں یا عربی و فارسی ادب کا موضوع، ڈاکٹر منور ہاشمی ایک ایک گوشے کو منور کرتے چلے جاتے ہیں۔

آپ کے پڑھانے کا انداز میرے لیے ایک نیا تجربہ رہا۔جس سہل اور ہلکے پھلکے انداز میں آپ مشکل سے مشکل موضوع کو بھی تدریس کرواتے ہیں اس میں آپ کا کوئی ثانی نہیں۔دوران لیکچر آپ کی آواز کے زیروبم اور موضوع کی تفہیم سکالرز کو اپنی طرف پوری شدت کے ساتھ جوڑے رکھتے ہیں۔آپ کسی بھی موضوع پر پہلے خود سیر حاصل تبصرہ کرتے اور ساتھ ساتھ اس ٹاپک کے اہم اور قابلِ تفہیم نکات وائٹ بورڈ پر لکھ دیتے اور پھر ایک کے بعد ایک تسلسل کے ساتھ آپ ان نکات کو اپنے شاگردوں پر اس طرح آشکار کرتے چلے جاتے کہ زیرِ کار موضوع پوری جزیات سمیت ذہن نشین ہو جاتا۔آپ کی کلاس کتنی طویل کیوں نہ ہو آخر تک سب طلبہ تروتازہ انداز میں بیٹھے رہتے۔خشک اور بوجھل موضوعات بھی اسی طریقہ تدریس سے آسان اور سہل انداز میں پیش کر کے آپ اپنی تدریسی مہارتوں کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔آپ نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ اپنے علمی و ادبی قد کاٹھ کا رعب ڈالنے کے لیے مشکل گوئی یا فلسفیانہ موشگافیوں سے کام لیا جائے۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا ایک اور اہم رُخ یہ ہے کہ آپ اپنے شاگردوں کے ساتھ نہایت مشفق اور مہربان رہتے ہیں۔شاگردوں کے مسائل کو ذاتی دلچسپی کے ساتھ سن کر ایک دوست اور رہبر کی طرح ان مسائل کا حل پیش کرتے رہتے ہیں۔میرا نہیں خیال کہ آپ کا کوئی ایسا شاگرد ہوگا جو یہ نہ کہتا ہو کہ ڈاکٹر صاحب جس شفقت اور مہربانی کا سلوک اس سے کرتے ہیں وہ کسی اور کے ساتھ ہوگا۔اور حقیقت یہی ہے کہ آپ کا یہ مشفقانہ سلوک ہر ایک کے ساتھ اپنی اپنی جگہ موجود تھا۔کلاس کے بعد آپ کا دفتر شاگردوں سے بھرا رہتا تھا۔

مزاح، ظرافت اور حاضر جوابی بھی آپ کی شخصیت کا خوب صورت پہلو ہے۔اپنی خوب صورت باتوں اور ظرافت بھرے مزاح نے بھی آپ کی شخصیت کو مزید جاذب بنایا ہے۔مگر اس مزاح اور ظرافت میں آپ نے کبھی کسی کی ذات کو نشانہ نہیں بنایا۔ایک جہاں دیدہ استاد کی طرح یہاں بھی آپ اپنے اس فن سے کوئی نہ کوئی سبق دیتے رہتے ہیں۔بالکل ہلکے پھلکے انداز میں انتہائی سنجیدہ بات کو پیش کر دینے کا ہنر آپ ہی کا خاصہ ہے۔

کسی بھی حقیقی علمی و ادبی شخصیت کا یہ بڑا پن ہوتا ہے کہ لوگوں کو اس کی سنگت میں اپنی کم علمی اور کم مائیگی کا احساس نہ ہو بلکہ وہ اس کے زیرِ سایہ پُر اعتماد رہتے ہوئے اپنے علم و ہنر میں اضافہ کرتے جائیں اور شعوری اور لاشعوری طور پر وہ اس شخصیت کے اعلیٰ اوصاف کو اپنی ذات میں اتارنے کی کوشش کریں۔عموماً دیکھا گیا ہے کہ علمی و ادبی شخصیات اپنے

مخصوص دائرے میں رہتے ہوئے بات چیت کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ایسی شخصیات سے ایک حدِ فاصل قائم کر لیتے ہیں اور یوں اس علمی شخصیت کے علم سے اکتساب کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر منور ہاشمی کی علمی وادبی شخصیت میں وہ ظرف اور بڑا پن ہے کہ کوئی کم علم بھی آپ کے پاس بیٹھ کر کسی ڈر، خوف یا علمی کم مائیگی میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ ایک اعتماد اور حوصلے کے ساتھ وہ ایک امید لے کر جاتا ہے۔ ہاشمی صاحب ایک کھلی کتاب کی طرح اپنے علوم وفنون شاگردوں میں تقسیم کرنے کے لیے دستیاب رہتے ہیں۔ کوئی ہو کہیں کا ہو آپ کے علم سے بخوبی استفادہ کر سکتا ہے۔ سکالرز آپ کے حلقہ ارادت اور شاگردی میں رہ کر بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اگر کسی کی کوئی خامی دیکھ بھی لیں تو بہت خاموشی اور غیر محسوس طریقے کے ساتھ اس کی اصلاح کرتے ہیں۔ بحیثیت استاد یہ آپ کا بہت بڑا پن ہے۔ آپ کی یہی صفت آپ کو شاگردوں یہاں تک کہ کولیگز میں بھی ہر دل عزیز بناتی ہے۔

آپ کی ذاتی زندگی نہایت سادہ اور خدا مست ہے۔ آپ اللہ پر کامل بھروسا کرنے والے انسان ہیں۔ بہت سارے اہم اور بڑے عہدوں پر رہنے کے باوجود آپ کے اندر عاجزی اور انکسار موجود ہے۔ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی مخصوص پہچان ہے۔ نعتیہ کلام پر مشتمل آپ کا ایک مجموعہ کلام ''لوح بھی تو قلم بھی تو'' اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کے اندر عشقِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اس مجموعے کا مطالعہ انسان کو آپ کی شخصیت کے روحانی اور فکری نظام سے متعارف کراتا ہے۔ آپ علامہ اقبال سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ بطور ماہرِ اقبالیات آپ پاکستان کے معدودے چند استادوں میں شامل ہیں۔ آپ اس صدی میں بھی اقبالیات کے طالب علم کے لیے ایک نایاب سرمایہ ہیں۔ اردو ادب آپ کی خدمات کا معترف ہے اور آپ کو خراجِ تحسین پیش کرتا رہے گا۔ آپ کا وجود اردو ادب سے منسلک افراد کے لیے کسی سرمائے سے کم نہیں۔

ایک دل نواز شخصیت

حمیرا جمیل

انسانی زندگی مختلف عناصر کا مجموعہ ہے اور ہر عنصر اپنا ایک خصوصی جوہر رکھتا ہے جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔اس حقیقت کا ادارک ہر ذی شعور کو ہے جس سے انکار نا روا ہے۔

ہماری زندگی میں بہت سے لوگ آتے ہیں جنھیں ہم کسی نہ کسی موڑ پر الوداع نہ کہہ دیتے ہوں۔خال خال ایسے ہوتے ہیں جو تادم زیست ہماری توجہ کا مرکز بنے رہتے ہیں اور اُس کی وجہ اُن کی شخصیت میں کسی نمایاں خوبیوں کا بھرپور امتزاج۔

آج جس شخصیت کا تذکرہ مقصود ہے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔اپنا تعارف خود آپ ہے۔جس محفل میں پہنچ جائے اُس کی جان بن جاتی ہے۔بے تکلفی اور سادگی کی انتہا ہے۔ایک ہی نشست میں فاصلے، دوریاں، اجنبیت ختم ہو جاتی ہے۔شناسائی، دوستی، قربت اور اپنائیت کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔بات سے بات نکالنا، محفل کی توجہ کا مرکز بنے رہنا، ہر موضوع پر فی البدیہہ اور بے تکان بولتے چلے جانا، چہرے بُشرے پر مستقل طور پر خوبصورت مسکراہٹ جس میں مخاطب کے لیے شناسائی اور اپنائیت کا احساس، گفتگو میں شرینی اور مٹھاس، دل شکنی، کڑواہٹ یا تلخی کسی کونے کھدرے میں بھی مفقود۔ مزاج میں سیمابی کیفیت جیسے خوب سے خوب تر کی تلاش۔

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

شہر کے وسیع و عریض سینے کے کسی حصے میں بھی کوئی علمی، ادبی یا ثقافتی مجلس اُن کی موجودگی کے بغیر ادھوری لگتی ہے۔وہ دوستوں کے دوست ہیں، اور کسی سے دشمنی کا ان کے کردار و عمل میں شائبہ تک نہیں ملتا۔ان کا قول ہے کہ شعور اور آگہی علم کے ذریعے پیدا ہوتی ہے، اور وہ قومیں، ملک اور معاشرے انسانی ترقی کی معراج پر پہنچ جاتے ہیں جنھوں نے تعلیم کو اولیت دی۔اُن کو یہ بھی کہنا ہے کہ علم اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔علم ایک نور ہے اور حصول علم انسان کی تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی ضرورت ہے اور ادب انسان کی شخصیت اور اخلاق کو بنیاد فراہم کرتا ہے، لہٰذا اخلاقی قدروں کی عمارت بے شمار بنیادوں پر استوار ہوتی ہے، اور مختلف عناصر کے عمل سے ہی بااخلاق شخصیت کی داغ بیل پڑتی ہے۔وہ درس گاہوں کو تحصیل علم اور تعمیر سیرت کا بہترین مرکز قرار دیتے ہیں اور ذہنی تعمیر و ترقی میں ایک معلم کے کردار کو بہترین راہنما قرار دیتے ہیں، اور

معلمی کے پیشے سے اپنی وابستگی کو وہ اپنا سب سے بڑا فخر قرار دیتے ہیں۔

شاگرد اعلیٰ مناصب پر ہزاروں کی تعداد میں لیکن نیاز مند۔ زندگی کو زندگی سمجھ کر گزارنا یعنی دوسروں کے لیے زندہ رہنا۔ اپنے دائرہ اختیار میں سب کے کام آنا، واقف ناواقف کا مصنوعی پن پاش پاش کرنا فرض اولین۔ سب حلقوں میں یکساں مقبولیت۔ بے ضرر شخصیت، نامور علمی وادبی شخصیات میں ایک تعارف۔ ڈاکٹر منور ہاشمی ایک دل نواز شخصیت، پروفیسر ،شاعر، ادیب ،لکھاری ،سب کا دوست۔

نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو

رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

مجھے ناز ہے کہ آج ایک ایسے قلم کار، شاعر وادیب پر قلم اٹھایا ہے جو اولاً تو ایک بلند کردار انسان ہے، ثانیاً، مستقل مزاجی کے ساتھ مصروف شعر وسخن ہے اور گیسوئے اُردو کو نکھار رہا ہے سنوار رہا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر منور ہاشمی پر قلم اٹھا کر میں وہ آسودگی محسوس کرتی ہوں جو کسی تبصرہ نگار کو مطلوب ہوتی ہے۔ اس مضمون کی تخلیق نے طبیعت میں جو خوش گواری پیدا کر دی ہے اس سے لگتا ہے کہ جیسے میرے اپنے اندر کے تبصرہ نگار کو ایک عرصہ بعد سکون وقرار میسر آیا ہے۔

منور ہاشمی

سعادت حسن آس

سادہ طبیعت، دل نشین سراپا، کانوں میں رس گھولتا لب ولہجہ۔۔۔ کیوں نہ ہو۔ یہ اس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے جس کی سیرت وکردار کی کل کائنات گرویدہ ہے۔ ہاشمی صاحب سے میری ملاقات تقریباً پینتیس سال پہلے ہوئی جب میں ملازمت کے سلسلے میں اٹک سے ٹرانسفر ہوکر راولپنڈی چلا گیا تھا۔ گو وہاں کا ماحول میرے لیے اجنبی تھا اور میں چاہتا تھا کہ اپنا ہم خیال کوئی ایسا دوست مل جائے جو میرے مزاج سے واقفیت حاصل کرلے۔

راولپنڈی شہر سے پرانی آشنائی تھی، کچھ رشتہ داریاں بھی تھیں لیکن آنا جانا کم تھا۔ مشاعروں میں بھی شرکت کرتا رہتا تھا۔ جناب انوار فیروز صاحب کی شفقتوں کے باعث چکوال کے آل پاکستان مشاعروں میں بھی جایا کرتا تھا۔ اسی دوران چند شعرا سے صاحب سلامت ہوئی جن میں ریڈیو پاکستان سے تعلق رکھنے والے اختر امام رضوی اور جناب منور ہاشمی صاحب میرے بے حد قابلِ احترام دوست بن گئے۔ ریڈیو کی وساطت سے ہر دو صاحبانِ فکرونظر سے ملاقاتیں رہا کرتی تھیں۔ اختر امام رضوی صاحب اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ ان دوستوں کے علاوہ راولپنڈی میں قیام کے دوران میرے جن ادبا سے روابط بڑھے اُن میں سے رشید نثار (مرحوم)، پروفیسر کرم حیدری (مرحوم) قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے میرے کلام کی نوک پلک سنوارنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔

منور ہاشمی صاحب پروگرام ''نگارش'' کے پروڈیوسر تھے جو گاہے گاہے مجھے اپنے پروگرامز میں مدعو کرتے رہتے۔ ۹۰۔۱۹۸۹ء میں صدرِ پاکستان غلام اسحاق نے ۱۹۹۰ء کو سن ہجری کے طور پر منانے کا اعلان کیا تو میرے اندر بھی اس خواہش نے جنم لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی عقیدت کا اظہار کروں چنانچہ جب اپنی اس خواہش کا اظہار منور ہاشمی صاحب کے سامنے کیا تو انھوں نے مجھے سراہا۔ ان کی حوصلہ افزائی کے بعد مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ ملا اور میں نے نعتیہ مجموعے کے سلسلے میں کلام لکھنا شروع کیا اور اُس کا نام ''آس کے پھول'' تجویز کیا۔ جس کا فلیپ ہاشمی صاحب نے ہی تحریر کیا تھا۔

جب تک ہاشمی صاحب ریڈیو پاکستان سے منسلک رہے، میں تواتر کے ساتھ اُن کے دفتر جاتا اور اپنا کلام سنایا کرتا اور وہ ہر بار میری حوصلہ افزائی کرتے۔ یہ سلسلہ اُس وقت ختم ہوا جب وہ آپ سعودی عرب میں فروغ اُردو کے سلسلے میں چلے گئے لیکن یہ دوری میرے دل سے آپ کے محبت کے چراغ کو گل نہ کر سکی۔ مدت کے بعد میری اُن سے ملاقات اٹک کے مشاعرے میں ہوئی جہاں آپ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تشریف لائے۔

میرے دل میں آج بھی اُن کی محبتوں کے چراغ روشن ہیں اور دل میں اُن سے ملاقات کی خواہشیں انگڑائیاں لیتی رہتی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ وہی ساعتیں پلٹ کر آئیں اور میری ہاشمی صاحب سے روزانہ ملاقاتیں ہوں، میں اُسی طرح پیدل چل کر اُن کے دفتر میں جاؤں اور اُنھیں کلام سناؤں۔ اللہ آپ کو صحت اور سلامتی والی زندگی عطا فرمائے۔ آمین۔

پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی میری نظر میں

گل بخشالوی

کچھ ادب دوست ایسے ہوتے ہیں جن سے ملنے اور انہیں پڑھنے سے سکون ملتا ہے ۔ دورِ حاضر میں وہ ادب دوست جن کو پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی جیسے روشن خیال ، گلشن مزاج ، خوش گفتار اور قلم کے حوالے سے صاحب کردار ادب دوستوں کی دوستی نصیب ہوا اُن خوش نصیب ادب دوستوں میں ایک میں ہوں ۔ قلم قافلہ پاکستان دنیائے اُردو ادب کی پہچان تنظیم ہے 1984ء سے قلم قافلہ کا ادبی سفر جاری ہے ۔ قلم قافلہ کے ابتدائی دور میں سلطان سکون ، شاہنواز سواتی ، پریشان خٹک ، سرور انبالوی ، ڈاکٹر وزیر آغا ، احمد فراز ، رئیس امروہوی ، احمد ندیم قاسمی ، شیر افضل جعفری جیسے بلند پایہ سخنورانِ جہاں کا قلم میرے ادبی سفر میں حوصلہ افزائی کیلئے مشعل راہ رہا ایسے قابل فخر دوستوں میں پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی بھی تھے جن سے میری بالمشافہ ملاقات تو نہیں تھی لیکن میں پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کو اُن کی غزل اور نظم ونثر میں پڑھتا رہا ہوں ۔

فیس بک پر خبر نظر سے گزری ، اٹک سے شائع ہونے والے میگزین ،، دھنک رنگ ،، کا پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی نمبر شائع ہو رہا ہے ۔ پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کے فن اور شخصیت پر قلم اُٹھانا پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کے میرے جیسے چاہنے والے کیلئے تو مشکل ہے اس لیے کہ پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی دورِ حاضر میں علم وادب کے اُس مقام پر ہیں جہاں اُنہیں دیکھ اور سوچ کر خود پر فخر تو کر سکتا ہوں لیکن ان کے فن اور شخصیت کا احاطہ نہیں کر سکتا اور ویسے بھی ایسی عظیم شخصیت کیساتھ زندگی کے خوبصورت دنوں میں یادگار بیٹھک نہ ہو اُن کی شخصیت اور قد کے ساتھ شعوری چہل قدمی کا موقع نہ ملا ہو تو اُن کے حسن کردار کی عکاسی مشکل ہوتی ہے ۔ پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی سے ایک ملاقات اپنے گھر پر اور دوسری ملاقات اُن کے گھر پر ہوئی ہے ان دو ملاقاتوں میں پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کے چہرے کے تاثرات اور زبان پر لفظوں کے گلاب دیکھے تو خود پر رشک کرنے لگا ایسی گل بہار شخصیت سے دوستی اس سے بڑا اعزاز میرے لئے اور کیا ہو سکتا ہے اس لیے سوچا کہ اُن کی شخصیت علم وادب کے حسن کا احاطہ تو نہیں کر سکوں گا البتہ پشتو میں سوچ کر بے ترتیب اُردو میں جو لکھوں گا وہ میرا ہی انداز ہو گا اور اپنے اس انداز سے اُن کے فن اور شخصیت پر لکھنے والے دنیائے اُردو ادب کے قابل فخر لکھنے والوں کی فہرست میں شامل ہو جاؤں گا ۔

پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی سے پہلی بالمشافہ ملاقات کاشانہ علم وادب بخشالی منزل کھاریاں میں ہوئی آپ ڈاکٹر سیّد اشفاق حسین بخاری کی زیرِ نگرانی گل بخشالوی کی ادبی خدمات پر محمد سلیم سندھو کے تحقیقی مقالہ برائے ایم فل کے سلسلے میں گجرات تشریف لائے تھے ۔ قلم قافلہ پاکستان کے صدر پروفیسر اشفاق شاہین نے آپ کی تشریف آوری کی خبر دی اور میں نے خوبصورت ادبی شخصیت سے بالمشافہ ملاقات کو یادگار بنانے کیلئے بخشالی منزل میں اُن کی زیرِ صدارت مشاعرے کی

خواہش کا اظہار بوساطت اشفاق شاہین کیا اور آپ محترم نے باوجود مصروفیت کے دعوت قبول کر لی۔ شاید وہ بھی کھاریاں شہر میں سلطان سکون کے ادبی جادوگر سے ملنے کے خواہشمند ہوں۔

شامِ غزل میں آپ اشفاق شاہین، عتیق الرحمان صفی اور گل بخشالوی کی ادبی خدمات پر ایم فل کے تحقیقی مقالہ پر پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کے دستخط سے ایم فل کی ڈگری سے سرفراز محمد سلیم سندھو کیساتھ کاشانہ علم وادب بخشالی منزل تشریف لائے یہ راقم کیلئے ایک بڑا اعزاز اور ادبی خدمات کا بالمشافہ اعتراف تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کی زیر صدارت شامِ غزل میں دوسرے شعراء کیساتھ پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کو پہلی بار بالمشافہ سنا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ کلام اپنی جگہ لیکن اندازِ غزل لاجواب تھا کسی شاعر کی یہ سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے کہ وہ مشاعرے میں اپنی غزل کی گہرائی میں اُتر کر اس انداز سے مشاعرہ پڑھے کے ہر ہر مصرعہ سامعین کے دل میں اُترتا جائے پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی نے بڑے کمال کا کلام پڑھ کر شامِ غزل کے شعراء سے بھرپور داد و تحسین حاصل کی۔ شام گئے تک مشاعرے کے بعد مل بیٹھ کر کھانے سے لطف اندوز ہوئے چونکہ اُن کا گھر جانا لازمی تھا گاڑی اور ڈرائیور پہلے ہی سے تیار تھا حاضرین شامِ غزل نے پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کو بڑے تپاک سے راولپنڈی کیلئے الوداع کیا۔

پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی سے میری دوسری ملاقات اُن کی رہائش گاہ پر ہوئی مری کیڈٹ کالج میں میرے پوتے فیضان شاہد کا داخلہ ٹیسٹ تھا پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی سے رابطہ کیا خوش قسمتی سے وہ گھر پر موجود تھے اور ہم مری سے واپسی پر شاہین فارمز اسمبلی ڈیم روڈ اسلام آباد میں اُن کی رہائش پر حاضر ہوئے تو آپ نے اپنے صاحبزادے کیساتھ پرتپاک استقبال کیا۔

ہم پختون قوم سے متعلق یہ مشہور ہے کہ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں اس لیے میں بھی اپنی پختونیت پر فخر کرتا ہوں کم از کم مہمان نوازی کے حوالے سے لیکن پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کی رہائش گاہ پر مجھے اپنی پختونیت کچھ شرمندہ شرمندہ سی لگی اس لیے کہ دسترخوان پر مختلف اقسام کے لوازمات اس قدر رکھے تھے کہ پریشان ہو گیا۔ سوچتا رہا کیا کھاؤں اور پہلے کیا کھاؤں پروفیسر صاحب اور اُن کے صاحبزادے نے تو حد کر دی تھی کھانے کے دوران پروفیسر صاحب کی خوش گفتاری بھی کمال کی تھی آسمان ادب کے ایسے دمکتے تاروں کے سامنے سوچ کر بولنا ہوتا ہے لیکن میں بولتا رہا۔ پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی بھی کبھی ہنستے اور کبھی مسکراتے لیکن ایک بات جو میں نے محسوس کی وہ میری ادبی خدمات کا اعتراف تھا اُس اعتراف کے احترام میں پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کی گفتگو میری حوصلہ افزائی تھی۔ گل بخشالوی کی ادبی خدمات پر ایم فل کی ڈگری بھی تو پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کے دستخط سے جاری ہوئی تھی اس سے بڑا اعزاز کسی قلمکار کا اور کیا ہو سکتا ہے کچھ دیر تک نہیں بلکہ کافی دیر تک پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کے دسترخوان پر کھانے اور ادب کے یادگار لمحوں میں رہے دل تو نہیں چاہتا تھا لیکن کھانے کے دسترخوان پر بہت کچھ وہ جو نہیں کھا سکے چھوڑ کر اجازت چاہی۔

پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی علم وادب کا خزانہ ہیں سیّد منور شاہ سے منور ہاشمی تک اور منور ہاشمی سے پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی تک کے سفر کے مسافر مجھ سے پانچ سال چھوٹے ہیں لیکن علمی اور ادبی قد میں میری سوچ سے بھی زیادہ بڑے ہیں ۔ساہیوال کا ڈومیسائل رکھنے والے پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی PHD ہیں اور وہ بھی اُردو ادب اور اقبالیات میں اور ہیں بھی HEC کے نامور PHD سپروائزر!!! شاعر بھی ہیں ماہر تعلیم بھی ہیں صحافی اور کالم نگار بھی ہیں ۔سترہ مختلف محکموں میں بحیثیت اُستاد وصحافت کا علم بھی ان کے دست مبارک میں ہے۔علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اور قومی نصاب کمیٹی کے ممبر جدہ میں عالمی اُردو مرکز کے صدر بھی رہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن ہونے کے علاوہ ملکی اور بین الاقوامی سطح کے مشاعروں اور سیمیناروں میں بڑے اعزاز واحترام سے شریک ہوتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی گزشتہ کل کو دور حاضر میں سوچتے ہیں قلم اُٹھاتے ہیں اور لکھتے ہیں ان کی تحریریں قومی اخبارات جرائد ورسائل میں شائع ہوتی ہیں اور آنیوالے کل کے لکھاری کیلئے تاریخ مرتب کرتے ہیں ۔HEC کے منظور شدہ جرائد میں معاشرتی زندگی کے ہر پہلو پر آپ کے تحقیقی مضامین آج بھی شائع ہو رہے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کے علمی اور ادبی کردار کے حسن اور تحقیقات کے اعتراف میں ایم فل کے چار مقالے لکھے جا چکے ہیں۔غرضیکہ پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی دور حاضر میں علم وادب کے وہ چراغ ہیں جس کی روشنی دنیائے اُردو ادب میں چار سو پھیلی ہوئی ہے ۔شخصی کردار وگفتار میں پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی دور حاضر کا وہ سرمایہ ہیں جن کے علمی اور ادبی قد پر ہم اہل قلم جس قدر بھی فخر کریں کر سکتے ہیں۔ یہ علم وادب میں ہمارے ذوق کی شان اور پہچان ہے ۔ پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں کہ وہ صرف شاعر نہیں بلکہ معاشرے کے زخموں کو نثر میں بھی لکھتے ہیں ۔کالم نگاری، تبصرہ نگاری اور صحافت کیلئے ضروری ہے کہ انسان کے وجود میں وہ دل ہو جو معاشرے کے درد کے احساس میں دھڑکتا ہو وہ آنکھ ہو جس میں دیکھنے کی جرأت ہو علم وادب کا ایسا کردار اپنے فکر وشعور میں معاشرے کا طواف کرتا ہے۔ جو دیکھتا ہے جو محسوس کرتا ہے اُس پر قلم اُٹھاتا ہے لیکن لکھتے وقت وہ یہ ضرور سوچتا ہے کہ اُس پر معاشرے کے صاحبان علم ودانش نظر رکھے ہوئے ہیں قاری لکھاری کو پڑھتا اور سوچتا ہے کہ لکھے ہوئے کالم اور تبصرے میں کالم نگار کا قلم آزاد ہے یا اُس پر لفافے کا اثر ہے ۔خوبصورت کالم اور جاندار تبصرہ وہ قلم کار لکھ سکتا ہے جو ہر خوف سے بالاتر اور بے باک ہو تحریر کا یہ حسن اور بے باکی پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کی شاعری اور نثر میں ہم دیکھ سکتے ہیں اس لیے کہ پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کی تحریروں میں اور شاعری میں ہمیں کہیں بھی ان کی خودستائی نظر نہیں آتی وہ ذاتی تشہیر کے لئے لکھتے ہیں اور نہ ہی اپنے خود پرست ذوق کی تسکین کیلئے لکھتے ہیں ۔اگر وہ لکھتے ہیں تو معاشرے کے درد لکھتے ہیں معاشرے کے زخم سوچتے ہیں اور ان زخموں پر مرہم تجویز بھی کرتے ہیں ۔وہ معاشرے میں ظلم وجبر پر تنقید کرتے ہیں لیکن یہ تنقید برائے تنقید نہیں ہوتی اس لیے کہ پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی اصلاحی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے۔

جہاں تک پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کی شاعری کا کمال ہے تو وہ بخوبی جانتے ہیں ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر

سکتے کہ شاعر بڑا احساس ہوتا ہے۔فکر وتخیل،جذبات اور احساسات،خوبصورت آرزوں،دلکش تمناؤں اور زندگی کے تجربات ومشاہدات ہی تو شاعر کی شاعری میں محسوس کیے جاتے ہیں ان ہی محسوسات میں ڈاکٹر صاحب بخوبی جانتے ہیں کہ صبح کی پرنور کرنیں،دوپہر کی تپتی دھوپ اور شام کے پھیلتے چھپتے سائے اور شب تاریک میں دلدوز چیخیں ایسے ماحول میں زندگی کیسی لگتی ہے۔محسوسات کے ایسے لمحوں میں جب قلم اُٹھاتے ہیں تو معاشرتی زندگی کو آئینہ دکھا دیا کرتے ہیں اور اس آئینے میں معاشرے کا ہر فرد اپنا چہرہ دیکھنے کیلئے ہاشمی صاحب کو اُن کی شاعری اور تحریروں میں پڑھتے ہیں اور انہیں اعزاز سے نوازتے ہیں۔ان کے صرف ایک شعر میں ان کی سوچ اور شخصیت کو پرکھیں:

روتے ہیں اس لئے کہ خوشی دشمنوں کو ہو

ہنستے ہیں دوستوں کو ہنسانے کے واسطے

پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کے فن اور شخصیت پر،بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن وہ صاحب قلم لکھ سکتا ہے جو اُن کی زندگی کے لمحے لمحے سے بخوبی واقف ہو۔میری تو پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی سے دو ملاقاتیں بالمشافہ ہوئیں ہیں ان دو ملاقاتوں میں جہاں تک میں نے آپ کو پڑھا،دیکھا اور سوچا پشتو میں سوچ کر اُردو میں قارئین ادب کیلئے لکھ دیا۔میری اس تحریری کے آئینے میں ممکن ہے پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کے شخصی کردار،فکر وفن کی کوئی ایک جھلک ہو البتہ خوش بخت ہیں وہ اہل دانش جنھوں نے آپ کو قریب سے دیکھا،سوچا اور پڑھا ایسی شخصیات کی صحبت میں علمی زندگی کے رنگ نکھرتے ہیں پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کے چہرے،آنکھوں،باتوں اور مسکراہٹوں میں زندگی کو سمجھنا ہی زندگی کا حسن ہے۔

میری تحریر تیری تصویر

معراج الدین منتظر

میری خوش قسمتی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ میں پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب کے شاگرد ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہوں۔ وہ لوگ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں جنہیں ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب جیسے شفیق اور علم دوست اساتذہ سے کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ میرے بیان میں اتنی سکت اتنی گہرائی تو نہیں ہے کہ اُن الفاظ میں ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب کا تعارف لکھوں کہ اگر حق ادا نہ بھی ہو تو میرا کچھ بھرم رہ جائے۔ ویسے بھی لکھنے والے ان کے حوالے سے پہلے ہی بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور مستقبل میں بھی جہاں بھی علم و ادب کی بات ہوگی ڈاکٹر صاحب کا ذکر سرفہرست ہوگا۔ میں ان کے بارے میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ انہیں منہ پر توصیفی کلمات سننے کی ضرورت کبھی نہیں رہی نہ ہی انہوں نے اپنے رتبہ کا رعب جما کر طلبا کو اپنے گن گانے پر مجبور کیا ہے، اب یہ اور بات کہ ان سے جو بھی ملتا ہے ان کا ہو جاتا ہے اور دل ان کی تعریف کرنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ ایک دفعہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے ان کا نام صرف ''لیکچرر منور ہاشمی'' لکھا۔ ایسے میں جب وہ نہ صرف یونیورسٹی ہذا (ناردرن یونیورسٹی نوشہرہ) کے آرٹس اور سوشل سائنسز فیکلٹی کے ڈین تھے بلکہ کئی تعلیمی، نشریاتی اور ادبی اداروں کی سرپرستی اور رہنمائی کر رہے تھے۔ مگر آپ نے کسی قسم کے غصے کے اظہار سے مکمل گریز کرتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ ''لوگوں کی ترقیاں ہوتی ہیں اور میرے شاگرد میری تنزلی پر تلے ہیں۔''

اس واقعہ میں جہاں اس طالب علم کی لاعلمی شامل تھی وہاں خود منور ہاشمی صاحب کی درویش منش اور سادگی پسند طبیعت بھی کارفرما تھی۔ جب ایک حوالے سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب کو 'سفیرِ علم و ادب'، 'محسن اردو' اور ''خادمِ اردو' جیسے خطابات سے نوازا جاچکا ہے۔ تو میں اکثر بیٹھ کر سوچتا کہ ان خطابات کا مطلب کیا ہے؟ اور کن خصوصیات کی بناء پر انھیں ان خطابات سے نوازا گیا ہے؟ جس کا جواب مجھے اس وقت ملا جب میں منور ہاشمی صاحب کا بیگ ہاتھ میں اٹھائے ان کے پیچھے پیچھے ان کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور میں نے باتوں باتوں میں ان سے کہا کہ سر کیا ہی اچھا ہو اگر یونیورسٹی یہاں ایک لفٹ لگا دے۔ فرمانے لگے:

> ''بیٹا میرے لیے یہ آسائشیں مانگنے سے بہتر یہ ہے کہ تُو میری اچھی صحت کی دعا مانگ، مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے ابھی اردو زبان اور ادب کی اور خدمت کرنا چاہتا ہوں اور یہ تبھی ممکن ہے جب اچھی صحت ہو اور زندگی ہو۔''

اس دن مجھے معلوم ہوا کہ جو شخص باقی ماندہ زندگی کی دعا بھی صرف اور صرف ادب کی خدمت کے لیے مانگ رہا ہے۔ اس نے پہلے سے رب کی عطاء کردہ زندگی میں ادب کی کتنی خدمت کی ہوگی!

ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب مجھ جیسے بے شمار نو آموز شعرا کی رہنمائی کرتے ہیں۔ان کی رہنمائی کا خاص انداز یہ ہے کہ وہ طالب علم پر اس کی ذہنی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے اور نہ بات بے بات نقص نکالتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ طالب علم کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کر کے اسے پٹڑی پہ ڈال دینا چاہیے جہاں وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی غلطیوں سے خود ہی سیکھ کر اپنے آپ میں نکھار پیدا کرتا ہے اور اس طرح فن کی تکمیل اور فنکار کے کامل ہونے کا عمل جاری رہتا ہے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب فطرت سے محبت کرنے والے اور محبت بانٹنے والے اور ایک ایسے عالی ظرف انسان ہیں۔جن سے غرور اور تکبر خود کنارا کرتا ہے۔اسی وجہ سے علم و ادب کے قدر دان ان کی قدر دانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے ہیں آپ مشاعروں اور ادبی حلقوں کی رونق گردانے جاتے ہیں۔ جہاں لوگ آپ سے ملنا باعث فخر اور آپ کو سننا باعث مسرت سمجھتے ہیں۔منور ہاشمی صاحب کو اپنے ہر طالب علم میں اپنی اولاد کا چہرہ نظر آتا ہے۔اور زندگی کے ہر موڑ پر ان کی رہنمائی کرنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔خود یہ ناچیز بھی ان کی رہنمائی سے دو چار جملے لکھنے کے قابل ہوا ہے اور آج ان عقیدت اور محبت نے اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ان کے بارے میں لکھنے پر مجبور کیا۔

ہمیں نکھارا جو تُو نے تو ہم نکھر بھی گئے
اور اس طرح سے سنوارا کہ ہم سنور بھی گئے
تری دعا نے کیا ہر جگہ تعاقب ہے
''جہاں جہاں سے بھی گزرے، جدھر جدھر بھی گئے''

پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب کے پسندیدہ شعرا ڈاکٹر علامہ محمد اقبال اور میر تقی میر ہیں۔اپنی کتاب فیضِ اقبال میں آپ علامہ محمد اقبال کے حوالے سے لکھتے ہیں۔''اقبال نے شعر نہیں لکھے فیصلے لکھے ہیں، یا پھر پیشن گوئیاں کی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ درست ثابت ہو رہی ہیں۔''

دوسری طرف میر تقی میر کی بات کریں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ خود ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب نے ان کی شاعری سے گہرا اثر قبول کیا ہے کیونکہ آپ کی شاعری میں بھی سہل ممتنع کی وہی صورت نظر آتی ہے۔

علم و ادب کا یہ وسیع اور گہرا سمندر ہمیں ایک مدت سے میسر ہے اور کچھ اس قدر میسر ہے کہ لوگ صرف آرزو ہی کر سکتے ہیں۔تاہم سمندر پاس ہو تو پیاس کم ہی لگتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ دور دراز سے تشنگانِ ادب اس سمندر کا رخ کرتے ہیں اور ہم پاس رہ کر بھی تشنہ لب ہیں۔ یقیناً آنے والے وقتوں میں اہل علم اور اہل قلم حضرات کو یہ افسوس ہوگا کہ انہیں پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب کا دور میسر آتا اور ہمیں شاید یہ صدمہ ہو کہ ہم نے اس دور منور سے مزید استفادہ کیا ہوتا۔

ہاشمی صاحب

سجاد حسین سرمد

جامعہ نادرن میں پہلی کلاس ہاشمی صاحب نے لی تھی اور میں تقریباً دس گیارہ سال بعد بطور طالب علم کمرۂ جماعت میں بیٹھا تو کچھ دیر تک دل میں ہول اُٹھتے رہے، سوچتا رہا کہ نجانے سال بھر کیسے گزرے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے جس محبت سے تدریس کا آغاز کیا، اگر اُن کی جگہ پہلے دن کسی اور سے واسطہ پڑتا تو یقیناً پڑھائی کا ارادہ ترک کر دیتا۔ اسی دن میں نے اپنی کتاب ''نشاطِ سرمدی'' اُن کی خدمت میں پیش کر دی تھی، انھوں نے ورق گردانی کے بعد حوصلہ افزائی کی اور غالباً اگلے دن مجھے بطور خاکہ نگار دیگر کلاس فیلوز سے متعارف کرانے کے بعد کہنے لگے ''اس کا جس شخص سے واسطہ پڑتا ہے، اس کا خاکہ ضرور لکھتا ہے۔'' اسی نشست میں محمود ناصر اور مجھ سے غزل بھی سنی گئی تھی، بعد ازاں یونیورسٹی میں اُن کی سرپرستی میں قائم شدہ ادبی تنظیم ''بزمِ عشاقِ اُردو'' کے ادبی اجلاسوں میں بھی کئی بار کلام سنانے کا موقع میسر آیا۔

ہاشمی صاحب محفل کو زعفران زار بنانے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، چہرے پر سنجیدگی اور گفتگو کے دوران میں کبھی کبھار مزاح کی ایسی پھلجھڑی کہ خود بھی ہنستے ہیں اور مخاطب کو بھی ضبط کا چارہ نہیں رہتا۔ بظاہر سنجیدگی اور مزاح کا امتزاج ایک ہی شخص میں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے اور شاید اس نوعیت کا اختلاط جچتا بھی کم ہی ہے لیکن ہاشمی صاحب اپنی باوقار اور بارعب شخصیت کے باوصف اِن معصومانہ اور دلربانہ اداؤں کے ساتھ خوب نبھا کر رہے ہیں۔

میں تدریس کے معاملہ میں لفظ بہ لفظ پڑھانے اور لکھوانے کا سخت مخالف ہوں۔ سکول کی سطح پر تو شاید پڑھانے اور لکھوانے کا عمل کارآمد ہو نیز کالج میں بھی کسی حد تک بچوں سے املا کرانا مفید نتائج برآمد کرتا ہے کیوں کہ گیارہویں بارہویں کے بچے اتنی استعدادِ علمی نہیں رکھتے کہ پینتالیس منٹ کے لیکچر کے بعد کوئی نتیجہ اخذ کر سکیں۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح پر کورس ورک کے دوران سکالرز کے سامنے گھنٹہ بھر گفتگو کرنا اور سانس تک نہ لینا (کہ کہیں کوئی منچلا سوال نہ داغ دے) انتہائی نقصان دہ عمل ہے۔ اس سٹیج پر پہنچ کر بچوں کے اندر جستجو اور شوق پیدا کرنا پڑتا ہے، انھیں اُکسانا پڑتا ہے کہ وہ سوال کریں، خود سے کسی موضوع پر بات کریں، انھیں مبہم اور ناقابلِ فہم معلومات دینا پڑتی ہیں، جن سے وہ اطمینان نہ پا کر خود ہی تحقیق کی وادیوں میں اُتر جائیں۔ موضوع کے بارے میں مکمل آگاہی فراہم کر دینا سکالرز کو سہل انگار بنا دیتا ہے۔ ہاشمی صاحب تدریس کے انھی اصولوں کو اپناتے ہیں۔ موضوع لیا، اس کا سرسری تعارف کرایا، بچوں کو سوالات پر اُکسانا شروع کر دیا، اُن سے پوچھنا شروع کر دیا جیسے خود لاعلم ہیں اور بچے بزعمِ خود بولتے جا رہے ہیں۔ رطب ویابس کے انبار میں ایسی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جو زیرِ نظر موضوع کے پوشیدہ گوشوں کو منور کر دیتی ہیں۔ یوں موضوع کے بارے میں طلبا کا بے ساختہ موقف سامنے آتا ہے جو کسی ناقد کے تیشۂ قلم سے تراشا ہوا نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب لگے بندھے اصولوں کا سہارا لے کر بچوں کو بے

ساکھیوں کا عادی نہیں بناتے۔

ڈاکٹر صاحب محبِ وطن شہری ہیں۔ پاکستان کے دور افتادہ اور پسماندہ علاقوں میں گھومنے پھرنے کا شوق رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کوئی طالب علم یا چاہنے والا انھیں مشاعرے کی دعوت دے تو نذرانے کا حساب کتاب کرنے کے بجائے فوراً دعوت قبول کر لیتے ہیں۔ بلانے والے کی علمی استعداد اور معاشرتی حیثیت نہیں دیکھتے۔ انھیں پاکستان کے ہر شہری سے محبت ہے لہٰذا محافل میں لوگوں میں گھل مل جاتے ہیں۔ اپنے سے کم علم لوگوں کی گفتگو بھی دھیان سے سنتے ہیں اور اُن کی بھولی بھالی باتوں پر اُکتانے اور تنقید کرنے کے بجائے مسکرا کر ٹال دیتے ہیں۔ دھیمے لہجے اور فی البدیہہ گفتگو کے سہارے اپنے چاہنے والوں کو اکتاہٹ کا شکار نہیں ہونے دیتے۔

ایم فل کورس کے دوران میں نے کورس سے متعلق (یا غیر متعلق) جتنے بھی سوالات کیے، ہر ایک کا تشفی بخش جواب ملا اور معلومات میں اضافہ ہوا۔ کوئی سوال پوچھے تو اُن پر سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور بلا تمہید بات کا آغاز کر دیتے ہیں اور تھوڑی دیر میں ڈھیروں معلومات سے طلبا کا دامنِ طلب بھر دیتے ہیں۔ میں نے کچھ عرصہ کالج میں ریگولر طالب علم کی حیثیت سے پڑھا ہے، مدت سے اساتذۂ فن کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے۔ نذر صابری رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مجھے جس شخص نے اپنے علم و فن سے متاثر کیا، وہ ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب ہیں۔ نذر صابریؒ کی صحبتِ فیض بار میں تین چار سال حاضرِ خدمت رہنے کا موقع میسر رہا۔ گفتگو کی جسارت نہیں ہوتی تھی، وہ ایسے لوگوں میں سے تھے جن کی خاموشی گہر ہائے تابدار کی چمک سے دلوں کو علمی روشنی سے منور کیا کرتی تھی، اُن کے بعد میں یہی سمجھتا تھا کہ اب کتابوں سے ہی کچھ ملے گا لیکن لگتا ہے قدرت نے مجھے جامعہ نار درن اسی لیے بھیجا کہ میں اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کر سکوں:

ع:　ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

شخصیت اور فن

تخلیق کی منور راہوں کا راہی

ڈاکٹر نثار ترابی

حالی وہ پہلے قومی شاعر و ادیب ہیں جن کے ہاں نثر و شعر دونوں سطح پر افادی نقطہ نظر اور مقصدی عناصر کی آمیزش نے تخلیق کی منور سمتوں کا ایسا رخ متعین کیا کہ جس کی روشنی آنے والے ہر عہد اپنے اثرات وثمرات واضح کرتی چلی گئی تخلیق کے اس مثبت انداز نظر نے تقلیدی روش ترک کرتے ہوئے اصلاحی جذبے کو اپنالیا۔ اس اصلاحی جذبے کی بدولت مردہ دلوں میں زندگی کی نئی روح اتر آئی، سوئی ہوئی قوم جاگ اٹھی۔ قومی شاعری کی یہ وہی بنیاد تھی جس پر اقبال جیسے بڑے قومی شاعر نے اپنی شاعری کا قصر تعمیر کیا۔ نوائے اقبال بلند ہوئی تو قوم ایک نئے عزم اور ایک نئے حوصلے کے ساتھ عصر کے جدید تر تقاضوں سے ہم آواز ہونے لگی، اسے شعور زندگی عطا ہو گیا، اسے قلب ونظر کی تابندگی مل گئی۔ اب تخلیق کاروں نے یہ واضح طور پر جان لیا کہ تخلیق کے منور راستے پر چل کر ہی ایک بہتر بلکہ مثالی معاشرے کی تعمیر کی جاسکتی ہے۔ غزل گو شعراء کا ایک بڑا کارواں، قیام پاکستان کے بعد ایک روشن انداز نظر کی نمائندگی کرتے ہوئے حرف صداقت کے چراغ جلاتا رہا۔ کئی ادوار آئے اور چلے گئے، یہاں تک کہ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں حرمتِ فکر کا یہ کارواں، کلاسیکی شعری قدروں کی پاسداری میں رہتے ہوئے جدید شعری حقائق کا علمبردار بن کر ابھرا، اس عرصے میں جو نام، غزل کے ایوان سے گونجے اور اپنی انفرادیت کے نقش اجاگر کرتے چلے گئے، ان میں ایک منور نام، ڈاکٹر منور ہاشمی کا بھی ہے۔ اپنے نام اور تخلص کی طرح یہ اسمِ بامسمٰی شاعر تخلیق کی انہی منور راہوں کا راہی ہے جو ادب کو انسان دوست قدروں کا ترجمان بناتی ہیں۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کے ادبی خاندان پر ایک نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد گرامی حضرت مجروح کلہروی ایک ایسے بزرگ شاعر تھے جنہوں نے کلاسیکی شعری عناصر سے مزین ایسا ادبی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے جس میں فکری گہرائی، فنی پختگی اور استادانہ گرفت کے سبھی قابلِ لحاظ تخلیقی امتیاز شامل ہیں۔ حضرت مجروح کلہروی (مرحوم) کے شعری مجموعے ''رقص انا'' میں موجود شعری تخلیقات پر بات کرتے ہوئے سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں۔

> ''حضرت مجروح کلہروی کے خاندان کو میں اُردو ادب کا ''قبیلہ بنو ہاشم'' کہتا ہوں اور میرے لیے یہ بات باعث فخر و اطمینان ہے کہ اس قبیلے کی علمی و ادبی عظمتوں سے آگاہ ہوں۔ اس خاندان میں ہر زبان میں شاعری ہوئی، عربی، فارسی، اردو اور پنجابی میں معیاری شاعری دیکھنے کو ملی۔ فقر و درویشی اس خاندان کا طرۂ امتیاز ہے۔ مجروح کلہروی پاکستانی شعراء کی اس نسل کی گراں قدر نشانی ہیں'' کہ ''اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں'' (۱)

حضرت مجروح کلہروی کا انتقال ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء میں ہوا۔ آپ نے عربی، فارسی، اُردو اور پنجابی زبانوں میں شاعری کی۔ عمر عزیز کی آخری منزل تک تخلیق شعر میں سرگرم رہے۔ راقم الحروف کو بھی راول پنڈی، اسلام آباد اور اس کے

آس پاس سجائی جانے والی ایسی متعدد شعری نشستوں میں شریک ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے،جن میں آپ عموماً صدرِ مشاعرہ کی حیثیت سے مدعو کیے جاتے تھے۔ یہ ان کی اعلیٰ ادبی تربیت کا فیضان ہے کہ آج ان کے دو صاحبزادے ڈاکٹر منور ہاشمی اور غضنفر ہاشمی اردو شعری ادب میں کسی رسمی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس خاندان کے دیگر تین افراد، نیر ہاشمی، نسیم احمد نسیم اور رفیق ہاشمی بھی جانے پہچانے شاعر ہیں۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی سے اسلام آباد میں مقیم اس ہاشمی ادبی خانوادے سے میرے نیازمندانہ مراسم کا آغاز ہوا جو الحمدللہ اب تک قائم و دائم ہے۔ غضنفر ہاشمی اور سید نیر ظفیر تو میرے ہم عصر شعراء میں سے ہیں مگر ڈاکٹر منور ہاشمی ہمارے عہد کے ان سینئر تخلیق کاروں میں سے ہیں جن کی علمی و فنی رہنمائی نے غضنفر ہاشمی، نیر ظفیر اور مجھ سمیت راول ولیس کے متعدد نئی نسل کے شعراء کی ابتدائی ادبی تربیت میں ایک شفیق استاد کا سا فریضہ انجام دیا ہے۔

۱۹۸۰ء کی دہائی کے ابتدائی چند برسوں سے ریڈیو پاکستان راول پنڈی میں اپنی ملازمتی مدت کے دوران وہ جن متعدد ادبی پروگراموں کے پروڈیوسر رہے۔ ان میں نوائے سروش، نگارش، جواں سال، عزمِ جواں اور ''سٹوڈنٹ میگزین'' خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی مہربان سرپرستی میں متذکرہ پروگراموں کی نظامت میرے حصے میں آتی تھی اور یوں میرے شعری اظہارات کو اظہار نمو کی نئی سمت میسر آتی گئی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ نومبر ۱۹۸۹ء کی ایک دوپہر کو ریڈیو پاکستان راول پنڈی میں نامور شاعر جناب انور مسعود کی زیر صدارت ایک قومی مشاعرے کی ریکارڈنگ کے بعد رسمی ادبی گفتگو کے دوران ان کی اور جناب انور مسعود کی مشترکہ مشاورت سے میں نے آئندہ سے نثار احمد نثار کے بجائے نثار ترابی کے نام سے لکھنے کا فیصلہ کیا۔ ان دنوں اختر عثمان، اختر علی اور غضنفر ہاشمی، غضنفر شاہ کے قلمی نام سے ریڈیو کے مشاعروں میں میرے ساتھ طالب علم شاعر کی حیثیت سے شریک ہوتے رہے ہیں۔

مجھے ڈاکٹر منور ہاشمی کے ادبی شعری سفر کو بنیاد بناتے ہوئے ان کی شاعری پر گفتگو کرنا مقصود تھی مگر تمہیدی گفتگو کا سلسلہ قدرے دراز ہوتا چلا گیا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ جب تک ہم کسی شاعر کے ادبی خاندانی پس منظر کا اجمالی جائزہ نہ لیں اُس وقت تک ہمیں کسی شاعر کے شاعرانہ سفر کے تفہیمی زاویوں سے اس طرح آگاہی حاصل نہیں ہو سکتی کہ ہم اس شاعر کے شعری مزاج کو کلی طور پر سمجھ سکیں۔ ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر ایک ہمہ جہت ادبی تخلیق کار ہیں اور ان کی ادبی فعالیت کی سمتیں شعر و نثر کی متعدد اصناف کو اپنا حوالہ بناتی ہیں۔

مجھے چونکہ کلامِ منور ہاشمی پر بات کرنی ہے لہذا ان کے اب تک شائع ہونے والے چار غزلیہ اور ایک نعتیہ مجموعے میں شامل شاعری ہی زیرِ نظر مضمون کا اختصاص ہے۔ ان کے شعری مجموعوں کے مطالعے سے کھلتا ہے کہ ان کی غزل کلاسیکی شعری روایت کی اس سمت اپنا وجود معانی کھولتی ہے جہاں خرد افروزی کے چراغ جلتے ہیں۔ جہاں خیالات محض لفظی گورکھ دھندہ بن کر ہی نہیں رہ جاتے بلکہ آگے بڑھ کر اور پھیل کر گہرے عصری شعور کا درو‌ا کرتے ہیں۔ رعایت لفظی کی تہہ در تہہ معنی

خیز جاگتی صداقتوں کی امین ان کی غزلیہ لے اس حوالے سے اردو شعری ادب کی مثال بن جانے والی آواز مومن خان مومن کی سی استادانہ ہنر وری کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ اس موضوعاتی فنی تناظر میں اگر یہ کہا جائے کہ مومن کے بعد جن چند غزل گو شعراء نے تسلسل اور تخلیقی تازگی کے ساتھ اس طرزِ اظہار و اسلوب کی نمائندگی کا حق ادا کیا ہے ان میں ایک نمایاں و اہم نام ڈاکٹر منور ہاشمی کا ہے، تو بے جانہ ہوگا۔ ان کے ہاں اپنے نام کی لفظی اور معنوی رعایتوں کے اعتبار سے اظہار کے قرینے یوں تو درجنوں شعری مقامات پر واشگاف ہوئے ہیں تاہم اس حوالے سے چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

زمانے بھر کو خبر ہے کہ میں منور ہوں
مرا وجود ضروری ہے روشنی کے لیے

☆☆☆

شہر کی گلیاں منور روشنی سے بھر گئیں
آج شب مہتاب پھر بالائے بام آیا کوئی

☆☆☆

تڑپ رہا ہوں اُسی دن سے روشنی کے لیے
کہ جب سے نام منور کسی نے رکھا ہے

☆☆☆

مرے نام سے ہیں روشن سبھی راستے وفا کے
مرا نام ہے منور، مرا کام روشنی ہے

☆☆☆

ہم پہ اپنے نام کی نسبت منور فرض تھی
اس لیے روشن وفا کی رہ گزر کرتے رہے

لفظ کے تخلیقی استعمال کی خوبی کے باوصف اسلوب کی سطح پر اپنے نام کی معنوی رعایت کے فنی مظاہر کلامِ منور میں نعتیہ مضامین کی ترجمانی کے دوران بھی اپنی چھب دکھاتے ہیں۔ جہاں وہ ردیف کی معنوی حیثیت کا لحاظ رکھتے ہیں وہاں کسی آفاقی یا ارضی صداقت کا شعورانہ ادراک خیال کے مجموعی تسلسل سے اس طرح ہم رشتہ کرتے ہیں کہ ان کے تخلص (جو ان کا نام بھی ہے) کے فکری زاویے روشن ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس نوع کی فنی خوبی کے یہ زاویے ملاحظہ ہوں:

اسم رسولؐ پاک سے ہے روشنی تمام
اس سے بڑا چراغ منور کہیں نہیں

☆☆☆

پاکؐ نعلین سے مس ہو کے منور ٹھہرے
آپ نے کیسا شرف خاک کے ذروں کو دیا

☆☆☆

دل منور جو ہوا عشقِ محمدؐ کے طفیل
لکھنے والا اسے کعبہ و حرم لکھتا ہے

☆☆☆

نعتِ محبوبؐ منور کہے جائے مجھ کو
میں جدھر جاؤں مرے ساتھ اجالے جائیں

سید ضمیر جعفری بجا طور پر رقم طراز ہیں:

''منور ہاشمی کو میں نے نئی رتوں کے ذائقے سے آباد پایا۔ وہ دھوپ سے چھاؤں کشید کرتا ہے۔ وہ زندگی اور فن دونوں سے مخلص ہے۔ وہ اپنی آواز میں شعر کہتا ہے''(۲)

یہ جو اپنی آواز میں شعر کہنا ہے یہ دراصل شاعری یا شعراء کے ہجوم میں اپنے آپ کو پالینے، اپنی پہچان کرا لینے کی فتح یابی کا اعلان نامہ ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے جب کوئی فن کار اپنے فنی وصف میں روایت سے لاتعلق بھی نہ رہے اور معاصر ادبی عہد کا نباض بھی ہو۔ اُسے کلاسیکی شعری سانچوں میں ڈھل جانے کی ہنرمندی بھی آتی ہو اور وہ جدیدیت کے نو بہ نو بدلتے سنورتے تقاضوں سے بھی گہری واقفیت رکھتا ہو۔ اُس کے ہاں موضوعاتی رنگا رنگی بھی ہو اور اظہار کی سطح پر فکر و خیال کا تنوع بھی ہو۔ وہ حسنِ خیال کی پیش کاری میں ایک بانکپن اور اسلوب کے برتاؤ میں ایک نیا پن رکھتا ہو۔ اب ان اوصاف کی جھلک ان اشعار میں ملاحظہ کیجیے اور یہ فیصلہ کیجیے کہ ہمارا دعویٰ کہاں تک درست ہے۔

مرے دل کی دھڑکنوں کو مرے ضبطِ غم نے روکا
مرا درد وہ نہیں ہے مری آنکھ سے جو چھلکے
میں پلٹ پلٹ کے دیکھوں کہ صدا ہے کوئی پیچھے
کبھی ہر قدم پہ رک کے، کبھی تیز تیز چل کے

☆☆☆

سب حسرتوں کو خواب کا ملبوس مل گیا
سب خواب میرے شعر کے پیکر میں ڈھل گئے

☆☆☆

ہر ایک دوست کے سینے میں وہ دھڑکتا ہو
تمہارے دل کی منوّر غضب کی مرضی ہے

☆☆☆

روشنی چھن کے ترے رخ کی نہ مجھ تک پہنچے
ایک دیوار ہوئی یہ کوئی آنچل نہ ہوا

اس آخری شعر میں لفظ ''آنچل'' کا استعمال جس فنی جمال آرائی کے ساتھ استعاراتی سطح پر برتا گیا ہے اس کی اگر اس سے قبل کوئی مثال تلاش کرنی ہو تو وہ صرف مجاز لکھنوی کے ہاں ملے گی۔ بے ساختگی اظہار ان کے کلام کی ایک ایسی خوبی ہے جو ان کے ہر شعر سے جھلکتی ہے۔ اس خوبی پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم فرخی کہتے ہیں:

> ''منور ہاشمی کا مجموعہ کلام ''بے ساختہ'' پڑھنے کے بعد صحیح معنوں میں لفظ بے ساختہ کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ آمد اور بے ساختگی میرے نزدیک ہم معنی الفاظ ہیں اور یہ مجموعہ اوّل تا آخر اس کا عمدہ نمونہ ہے مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی دیانت دار نقادِ غزل اور تذکرہ نگار منور ہاشمی اور اس کی غزل کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔'' (۳)

اظہار کی اس بے ساختگی میں وہ سادگی اور پرکاری ہے جس میں منور راستوں کی جستجو پنہاں ہے۔ ڈاکٹر عطش درانی نے کلام منور پر بات کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

> ''وہ شاعری میں ایک مثالی شخص کو تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے جس میں انسان کامل کی تمام صفات موجود ہوں۔ یہ کامل شخص اس کی اپنی انائے منفعل کا مثالیہ ہے۔ اسی کو وہ محبوب سمجھتا ہے اور اسی کے آئینے میں خود کو اس کا پرتو خیال کرتا ہے۔ میؔر سے ناصر کاظؔمی تک سادگی اور پرکاری کے جتنے بھی پہلو تلاش کر لیے جائیں ان میں آئینۂ ذات اور پرتوِ ذات کا یہ پہلو مشترک نظر آئے گا۔'' (۴)

یہ جو ڈاکٹر عطش درانی صاحب نے اپنے اظہاریے میں میؔر اور ناصر کاظؔمی کے کلام میں پائی جانے والی سادگی اور پرکاری کے پس منظری حوالے سے کلامِ منور کے ہاں آئینۂ ذات اور پرتوِ ذات کی طرف اشارہ کیا ہے تو اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ منور صاحب کو بھی میر اور ناصر کاظمی کی طرح عزت سادات کا ہمیشہ خیال رہا شاید اسی سبب سے اس طرح کی شاعرانہ صدا ابھری:

عشق بھی ہم نے کیا تو اک عبادت کی طرح
قریۂ جاں میں بہ چشمِ باوضو پھرتے رہے

دیکھیے تصورِ عشق کس منزہ پہلو کا غرور لیے ہوئے ہے۔ میؔر، ناصر کاظمی اور ڈاکٹر منور ہاشمی تینوں شعراء کا نسبی تعلق خانوادۂ سادات سے ہے۔ اگر میر یہ کہتے ہیں کہ:

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

تو دوسری جانب ڈاکٹر منور ہاشمی میرؔ کی پیروی میں اس تصورِ عشق کی روایت کا شعورانہ ادراک رکھتے ہوئے اسے ایک نئی موضوعاتی سمت عطا کرتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں:

میرؔ سے لے کر منورؔ تک فقط رسوائیاں
عشق رکھتا ہے عداوت کس قدر سادات سے

(نیند پوری نہ ہوئی، ص ۶۱)

خدائے سخن، میرؔ سے ڈاکٹر منور ہاشمی کی شاعرانہ عقیدت اس درجے پر ہے کہ انہوں نے اپنے شعری مجموعے ''نیند پوری نہ ہوئی'' کا انتساب میرؔ کی شاعرانہ عظمتوں کے نام کیا ہے۔ رہی بات ناصر کاظمی کی تو وہ جو سادگی اور پرکاری کا حسن ہے وہ سہلِ ممتنع کی روشنی پا کر منورؔ کی منور شاعری میں کس طرح ضو بار ہوا اس کی دو مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

غم کا سیلِ بلا نہ لے جائے
زندگی کو فنا نہ لے جائے
گوشۂ عافیت ہے گمنامی
کوئی میرا پتا نہ لے جائے

ان کا شعری مجموعہ ''نیند پوری نہ ہوئی'' اپنی کئی فکری پرتیں رکھتا ہے۔ نیند پوری ہو جائے تو خواب کے امکانات جاگ اٹھتے ہیں اور نیند پوری نہ ہو تو خوابوں کا تصور ادھورا رہ جاتا ہے۔ یہ ادھوری مجبوری خواب ہی درحقیقت اصل خواب کا استعارہ ہے۔ یوں بھی اگر حقیقت کی آنکھ سے دیکھیں تو غزل کی شاعری اپنی اصل میں ادھورے پن کا نوحہ ہی تو ہے۔ اگر خواب مکمل ہو جائے تو کہانی مکمل ہو جاتی ہے جبکہ ادھوری خواہش اور ادھورے خواب ہی تو جینے کی نئی امنگ پیدا کرتے ہیں۔ جہاں خواب تکمیل پا جائے وہاں دید وادید کی منزل رک جاتی ہے اور ایک سچا شاعر اگر کسی منزل پر رکنے کا عزم کر لے تو اس کے آدرش کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ انسانی قدروں کا احساس جگانے والی شاعری کا وصف یہی ہے کہ وہ راہِ محبت میں کسی مقام پر بھی مستقل قیام نہیں کرتا بلکہ وہ منور راہوں کا راہی بن کر سبک خرامی سے جادۂ منزل کو اعتبار عطا کرتے ہوئے مسلسل آگے بڑھتا رہتا ہے کہ اس سے اس کے انسان دوست تخلیقی سفر کی پہچان باقی رہتی ہے۔

نہ کوئی راہ نہ منزل مگر رواں رہنا
ہمارا بخت سفر کے سوا کچھ اور نہیں

(نیند پوری نہ ہوئی، ص ۱۲۶)

حواشی

(۱) سید ضمیر جعفری، ''مشک آنست کہ خود ببوید'' مشمولہ ''رقص انا'' (شعری مجموعہ) مجروح کلہروی، راول پنڈی، زیرو پوائنٹ پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۹۔

(۲) سید ضمیر جعفری، اندرونی سرورق، مشمولہ ''بے ساختہ'' (شعری مجموعہ)، ڈاکٹر منور ہاشمی، اسلام آباد، اکبر الہ آبادی اکیڈمی، ۱۹۹۵ء۔

(۳) ڈاکٹر اسلم فرخی، مشمولہ ماہنامہ ''آہنگ''، کراچی، پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن، اپریل ۱۹۹۶ء، ص ۳۶۔

(۴) ڈاکٹر عطش درانی، مشمولہ سہ ماہی ''انشا''، حیدرآباد، (مدیر) عتیق جیلانی، جون ۱۹۹۷ء، ص ۱۳۔

(۵) میر تقی میر، مشمولہ کلیات میر، (مرتب) ظل عباس عباسی، دہلی ترقی اردو بیورو، ۱۹۶۵ء، ص ۸۲۸۔

حوالہ جات

(۱) بے ساختہ (شعری مجموعہ)، ڈاکٹر منور ہاشمی، اسلام آباد، اکبر الہ آبادی اکیڈمی، ۱۹۹۵ء۔

(۲) ''نیند پوری نہ ہوئی''، ڈاکٹر منور ہاشمی، نئی دہلی۔۲، ایم آر آفسیٹ پرنٹرز، ۲۰۰۵ء۔

(۳) ''لوح بھی تو قلم بھی تو'' (نعتیہ مجموعہ)، ڈاکٹر منور ہاشمی، اسلام آباد، استعارہ، ۱۹۹۸ء۔

شاعرِ روشن ضمیر

ڈاکٹر مقصود جعفری

ڈاکٹر منور ہاشمی، چہرۂ متبسم، شعرِ مترنم، اشک بہ طلاطم اور دلِ پُر از ترحم کے ماہِ منیر اور شعاعِ مستنیر ہیں۔ با اخلاق ، با کردار، باوقار، صاحبِ فکر و دانش، مخلص و مہربان شخصیت ہیں۔ ایک اچھا انسان ہی اچھا شاعر ہو سکتا ہے۔ مولانا رومی نے یونانی فلسفی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ سورج کی روشنی میں چراغ جلا کر شہر میں گھوم رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ انسان کی تلاش میں سرگرداں ہوں لیکن انسان سورج کی روشنی میں بھی دکھائی نہیں دیتا لہٰذا گھر کے چراغ کی روشنی بھی سورج کی روشنی بھی شامل کر دی ہے۔ ''انسانم آرزوست'' فلسفیوں اور شاعروں کی تمنا رہی ہے۔ آدمی تو عام ہیں، انسان خال خال ہیں:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ڈاکٹر منور ہاشمی اس عہدِ ناسپاس اور دنیائے دون و منافقت میں ایک سچا اور کھرا انسان ہے۔ چند سال قبل انھوں نے اپنا شعری مجموعہ بعنوان ''غزل اے غزل'' مرحمت فرمایا تھا۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ روزنامہ پاکستان کے مدیر بھی رہے ہیں۔ بے باک صحافی، دانشور اور ادبی نقاد ہیں۔ اقبالیات کے ماہر ہیں۔ وفاقی اُردو یونیورسٹی میں پروفیسر رہ چکے ہیں۔ ان کے والدِ گرامی بھی صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کے برادرِ خورد غضنفر ہاشمی نامور شاعر ہیں اور آج کل امریکہ میں شمعِ اُردو جلائے بیٹھے ہیں گویا ''ہمہ خانہ آفتاب است'' ڈاکٹر منور ہاشمی کی شاعری میں کلاسیکل رنگ و آہنگ کے ساتھ ساتھ جدید عصری تقاضوں کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ اُن کا فارسی اور عربی زبان و ادبیات کا مطالعہ اُن کی اُردو شاعری میں نمایاں ہے۔ زبان کی پختگی، سلاست و فصاحت اور فکر کی گہرائی اُن کی شاعری کا خاصہ ہے۔ وہ میر، غالب، اقبال اور فیض کی خوب صورت زبان کے وارث ہیں۔ شاعر مر جاتا ہے، شاعری زندہ رہتی ہے۔ بعض نام و نمود کے پرستاروں اور حاکمانِ وقت کے حاشیہ برداروں کی شاعری اُن کے مرنے کے ساتھ ہی مر جاتی ہے۔ منور ہاشمی زندہ و تابندہ شاعر ہیں۔ بقول حافظ شیرازی:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش، زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

منور ہاشمی: فن اور شخصیت

ڈاکٹر حسین احمد پراچہ

شہرت بھی عجب شے ہے۔ یہ بعض اوقات اُن لوگوں کے پیچھے بھاگتی ہے جو اس سے بھاگتے ہیں۔ منور ہاشمی پاکستان میں صفِ اول کے شاعر، ممتاز براڈ کاسٹر، صحافی اور ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ ملکی شہرت سے بھاگ کر گوشۂ گمنامی کی تلاش میں ''جدہ'' آئے۔ وہ گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر تصنیف وتالیف کے ذریعے گیسوئے اُردو سنوارنا چاہتے تھے مگر شہرت نے یہاں بھی اُن کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ انھوں نے گیسوئے اُردو سنوارنے کا کام تو بحسن وخوبی انجام دیا مگر اس طرح کہ یہاں اُن کی مشاطگی کا نظارہ ایک عالم کر رہا تھا۔ وہ ملکی شہرت سے بھاگ کر آئے تھے مگر یہاں اللہ نے انھیں عالمی شہرت عطا کر دی۔ وہ اپنی اور اُردو مرکز سعودی عرب کے صدر کی حیثیت سے نہ صرف برصغیر پاک وہند بلکہ وہاں وہاں پہچانے جاتے ہیں جہاں جہاں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ وہ عصرِ حاضر میں اس قافلے کے حدی خوان ہیں جس قافلے کے سالار بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم تھے اور اب تو صورتِ حال بقول شاعر یہ ہے کہ:

ع: وہ بھی دیکھے گا تجھے جس نے تجھے دیکھا نہیں

منور ہاشمی ابھی پانچویں جماعت میں تھے کہ شعر گوئی کا آغاز ہو گیا۔ تب سے لے کر اب تک وہ تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کر چکے ہیں اور اہلِ نظر اور اہلِ ادب سے داد پا چکے ہیں۔ حفیظ جالندھری کا یہ شعر منور ہاشمی پر کتنا صادق آتا ہے:

تشکیل وتکمیل فن میں جو بھی حفیظؔ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

اُن کی شاعری کی چار اور نثر کی چار کتب شائع ہو چکی ہیں جن میں مضامین ومعانی کا ایک جہان جگمگا رہا ہے اور اہلِ نظر کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے مگر منور ہاشمی کی سب سے بڑی سعادت اس کی نعت گوئی ہے۔ موثر نعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری محبت وعقیدت کے بغیر نہیں کہی جا سکتی۔ عشقِ نبی کے آداب اور نعت گوئی کے حقیقی تقاضوں سے مکمل آگہی کے بغیر نعت کہنے میں ایک خطرہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر سے وارفتگی میں سرزد ہونے والی جسارت نعت کا سارا تاثر زائل کر دیتی ہے۔ جناب منور ہاشمی مقامِ خدا کو مقامِ محبوبِ خدا کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرتا۔ اس کا دل مئے توحید سے سرشار اور اس کا سینہ عشقِ نبی سے شاد وآباد ہے۔ منور ہاشمی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ محمد سے کٹ کر خدا سے نہیں جڑا جا سکتا اور محمد سے جڑ کر خدا سے جدا نہیں رہا جا سکتا۔ اُسوۂ نبی کی پیروی کے حوالے سے اُن کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:

میری ساری کوششوں کا ماحصل بس آپؐ ہیں
آپ کی منزل سے آگے راستہ کوئی نہیں

اب سے چودہ سو سال قبل اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں اپنی سب سے عزیز و محبوب ہستی کو مخاطب کرتے ہوئے قران شریف میں فرمایا تھا: ورفعنا لک ذکرک :اے محمدؐ تمھاری خاطر ہم نے تمھارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا۔اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ذکرِ محبوبِ خدا باعثِ خوشنودیٔ خدا ہے۔اس حقیقت کو جس نے پالیا اور ذکرِ حبیبِ خدا کی حلاوت سے جس کی زبان آشنا ہوگئی تو اس کے لیے محمدِ مصطفےٰ سے نسبت اور اُن کے ادنیٰ غلام ہونے کا اقرار دنیا کے ہر اعزاز سے بلند و برتر حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔دیکھیے منور ہاشمی اس نسبت کا اظہار کتنے فخر سے کر رہے ہیں:

آپ سے نسبت کے باعث عزت و شہرت ملی
ورنہ دنیا میں مجھے پہچانتا کوئی نہیں
اگر اے منوّر پُر خطا کوئی نام پوچھے تو یہ بتا
میں گدائے شہرِ رسول ہوں، مرا نام ادنیٰ غلام ہے

اقبال نے کیا درست کہا ہے:''ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں''رسولِ خدا سے محبت جتنی ادب کی منزلیں طے کرتی جائے گی،اتنی ہی نعت موثر ہوتی جائے گی۔احادیث میں آتا ہے کہ صحابہ کرام،رحمت اللعالمین کے سامنے اپنی آواز بلند نہ کرتے تھے،بعض اوقات وہ کئی کئی روز تک منتظر رہتے کہ مدینے سے باہر سے کوئی مہمان آئے اور وہ حضور سے دین کے بارے میں سوالات کرے تو ہمیں بھی حضور کی باتیں سننے کا موقع مل جائے۔وہ آپؐ سے سوالات کرنا بھی حسنِ آداب کے خلاف سمجھتے تھے۔آپؐ کے صحابہ ہر وقت آپ کے گرد و پیش رہتے، جب آپ کچھ فرماتے تو چپ چاپ سنتے ،جب آپ کوئی حکم دیتے تو تعمیل کے لیے دوڑ پڑتے۔جب آپ وضو کرتے تو آپ کے صحابہ آپ کے جسم سے چھو کر بہنے والے پانی کو زمین پر نہ گرنے دیتے۔بعد کے ادوار میں بھی عشقِ مصطفےٰ کی دولت سے مالا مال شعرائے کرام نے محبت کے قرینوں کا بہت خیال رکھا ہے۔فارسی کے ایک قدیم شاعر کہتے ہیں:

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبست

جناب منور ہاشمی ،نامِ مصطفےٰ کے لیے زبان کے ساتھ ساتھ سوچ کے باوضو ہونے کو بھی بے حد ضروری سمجھتے ہیں۔وہ کہتے ہیں:

سینکڑوں بار وضو کرتی ہے جب سوچ مری
تب کہیں نام ترا میرا قلم لکھتا ہے

ہر دور میں نبی کے نام لیوا مدینۃ النبی کے بارے میں بھی محبت واحترام کے جذبات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ امام مالکؒ کے بارے میں یہ روایت کتابوں میں موجود ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں جوتا پہن کر نہیں چلتے تھے کہ مبادہ اُن کا پاؤں کہیں اس جگہ پڑ جائے جہاں چودہ صدیاں قبل حضور نے پاؤں مبارک رکھا ہو۔ عشاق مصطفےٰ خاکِ مدینہ کو آنکھوں کا سرمہ سمجھتے تھے۔ وہ اُن خاک کے ذرّوں کو رشک سے دیکھتے ہیں جنھیں قدم بوسیِ حضور کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ منور ہاشمی کہتے ہیں:

وہ جس پر سیدِ عالم قدم رکھ کر گزرتے تھے
مرا خالق مجھے اس خاک کا ذرّہ بنادیتا

منور ہاشمی شدتِ احساس اور تازگیِ فکر کا شاعر ہے۔ اس کی غزل کا سانچہ کلاسیکی ہے مگر اس کا لہجہ جدا ہے۔ غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتی ہے۔ وہ اپنے دامن میں عشقِ حقیقی، عشقِ مجازی، دنیائے تصوف، ستم ہائے زمانہ اور آشوبِ شہر تک کے مضامین کو نہایت خوبی اور خوب صورتی سے سمو لیتی ہے۔ منور ہاشمی ایک قادر الکلام اور وسیع المطالعہ شاعر ہیں۔ وہ روحِ عصر کا مکمل شعور وادراک رکھتے ہیں۔ انھوں نے خود کو غزل کے تلازماتِ کہنہ کا اسیر بنایا ہے اور نہ اُن سے بلاوجہ بغاوت کی ہے۔ روایت کے تسلسل کا حسن برقرار رکھتی ہوئی اُن کی جداگانہ آواز سامع کے کانوں میں رس گھولتی ہوئی اس کے دل میں جا بستی ہے۔ اپنے جداگانہ اور منفرد لہجے کے بارے میں خود منور ہاشمی کہتے ہیں:

سب کی آواز میں آواز ملا رکھی ہے
اپنی پہچان مگر سب سے جدا رکھی ہے

غزل کا اپنا اسلوب ہے، اس میں نئی راہیں نہ صرف تلاش کی جاسکتی ہے بلکہ تراشی بھی جاسکتی ہے مگر جب تک شاعر غزل کے کلاسیکی تلازمات مثلاً گل وبلبل، دام ودانہ، صیاد وقفس، شمع وپروانہ، جام ومینا اور ہجر ووصال نہ برتے، اس وقت تک شعر میں حسن پیدا ہوتا ہے نہ تاثیر۔ ذرا منور ہاشمی کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:

جانے کس راہ سے آ جائے وہ آنے والا
میں نے ہر سمت سے دیوار گرا رکھی ہے

اگر چہ اس شعر میں منور ہاشمی نے سمت اور دیوار جیسے کلاسیکی تلازمات برتے ہیں مگر آج کا قاری محسوس کرتا ہے کہ ہر لحظہ تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی زندگی اور بدلتی ہوئی قدروں کے سامنے شاعر کوئی حفاظتی بند یا دفاعی فصیلیں تعمیر نہیں کرنا چاہتا۔ فکرِ نو سے خائف ہے اور نہ طرزِ کہن پر اڑنا چاہتا ہے۔ اس کا محبوب اور آئیڈیل کسی سمت سے آجائے، وہ اسے مرحبا کہے گا۔ استاذِ گرامی خورشید رضوی نے اس مضمون کو یوں باندھا ہے:

آنکھ میچو گے تو کانوں سے گزر آئے گا حسن
سیل کو دیوار ودر سے واسطہ کوئی نہیں

جذبے اور تخیل کی آمیزش سے کلام میں دلکشی اور گہرائی آتی ہے۔تفکر سے گہرائی اور تخیل سے شعریت پیدا ہوتی ہے۔اگر شاعر کے کلام میں محض تفکر ہی تفکر ہو اور تخیل کی ندرت اور بلند پروازی نہ ہو تو اس کی بات پند ونصائح کی طرح روکھی پھیکی ہو جاتی ہے۔ جسے قاری خوش دلی کے ساتھ قبول نہیں کرتا۔منور ہاشمی کے کلام میں جہاں تفکر کی گہرائی ہے، وہاں تخیل کی بلند پروازی بھی ہے جو اسے اپنے ہم عصروں میں بہت منفرد و ممتاز مقام عطا کرتی ہے:

وہ جس کے واسطے ملبوسِ حرف بُنتا ہوں
وہ اک خیال ابھی ذہن میں بھی آیا نہیں

کلاسیکی شعرائے کرام فراق میں تڑپتے اور وصل کے لیے سنگ دل محبوب کے در کا سنگ بننے کو بھی آمادہ رہتے تھے مگر جدید شعرا تنگ و تاز لگن اور جہد مسلسل کو وصل پر فوقیت دیتے ہیں۔منور ہاشمی کہتے ہیں:

ہوتی بھی اگر وصل کی حسرت کبھی پوری
پھر بھی دلِ مضطر تجھے آرام نہ ہوتا

دلِ مضطر تو ہر لحظہ جادۂ شوق پر گامزن رہنا چاہتا ہے،منزل اور وصل تو شوق کی موت ہے جو دلِ زندہ کو کسی طرح گوارہ نہیں۔ جناب منور ہاشمی کی ایک کتاب ہے''کربِ آگہی'' جو جتنا آگاہ ہوتا ہے، اتنا ہی کرب میں مبتلا ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں محاورہ ہے''Ignorance is a blessing'' نہ جاننے میں کتنی راحت ہے۔قرآن پاک میں ارشاد ہے:''جاننے والا نہ جاننے والے سے بہتر ہے'' یقیناً بہتر ہے کیوں کہ نہ جاننے والا تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا ہے جبکہ جاننے والا نہ صرف خود روشنی میں ہوتا ہے بلکہ وہ دوسروں کے راستوں کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ ہمارا مہربان شاعر منور بھی راستوں کو منور کرنے کا کارِ خیر سرانجام دے رہا ہے۔ وہ اسی لیے کربِ آگہی سے گزر رہا ہے کہ اسے معلوم ہے کہ ابھی دنیا میں بہت سے راستے تاریک ہیں جہاں اسے آگہی کی روشنی پہنچانی ہے۔اس نے وفا کے راستوں کو روشن کر دیا ہے مگر ابھی جفا کے راستوں پر تاریکی موجود ہے جس کے بارے میں ہر اہلِ دل مضطرب ہے۔ ہمارے مہربان شاعر کا نام منور، روشنی پھیلانا اس کا کام ہے۔ ہماری دعا ہے کہ وہ ہزاروں سال جیے اور ہر سال کے دن ہوں ہزار!

یارب! منور کی زندگی شمع کی صورت ہو اور اس کی روشنی سے تاریکیاں چھٹ جائیں اور ہر طرف امیدِ نو کا اجالا پھیل جائے۔ آمین

(یہ مضمون جشنِ منور ہاشمی منعقدہ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۹۸ء، طائف (سعودی عرب) کے ایک ہوٹل میں پڑھا گیا)

عظیم انسان، عظیم شاعر: ڈاکٹر منوّر ہاشمی

ڈاکٹراحمد حسین ہادی

ٹکساس، یو ایس اے

اُردو ادب میں بلا مبالغہ ہزاروں شعراء ہوئے ہیں۔ان میں سے سینکڑوں کے نام تذکروں اور دیگر کُتب میں موجود ہیں۔ان میں سے اہم شعرا کی تعداد بھی خاصی ہے۔اہم ان معنوں میں کہ جنھوں نے شاعری کی روح کو سمجھ کر قلم اُٹھایا اور زندگی کی بے ثباتی جیسی حقیقت سے آنکھیں چرائے بغیر حالات و واقعات کی جاندار تصویریں نوکِ قلم سے بنائی ہیں۔ایسی تصویروں کو بنظر غائر دیکھنے سے یہ گمان گزرتا ہے کہ اس شخص نے میرے ذاتی احساسات وخیالات کو کیسے بھانپ لیا۔میرے جذبات کی عکاسی ہو بہو کر رہا ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میری تو اس شاعر سے کبھی بھی ملاقات نہیں ہوئی مگر اس کے اشعار کہہ رہے ہیں ''گویا یہ بھی میرے دل میں ہے''۔

ایسے شاعر جو دلوں کی دھڑکنوں اور آنکھوں میں بسائے ہوئے خوابوں کو بھانپ سکیں اور پھر ان کی ہو بہو تصویریں لفظوں سے بنا کر ہمارے خوابوں کو مجسم صورت دیں،ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ڈاکٹر منوّر ہاشمی بجا طور پر ان اہم شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔قدرت نے ان کو عمدہ تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔انہوں نے اپنی فطری صلاحیتوں مطالعۂ ادب سے مزید جلا بخشی ہے۔شاعری چوں کہ جذبے کے ساتھ ساتھ تخلیقی ہنرمندی کی بھی متقاضی ہے اس لئے وہ اپنے اوّلین شعری مجموعے ''سوچ کا صحرا'' سے ہی اُن رفعتوں کا اشارہ کر رہے ہیں جو بہت سے شعراء کو زندگی بھر حاصل نہیں ہوتیں۔

دنیا کا شاید ہی کوئی انسان ایسا ہوگا جو کسی رومانی تجربے سے نہ گزرا ہو۔منوّر ہاشمی کے ہاں بھی اتنی رومانیت موجود ہے جتنی کہ انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی رومان سے کہیں زیادہ وسیع اور بالا ہے۔جو شاعری زندگی کے وسیع تجربات اور دورنِ خانہ جھانکنے کی صلاحیت رکھتی ہو وہ رومان پرور شاعری سے کہیں زیادہ ہمہ گیریت کی حامل ہوتی ہے۔ان کی شاعری ایسی ہی وسعتوں کو اپنی قوس میں لئے ہوئے ہے۔مثلاً:

اشک اس واسطے آنکھوں سے رواں رہتے ہیں
لاکھوں طوفاں ہیں جو سینے میں نہاں رہتے ہیں
دنیا والوں کی تو ہر بات چبھن رکھتی ہے
ایسے کانٹوں کے سدا دل پہ نشاں رہتے ہیں

منوّر ہاشمی اسی دل پذیر نگہ کے منتظر دکھائی دیتے ہیں کہ ''اُس کی نگاہ دل سے جگر تک اُتر گئی'' ایسے رومانوی

جذبات کی عکاسی اُنہوں نے اپنے اوّلین مجموعے میں یوں کی ہے:

بس اِک نظر میں ہاشمی اِک جذبۂ دل گداز
اس کو بھی اور مجھ کو بھی محسوس ہو گیا

قیس ہوں میں عصرِ حاضر کا منوّر ہاشمی
آج ویرانہ بھی آتا ہے نظر گھر کی طرح

سرتاج سخن وراں میر تقی میرؔ نے بھی ایسے ہی جذبات کی ترجمانی کی تھی: ''کوئی ویرانی سی ویرانی ہے...دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا'' یہ بات بھی یقینی ہے کہ کم وبیش ہر شاعر اپنے احساسات کو قلم بند کرتے ہوئے عصری اور قدیم شعراء کے رنگ کو شعوری یا لاشعوری طور پر استعمال کرتا چاہے وہ اس عمل سے انکار ہی کیوں نہ کرتا ہو۔ اور یہ کوئی ایسی بُری بات بھی نہیں کہ بزرگوں کے خیالات وکمالات سے استفادہ کیا جائے۔ ملاحظہ ہو:

میں جب سے تیرے ذہن کی سوچوں سے جدا ہوں
اس وقت سے احساس کی سولی پہ چڑھا ہوں

یہ اور اس طرح کی مثالیں اکثر شعراء کے ہاں ہو سکتی ہیں۔ ان کے ہاں ذاتی مشاہدات وتجربات کی عکاسی بھی شاعری میں نظر آتی ہے۔ وہ زندگی پر تنقیدی نگاہ کرتے ہوئے اس کو ایک مثالی اور امکانی دنیا کے تصور کے مطابق ڈھالنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ انہوں نے منصبِ زندگی، آگہی اور دردِ آگہی کا اظہار بھی کیا اور اوجِ کمال کی تلاش بھی ان کے پیش نظر رہتا ہے۔

اب صورتِ حالات نہاں ہے نہ عیاں ہے
یہ کون سی منزل ہے پڑاؤ یہ کہاں ہے
منسوب تھی جس سے میری قسمت کی بلندی
میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں ستارہ وہ کہاں ہے

شاعری کرنا پوری عمر کا کام ہے۔ زندگی میں ایک بار یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ آپ نے شاعری کرنی ہے اور پھر ساری حیاتی اسی دکھ کو پالتے ہوئے گزر جاتی ہے۔ ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ شاعری کی نہیں جاتی، شاعری وارد ہوتی ہے۔ یہ ایسی جذب وسرور کی کیفیت ہے جس کا اظہار نہ کرنے والا گھٹ گھٹ کے مرتا ہے اور ان محسوسات کو الفاظ کا روپ دینے میں راحت محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر منوّر ہاشمی بھی یقیناً اسی قبیل میں شامل ہیں اور ''زندگی برائے ادب'' کے قائل ہیں بلکہ ان کا اپنا مقولہ ''زندگی برائے ادب'' ہے۔ جب خیالات اور ادراک کی بارش چاروں طرف سے ہو رہی ہو تو یہ زندہ اور درد بھرا تجربہ شعری واردات بن کر ابھرتا ہے۔ ایسا تجربہ جس کے اظہار کے لئے نوکِ قلم سے بنی ہوئی چلتی پھرتی اور بولتی چالتی

تصویریں ہیرے جیسے ترچھے ہوئے الفاظ میں سے جھلمل جھلمل کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ فن منور ہاشمی کے اشعار میں جا بجا دیکھا جا سکتا ہے۔

آہوں کی گرمی کا موسم اور آنکھوں کی برکھا رُت
غم کی دھوپ میں ارمانوں کا ڈھلتا سایہ یاد کرے
اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوں جب
رُوح میں تازگی اُترتی ہے

یہ اور اس طرح کے اشعار ہاشمی کی شاعری کی خاص پہچان ہیں۔

ڈاکٹر منور ہاشمی اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن میں مختلف اہم عہدوں پر موثر کام کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ بیرون ملک اردو ادب کے پروفیسر جیسی خدمات بھی انجام دیں۔ وفاقی جامعہ اسلام آباد میں اردو ادب کے پروفیسر اور اب نوشہرہ نادرن یونی ورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ جدید زمانے کی یہ صحرا نوردی ہاشمی صاحب کے ہاں ہنوز جاری ہے مگر منزل ابھی نہیں آئی یہ سفر جاری ہے۔

منزل کی سمت بھی ہے زمانوں کا فاصلہ
گھر سے چلے ہوئے بھی زمانے گزر گئے

ادبی حلقوں میں ان کے تعارف کے بارے میں کچھ کہنا ''چہ معنی دارد'' آپ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ بحیثیت ایک استاد اور انسان کے ڈاکٹر ہاشمی ہر ایک کے لئے نرم گوشہ رکھنے والے ہیں۔ علمی حیثیت سے آپ ایک نکتہ رس اور وسیع مطالعہ کی حامل شخصیت ہیں۔ مزاح میں بھی علمیت اور وقار جھلکتا ہے۔ سینکڑوں طلبا انہیں گھنی چھاؤں والا پیڑ سمجھتے ہیں اور ان کے سائے میں بیٹھ کر طمانیت محسوس کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ایک بڑے انسان، استاد اور شاعر میں مذکورہ اوصاف کا ہونا جزو لازم ہے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی

بحیثیت نعت گو

بارگاہِ رسالت مآبؐ کا تصدیق نامہ

افتخار عارف

حاضری اور حضوری کی سعادت اذن کے بغیر ممکن نہیں ہوتی، یہ میرا ایمان ہے۔ کچھ یہی صورت نعت کی بھی ہے کہ تاثیر کی نعمت بھی اسی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ جوارِ حرمین میں منور ہاشمی کو حصولِ معاش کا موقع عطا فرمانے والے نے مزید کرم کیا کہ رزقِ اخلاص اور اجر نیاز کی دعائیں بھی مستجاب ہوئیں۔ پیشِ نظر مجموعہ نعت کی حیثیت اس بارگاہ عالی مرتبت کے تصدیق نامے کی سی ہے۔ یہ نعتیں وہ ہیں کہ جن میں کچھ رحمت اللعالمین کی بارگاہ کی طرف سفر کرتے ہوئے لکھی گئی ہیں۔ کچھ مسجدِ نبوی کی فضائے مقدس و منور میں قلم بند ہوئیں اور کچھ دیارِ نبوی کے جوارِ خوش گوار و پُر انوار میں انعام ہوئیں:

نعت محبوب منور کیے جائے مجھ کو
میں جدھر جاؤں مرے ساتھ اُجالے جائیں

میں درِ پاک پہ پہنچا تو عجب حال ہوا
میں گرے جاؤں مجھے کوئی سنبھالے جائے

پہنچ کر جس گھڑی دیکھا سرِ منزل مدینہ
لگا ایسے کہ ہے ساری زمیں کا دل مدینہ

نعت کا چلن بنو ہاشم میں بہت پرانا ہے۔ بعثتِ نبوی کے بعد بنو ہاشم کے سید و سردار ابو طالب ابن عبدالمطلب نے جس شان کی مدح کی ہے، اسے ہماری نعتیہ شاعری کا بنیادی مثالیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً ان کا قصیدہ لامیہ:

وابیض یستسقی الغمام بوجهه
ثمال الیتامیٰ عصمة للارامل

''وہ ایسے روشن چہرے والے ہیں کہ ان کے وسیلے سے بارش کی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ وہ یتیموں کی سرپرستی کرنے والے اور بیواؤں کی نگہداری کرنے والے ہیں۔''

رحمتِ عالم و عالمیان کی حسن سراپا اور خلقِ عظیم اور اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں لکھی جانے والی نعتوں کا ایک سلسلہ خیر ہے جو ہمیشہ سے جاری ہے۔ کیسا کیسا عظیم المرتبت شخص اس بارگاہ میں نعت کے نذرانے لے کر حاضر ہو چکا ہے۔ منور کہ ہاشمی بھی ہے، اپنی بساط بھر، جذبوں اور لفظوں سے بنی ہوئی سوت کی ایک انٹی لے کر آستانہ محمود پر آ گئے ہیں:

یہاں دھڑکنوں کا درود ہے ، یہاں آنسوؤں کا سلام ہے
یہاں بات اونچی نہ کیجیے یہ بڑے ادب کا مقام ہے
یہاں گردشوں کا اثر نہیں، یہاں رنج و غم کا گزر نہیں
یہاں کائنات سے مختلف کوئی دوسرا ہی نظام ہے
اگر اے منوؔر پُرخطا کوئی نام پوچھے تو یہ بتا
میں گدائے شہرِ رسول ہوں ، مرا نام ادنیٰ غلام ہے

منور کے یہاں اخلاصِ نیت اور جذبے کی شدت فنی تقاضوں کے ساتھ آمیز ہوکر تہذیبِ نعت کی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرتی ہے اور محاسنِ ہنری کی پاسداری میں بھی کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتی۔ یہی اس کے مجموعۂ نعت کا اختصاص ہے:

یہ میری خاک اُڑے اور جاکے طیبہ میں
گدائے شہر کے قدموں کی دھول ہوجائے

اسمِ رسولِ پاک سے ہے روشنی تمام
اس سے بڑا چراغ منور کہیں نہیں

میری ساری کوششوں کا ماحصل بس آپؐ ہیں
آپ کی منزل سے آگے راستہ کوئی نہیں

ادنیٰ سا میں غلام ہوں اس پاک ذات کا
جس کے لیے دھڑکتا ہے دل کائنات کا

شمار اس کا میں شہروں میں نہیں کرتا منوؔر
کہ ہے فردوس کے باغات میں شامل مدینہ

تاکہ محروم نہ ہو کوئی خنک چشمی سے
گنبدِ سبز نے رنگ اپنا درختوں کو دیا

خداوندِ کریم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور ان لفظوں کی باریابی کے لیے دعا گو ہوں۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کی نعت گوئی

ڈاکٹر فہمیدہ تبسم

نعت منزہ و مطہر دلوں میں اُترنے والے سوزِ عشق کا ایسا لفظی اظہار ہے جس کی تخلیق میں قلبِ گداز کی نازک رگوں کی سرخی اور اشک بے تاب کا پیازی رنگ شامل ہوتا ہے۔ نعت گوئی دیگر اصناف سخن سے یکسر مختلف اور امتیازی صنف ہے یہ اُن لاکھوں رسا آہوں کا ثمر ہوتی ہے۔ جنھیں درِ قبول سے پروانہ توفیق عطا ہوتا ہے، جن کی تپش حریم کائنات کو چھوتی ہے اور جن کی تڑپ کی تاثیر سے رحمت خداوندی جوش میں آتی ہے۔ عشق محمدؐ کی نعت ہر کسی کو عطا نہیں ہوتی نہ ہر دل غارِ حرا ہوتا ہے نہ ہر وارفتگی، اظہار ام معبد کے شوق کے مثل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر منور ہاشمی کا شمار اُن ہی چنیدہ اور بانصیب لوگوں میں ہوتا ہے جن کے دل کی دھڑکنوں کو عشق محمدؐ کے سرمدی آہنگ کے لیے منتخب کرلیا گیا۔

''لوح بھی تُو قلم بھی تُو'' ڈاکٹر منور ہاشمی کی حدیث دل ہے جس کے لفظ لفظ میں جذب و مستی کی کیفیت رچی ہوئی ہے اس مجموعے کا عنوان اقبال کے جن نعتیہ اشعار کا حصہ ہے وہ گویا ہر عاشق کے دل کی آواز ہے یہ انتساب ہے اُس ہستی کے نام جو وجہ تخلیق کائنات ہے۔

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب تُو
نکلے تیری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بُو

فردوس مدینہ کی مشکبار فضا میں رسول مقبولؐ کی عطا سے سرفراز ہونے والے ڈاکٹر منور ہاشمی اُن بخت ور لوگوں میں شامل ہیں جنھیں نہ صرف بار ہا بارگاہِ رسالت مآب میں حاضری کا شرف ملا بلکہ مضافاتِ حرم میں طویل قیام بھی نصیب ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے قلب و نظر نے مدینہ منورہ کی خنک ہواؤں میں جو تسکین پائی اور جو روحانی کیف سمیٹا اُسے نعت محمد مصطفیؐ میں بیان کردیا۔

ہاشمی صاحب کی عمومی وجہ شہرت غزل گوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ماہر اقبالیات، دانش ور اور یونیورسٹی پروفیسر بھی ہیں لیکن ان کی شخصیت کے تمام اوصاف پر حاوی وصف عشقِ رسولؐ ہے۔ اُن کی غزل ارتقاعِ ذات کے زینے پہ اُس پہلے قدم کی مانند ہے جس کی آخری سیڑھی اُس سرمدی جذب کی دُھند میں گُم ہورہی ہے۔ جہاں پہنچ کے حیات اپنا مفہوم پاتی ہے۔ اور عشق علائق دُنیا سے بے پروا نور کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا جزو بن جاتا ہے۔ یہی ہاشمی صاحب کا مقصود و منتہیٰ ہے اور یہی جذب اُنکے نعتیہ کلام میں موجزن ہے۔ اُنھیں اپنے فن کے اظہار کا کمال نعتِ احمد مرسلؐ ہی میں دکھائی دیتا ہے۔

اظہار فن کے لاکھ طریقے سہی مگر
اظہار کا کمال ہے نعتِ رسول پاکؐ

گھر میں کسی بھی شے کی ضرورت نہیں مجھے
میرا منال و مال ہے نعتِ رسول پاکؐ

''لوح بھی تُو قلم بھی تُو'' کے شعری آئینے میں ہر جان نثار امتی کو اپنے جذبے کی شدت مجسم دکھائی دیتی ہے۔ پاکستان سے سوئے حجاز روانگی، جدہ سے مدینہ منورہ مراجعت، مسجد نبویؐ بخت کی یاوری کو جس طرح مرحلہ وار بیان کیا گیا ہے وہ ایک مسلسل نظمیہ کیفیت بن گئی ہے۔ جس میں سفرِ شوق کو منزل بہ منزل دیکھا جا سکتا ہے۔ وارفتگی اور تشنگی یوں ہم آویز ہیں کہ طلب اور رسد کو گویا الگ تعریف نہیں دی جا سکتی۔

سینکڑوں بار بھی دیکھوں تو طلب ہو باقی
روضۂ پاک مکرّر سے مکرّر دیکھوں

ڈاکٹر ہاشمی کے نعتیہ مجموعے میں اظہار عقیدت و محبت کی سادہ و سلیس صورتیں بھی موجود ہیں، ایک درویش خدامست و گدائے منظرِ کرم کی بے ساختہ مناجات بھی دلوں کو چھوتی ہیں اور ایک دانشور اور صاحب معرفت کی فکر کے نمونے بھی جاذب توجہ ہیں۔ اُن کی ممدوح ہستی فخر کائناتؐ ہے۔ ایسی ہستی جس کی عظمتیں زمان و مکاں کی وسعتوں سے بالاتر اور جس کا فیض ازل تا ابد جاری و ساری ہے۔ جس کی رحمت زمانوں اور قرنوں پر محیط ہے۔ جب عظمت محمد مصطفیؐ کا بیان مقصود ہو تو ہاشمی صاحب کا قلم کیا شاندار توصیف رقم کرتا ہے۔

اُس کی رحمت کو تو ادوار میں محدود نہ کر
روزِ اوّل سے ابد تک ہے ضرورت اُس کی
مانگ ٹھہرے ہوئے لمحوں میں حوالہ اُس کا
ڈھونڈ اُڑتے ہوئے قرنوں میں شہادت اُس کی

''لوح بھی تُو قلم بھی تُو'' میں ہاشمی صاحب کا اسلوبِ اظہار فقط قافیہ بند نعت تک محدود نہیں بلکہ اُنہوں نے جدید نظم کے لہجے میں بھی اظہار شوق کیا ہے۔ تاہم ان کی اکثر نعتیں غزل کی ہیئت میں ہیں۔

مدینہ جنت ارضی ہے ہر عاشق و جاں سپار اُس منور دھرتی پہ سجدے کی تمنا لیے پھرتا ہے۔ وہ مدینۃ النبیؐ جو نبی کریمؐ کے جاری و ساری فیض اور منور و مطہر وجود مبارک کی وجہ سے کائنات میں بے مثل و لاثانی ہے اپنی خاص رُوحانی تجلیات کی وجہ سے ہر دل کو اپنی جانب مبذول کرتا ہے۔ مدینے کی جنت کو رُجوع کرنے والے مسافر جانتے ہیں کہ وہ گھڑی جب گنبد خضری پہ نظر پڑتی ہے کتنے زمانوں پر حاوی ہوتی ہے۔ کیسے ایک ایک سانس میں قرنوں کا سفر در سمٹتا ہے اور کیسے اشکوں کے سیل رواں سے پلکوں کے بند ٹوٹتے ہیں۔ ایسی مسرت، ایسا کیف اور ایسا خمار وجود کو گھیرتا ہے کہ برسوں کی تھکن کہیں دُور کی مسافت پہ چلی جاتی ہے۔ نظام زندگی کے معیارات ہی بدل جاتے ہیں۔ بس ایک ہی تمنا ہر دل میں اُبھرتی ہے یہ لمحات

صدیوں پر محیط ہو جائیں، بدن خاک ہو جائے اور روح امر ہو کر مدینے کی گلیوں کا طواف کرے۔ ہاشمی صاحب کو بھی مدینے کی پُر کیف سرزمیں پہ سلسلۂ روز و شب کا نیا کشف ہوا۔

یہاں گردشوں کا اثر نہیں یہاں رنج و غم کا گزر نہیں
یہاں کائنات سے مختلف کوئی دوسرا ہی نظام ہے
یہاں حرف و صوت کی بات کیا یہاں دل کے جذبے ہیں معتبر
جہاں آنکھ میں ہوں ندامتیں وہاں خامشی بھی کلام ہے

مدحت رسولؐ آسان کام نہیں جب تک دل عبادت کدہ نہ بن جائے اور لفظ اشکوں سے وضو نہ کرے سرکارِ دو عالمؐ کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ نبی کریمؐ کی ذات بابرکات کے اوصاف عالیہ کے بیان کا سلیقہ بھی عطائے نظرِ کرم ہے۔

سب سے پہلے اشارہ ملا آپ کا سب سے آخر میں بعثت ہوئی آپؐ کی
زیبِ لوحِ ازل آپؐ کا نام تھا خیر روزِ جزا آپؐ کی ذات ہے
آپؐ کے نام سے ہے منور جبیں عرش کی فرش کی بلکہ کونین کی
نصِ قرآں ہے یہ خالق و خلق کا مقصد و مدعا آپؐ کی ذات ہے

ڈاکٹر منور ہاشمی حالی اور حفیظ تائب کی طرح اُمتِ مسلمہ کے دُکھوں کا بیان بارگاہِ رسالت میں کرنے کے بعد سرکارِ دو عالم سے مدد کے طلب ہیں تاہم وہ اپنا منفرد اسلوب اور مخصوص پیرایہ اظہار رکھتے ہیں:

آج پھر اُمت کی نبضیں ڈوبنے کو آ گئیں
پھر علاج درد پیہم رحمت للعالمینؐ

''لوح بھی تُو قلم بھی تُو'' لفظ لفظ، مصرع مصرع اُن آنسوؤں کا بیان ہے جو بے تابی سے حضوری کے سفر میں بہتے ہیں۔ یہ ایک ایسے شاعر کا اظہارِ عقیدت ہے جو نعت گوئی کو زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ تصور کرتا ہے۔ یہ نعتیہ مجموعہ نعت نگاری کی درخشاں تاریخ کا روشن باب ہے جو اپنے خالق کو امر رکھنے کیلئے کافی ہے۔ آخر میں برِ صغیر کے ممتاز شاعر شمیم جے پوری کی رائے:

''منور ہاشمی رسمی طور پر نعت شریف نہیں کہتے بلکہ یوں لگتا ہے کہ نعت ان کے رگ و پے میں بسی ہوئی اور عرض ہنر میں ان کی اولیں ترجیح بن چکی ہے۔ عجز و انکسار کا جو انداز ان کی نعت میں ملتا ہے۔ وہ ان کی والہانہ عقیدت و محبت کا عکاس ہے۔ وہ بلاشبہ عشق نبیؐ میں ڈوب کر نعت کہتے ہیں۔ ان کے ہاں فن کی پختگی بھی ہے اور فکر کی گہرائی بھی۔۔ ان کی نعت کا ہر شعر قلب و روح میں اترتا چلا جاتا ہے۔ بعض اشعار تو ایسے ہیں کہ ہلا کر رکھ دیتے ہیں''۔

''لوح بھی تُو قلم بھی تُو'' کی فنی بحث

پروفیسر ضیاء الرحمٰن

نعت کہنا، سننا اور لکھنا سعید کام ہے جس کا اجر دونوں جہانوں کے لیے ہے۔ نعت کی تاریخ میں مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے اہل علم و ہنر نے اپنا حصہ ڈالا ہے۔ نعت کی ابتدا تو خالق باری تعالیٰ نے کی اور ایسی خوب صورت، اعلیٰ، عمدہ نعت جس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ جہاں اپنا ذکر کیا، وہاں اپنے پاک رسول کا بھی تذکرہ کیا۔ نعت کہنا سنت اللہ ہے۔ یہ ایسا اقدس فعل ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے، کم ہے۔

''لوح بھی تُو قلم بھی تُو'' ڈاکٹر منور ہاشمی کا نعتیہ مجموعہ ہے جو اکیس سال پہلے منصۂ شہود پر آیا۔ منور ہاشمی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لہٰذا اس مجموعے میں شامل اکثر نعتیں غزلیہ ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔ ایک نعت ایسی ہے جس کا پہلا بند سہ مصرعی ہے جبکہ بقیہ سات بند چار مصرعی ہیں۔ اس طرح یہ نعت مثلث ترکیب بند اور مربع ترکیب بند میں ہے۔ ''روز قیامت''، ''قبولیت کی سند''، ''جواز''، ''ارشادِ باری تعالیٰ''، ''ابھی میں نے'' کے عنوانات سے لکھے گئے اشعار آزاد نظم کی ہیئت میں ہیں۔ اس مجموعے کو مختلف حصوں میں بانٹنا اپنے جذبات و احساسات کی رنگارنگ کیفیات کو ایک لڑی میں پرونے کے مترادف ہے۔ ان کی نعت فکری و فنی خوبیوں سے مزین ہے۔ جن میں چند فنی خوبیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ا۔ تکرارِ لفظی:

تکرارِ لفظی کی خوبی اُردو کے اکثر شعرا کے ہاں پائی جاتی ہے۔ اس وصف سے منور ہاشمی کی نعت بھی متصف ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کے لیے پیش کیے جاتے ہیں:

مجھ کو بلا کے آپ نے دی ہیں تسلیاں
ہم پایہ میرا اور کوئی ہے؟ نہیں، نہیں

جب میں تیرے شہر سے باہر نکلا تھا
بوجھل بوجھل قدموں چلتا جاتا تھا
غم کی گرد نے ڈھانپ لیا تھا چہرے کو
آنکھیں پرنم پرنم دل افسردہ تھا
تجھ سے ملنے سے پہلے میں سوچتا ہوں
میرا دامن کتنا میلا میلا تھا

حرف ''ک'' کی تکرار:

ایک ایک دھڑکن میں زمزمے درودوں کے
ہر گھڑی رہے دل سے رابطہ مدینے کا

حرف ''ر'' کی تکرار

راستے کا یہ منظر حافظے میں رکھ لینا
راستہ ہے جنت کا، راستہ مدینے کا

۲۔صنعتِ تضاد:

شعر میں متضاد معانی کے حامل الفاظ کا لانا، شعر کی لفظی و معنوی خوبی کو اُجاگر کرتا ہے۔ یہاں کچھ اشعار نمونے کے طور پر حاضر ہیں:

حاضر ہوا جو سید کونین کے حضور
مجھ کو ہر اک سوال کا حاصل ہوا جواب
بھرے دہر میں کسی شہر میں نہیں ایسا منظر روز و شب
یہاں شام، صبح مثال ہے، یہاں صبح، صبحِ دوام ہے
لے کے طیبہ جو ہمیں قافلے والے جائیں
اپنے تاریک شب و روز اُجالے جائیں

۳۔مراعاۃ النظیر :

کلام میں مضمون کی مناسبت سے ایسے الفاظ کا لانا جو پہلے لفظ کی رعایت سے مماثل ہوں۔ منور ہاشمی کی نعت میں اس صنعت سے کام لیا گیا ہے۔ ذیل میں چند اشعار بطور مثال درج کیے جاتے ہیں:

ملے گا کشتیِ امت کو ساحلِ بخشش
چلا رہا ہے اسے بادبان رحمت کا
یک بیک کشتیِ ہستی نے سنبھالا خود کو
پاس منجدھار کے دریا کا کنارا آیا

نہ فرق آئے کبھی نظمِ فلک میں
کوئی پوچھے تگِر شمس و قمر سے

۴۔صنعتِ تجنیس:

تجنیس میں ایک لفظ اپنی املا اور ظاہری شکل میں دوسرے لفظ کے مماثل ہوتا ہے لیکن معنی الگ الگ ہوتے ہیں۔منور ہاشمی کے اشعار میں یہ صنعت کچھ زیادہ نہیں پائی جاتی لیکن تلاش سے مثالیں مل جاتی ہیں۔ذیل میں کچھ اشعار قارئین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں:

زندگانی دوپہر ہے اور کڑی ہے دوپہر
آپ کی رحمت کے سائے میں سکوں پاتا ہوں
اک سبز سبز روشنی میں دل میں اُتر گئی
آنکھوں میں، مَیں نے گنبدِ خضریٰ بسا لیا

مجموعی طور پر ان کی نعت میں صنائع بدائع کا استعمال ان کی نعت کو دل پذیر، خوش کن اور پُر تاثیر بناتا ہے۔انھوں نے موضوع اور فن دونوں کے تقاضوں کو پورا کیا ہے، حالانکہ نعت کا موضوع جتنا آسان نظر آتا ہے، اتنا آسان نہیں ہے۔ نعت کا تعلق وفورِ شوق سے ہے، اس لیے جذبات سے مغلوب ہو کر انسان جادۂ مستقیم سے ہٹ سکتا ہے۔

منور ہاشمی: حبِ رسولؐ کے آئینے میں

عثمان ناظر

جناب ڈاکٹر منور ہاشمی سے میری پہلی ملاقات تین سال قبل جامعہ نار درن میں ہوئی، میں وہاں ایم فل میں داخلہ لینے کے سلسلے میں گیا تو ایک شفیق اور مدبر شخصیت کو ڈپٹی رجسٹرار کے دفتر میں بیٹھا پایا اور پہلی نظر میں ہی اندازہ ہو گیا کہ یقیناً یہ صاحب علم اور کوئی پروفیسر ہیں۔ تب مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ میرے سامنے موجود شخصیت ماہرِ اقبالیات، ملک کے نامور شاعر اور معروف ادیب جناب منور ہاشمی جلوہ افروز ہیں۔ گو کہ میں ان کا کلام بھی پڑھ چکا تھا اور نام سے بخوبی واقف تھا۔ بعدازاں معلوم ہونے پر مجھے اپنی کم علمی اور ناواقفیت پر افسوس بھی ہوا کہ ڈاکٹر صاحب سے ملنے میں اتنی تاخیر ہوئی اور دلی مسرت بھی ہوئی کہ اس قدر صاحبِ علم شخصیت کی زیرِ سرپرستی بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔

ہاشمی صاحب انتہائی متین، باوقار اور بردبار شخصیت کے حامل ہیں۔ ایک خوب صورت شاعر، بہترین معلم اور شفیق اُستاد کے روپ میں وہ ایک چھتنار کے مانند ہیں جس کی گھنی چھاؤں علم کے متوالوں کو ٹھنڈک مہیا کرتی ہے۔

زمانۂ طالب علمی سے ہی سکول کے ابتدائی دنوں میں ایک شعر کہیں سے سنا جو لاشعور میں محفوظ ہو گیا۔ بعدازاں عمر کی منازل طے کرتے ہوئے جب بھی کبھی حالات کے گرداب میں پھنسنے کی کیفیت پیدا ہوئی، وہ شعر ذہن میں تازہ ہو گیا۔ کیا خوب صورت شعر ہے:

ایک ہی مسئلہ تا عمر مرا حل نہ ہوا
نیند پوری نہ ہوئی خواب مکمل نہ ہوا

جب ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو یہ انکشاف ہوا کہ اس خوب صورت شعر کے خالق وہ ہیں۔ یہ جان کر خوش گوار حیرت ہوئی۔ ہاشمی صاحب شعروادب کی کئی دہائیوں سے ترویج فرما رہے ہیں۔ یہ مجھ ناچیز کی خوش بختی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی سرپرستی نصیب ہوئی۔

آج میں ڈاکٹر منور ہاشمی کی نعت کے بارے میں اظہارِ خیال کرنے کی جسارت کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اُن کے فن پر بحیثیتِ مجموعی بحث کا سوچا بھی جائے تو اس قدر مختصر مضمون میں اس کا احاطہ کلی طور پر ناممکن ہے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی محبت سے معطر قلب لیے میدانِ نعت میں اُترے تو چار سُو محبت وعقیدت کے وہ گلاب کھل اُٹھے جنھوں نے کئی دلوں کو مہکایا اور نعتیہ ادب کی مہک فزوں تر ہو گئی۔ وہ خود بھی ہاشمی ہیں اور رسولِ ہاشمیؐ سے محبت اُن کے اشعار سے چھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے نعتیہ مجموعے ”لوح بھی تُو قلم بھی تُو“ کا عنوان ڈاکٹر علامہ اقبال کی نعتیہ شاعری سے اخذ شدہ ہے۔

دورِ حاضر کے نعت گو شعرا جن مسائل اور بے احتیاطیوں کا شکار ہیں، ڈاکٹر صاحب ایسی بدعات سے کوسوں دور ہیں۔ انھیں اس بات کا بخوبی ادراک ہے کہ نعت گوئی انتہائی مشکل اور احتیاط طلب میدان ہے جہاں ذرا سی لغزش سے تمام جمع پونجی لٹ جانے کا خدشہ ہمہ وقت درپیش رہتا ہے۔ افراط و تفریط سے دامن بچاتے ہوئے توازن و اعتدال کی راہ پر ہاشمی صاحب کامیابی سے رواں دواں نظر آتے ہیں۔

''لوح بھی تُو قلم بھی تُو'' کی حسین انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس مجموعے میں شامل کلام دیارِ رسول پر حاضری کے ایام میں تحریر کیا۔ اُن کی خوش بختی پر جس قدر ناز اں ہوا جائے، کم ہے۔ اس میں کہیں دربارِ رسول پر حاضری کے لیے جانے سے قبل کی کیفیاتِ قلبی کا تذکرہ ہے تو کہیں درِ حبیب پر بوقتِ حاضری چھلکتی ہوئی محبتوں اور شدتوں کا اظہار یہ ملتا ہے۔ مسجدِ نبوی کو جاتے ہوئے منزل کے قرب کی تڑپ بھی ہے اور گنبدِ خضریٰ کے پُر لطف و پُر نور نظاروں کی روداد بھی۔ مدینہ سے واپسی کا مرثیہ بھی ہے۔ کیوں نہ منور ہاشمی کے سنگ ان متضاد کیفیات کا لطف لیا جائے۔

روانگی سے قبل اسلام آباد ایئرپورٹ پر حالِ دل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کہاں میں اور کہاں روضے کی جالی
مگر اذنِ حضوری آگیا ہے

درِ رسول پر حاضری کے لیے مدینہ منورہ کی جانب پُر نور سفر کا لطف اٹھاتے ہوئے ان کی نوکِ قلم سے کیا خوش نما پھول جھڑتے رہے:

یقیں آتا نہیں مجھ سا بھی عاصی ہے رواں اس پر
کہ جس رستے کی منزل مصطفےٰ کا آستانہ ہے

مجھے لگتا ہے ہر لمحہ بڑی تاخیر کرتا ہے
پہنچنا ہے مجھے جلدی مجھے تو جلدی جانا ہے

محبت ایک لافانی و لازوال جذبے کا نام ہے۔ جب کوئی شخص یا شے انسان کو اچھی لگتی ہے تو ایک انسیت کا تعلق استوار ہو جاتا ہے۔ یہ تعلق جب مضبوطی کے مراحل طے کرتا ہوا محبت کے مدار میں داخل ہوتا ہے تو جذبات میں شدت پیدا ہونے لگتی ہے۔ یہ شدت ایک خاص مقام پر جا کر عشق میں بدلتی ہے تو عاشق، معشوق کے رنگ میں ڈھل چکا ہوتا ہے۔ ایسے میں جب عشق و محبت کے جذبات دو جہانوں کے تاجدار، خاتم الانبیاء، سرورِ دو جہاں کی پاکیزہ و مقدس ہستی کے لیے ہوں تو دونوں جہانوں میں کامیابی کا توشہ ہاتھ لگ جاتا ہے۔ حضورؐ کے عشاق کے دلوں میں دیارِ رسول پر حاضری کی تڑپ ہمیشہ جاگزیں رہتی ہے۔ ایسے میں جب محبوب کے در پر حاضری کا پروانہ مل جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں عالم کی

دولتِ مراد ہاتھ آ گئی ہو۔ منور ہاشمی کملاحظہ ایسی ہی کیفیات سے دو چار نظر آتے ہیں۔ ان کے ایک ایک لفظ میں محبتِ رسول، مدینے کی بے قراری، دیارِ رسول پر پہنچنے کی تڑپ اور والہانہ شدت واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے:

میں گرتا پڑتا آ گیا قدموں میں آپ کے
اور آپؐ نے اٹھا کے گلے سے لگا لیا

وہ سر نہیں جو آپ کی رہ میں نہ کٹ سکے
جو در پہ آپ کے نہ جھکے، وہ جبیں نہیں

مدینہ منورہ میں درِ نبی پر حاضری کے وقت جذبات کی فراوانی دیکھیے:

یہاں گردشوں کا اثر نہیں یہاں رنج و غم کا گزر نہیں
یہاں کائنات سے مختلف کوئی دوسرا ہی نظام ہے

دربارِ نبی پر حاضری کے وقت پُر لطف و پُر نور لمحات نے منور ہاشمی کے دل کو اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ وہاں سے روانہ ہونا اور درِ حبیب کو الوداع کہنا یقیناً ایک جان لیوا امر تھا۔ اس جدائی کی کسک اُن کے اشعار میں شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

رواں ہونے سے پہلے موت آتی
بھلا کس کام کی اب زندگی ہے
کبھی لگتا ہے یہ میں خود نہیں ہوں
کسی کی جیسے میت جا رہی ہے

منور ہاشمی کی محبت میں وارفتگی ہے، شدت ہے، والہانہ پن ہے۔ جب وہ درِ حبیب سے واپس لوٹے تو شدتِ غم سے نڈھال تھے۔ اُن کی واپسی پر لکھا گیا نعتیہ کلام اُن کی اس کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ حزن و ملال کے جذبات کی عکاسی ملاحظہ کیجیے:

سوچ رہا ہوں میں کیوں واپس آیا ہوں
مجھ کو تو اس چوکھٹ پر مر جانا تھا

مدینہ منورہ سے محبت تمام عاشقانِ رسول کے دلوں کی زینت ہے۔ قابلِ صد احترام و محبت ہیں وہ در و بام جہاں سرورِ جہاں کے ایام گزرے۔ وہ مٹی جس نے آپؐ کے نعلین پاک کو بوسے دیے۔ ہر مسلمان کی دلی خواہش ہے کہ وہ اُس پاکیزہ دیار پر اپنی جبینِ محبت سے بوسہ ہائے عقیدت ثبت کرے۔ اُن کے کلام میں جاذبیت، دل کشی، روانی، ترنم اور برجستگی کے اوصاف بھرے ہوئے ہیں۔ انتہائی روانی اور سلاست سے تمام مضامین کو خوبی سے نبھا کر ہاشمی صاحب نے

اپنی فنی مہارت وکمال کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ کچھ متنوع اشعار ملاحظہ کیجیے اور لطف لیجیے:

گو بظاہر فاصلہ صدیوں کا ہے ادوار میں
آپؐ کی ہستی سے میرا فاصلہ کوئی نہیں

خدا کے حلقۂ تسلیم میں مقرب ہے
جو شخص دل سے فدائے رسول ہوجائے

یہاں حرف وصوت کی بات کیا یہاں دل کے جذبے ہیں معتبر
جہاں آنکھ میں ہوں ندامتیں وہاں خامشی بھی کلام ہے

دعا ہے کہ اللہ، ہاشمی صاحب کو صحت اور تندرستی عطا کیے رکھے اور اُن کی نوکِ قلم کو مزید کامرانیوں سے نوازے۔
یقیناً ڈاکٹر صاحب ایک قابلِ قدر اثاثہ ہیں۔ دعا گو ہوں کہ اُن کی ذات کا فیض حاصل رہے۔

مختصر آرا:

ناصر زیدی

منور ہاشمی نے اپنے سینے میں حب رسول کو رچا بسا کر اور جذبوں کو مجسم وجاں میں جذب کر کے جو اشعار کہے وہ دور بیٹھے عام نعت گوشعرا سے الگ ہیں۔ ان کے اشعار میں حضوری اور دردِ مجبوری کی کیفیات ساتھ ساتھ ملتی ہیں۔عقیدت،محبت اور والہانہ پن ان کے مصرعے مصرعے سے عیاں ہے۔فنی اور شعری اسلوب ان کا اپنا ہے کہ وہ پختہ گو اور قادر الکلام شاعر ہیں۔قبل ازیں ان کے تین شعری مجموعے شائع ہو کر اہل علم و دانش سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

شمیم جے پوری

منور ہاشمی رسمی طور پر نعت شریف نہیں کہتے بلکہ یوں لگتا ہے نعت ان کے رگ و پے میں بسی ہوئی اور عرض ہنر میں ان کی اولین ترجیح بن چکی ہے۔عجز و انکسار کا جو انداز ان کی نعت میں ملتا ہے،وہ ان کی عقیدت و محبت کا عکاس ہے۔وہ بلاشبہ عشق نبی میں ڈوب کر نعت کہتے ہیں۔ان کے ہاں فن کی پختگی بھی ہے اور فکر کی گہرائی بھی۔۔۔ان کی نعت کا ہر شعر قلب و روح میں اُترتا چلا جاتا ہے۔بعض اشعار تو ایسے ہیں کہ ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد ریاض

منور ہاشمی (کہ جن کا شمار غزل کے اہم ترین شاعروں میں ہوتا ہے) کی نعتیہ شاعری کی یہ کتاب عقیدت،محبت اور عشق کے لازوال جذبوں کی عکاس ہے۔انھوں نے جہاں عقیدت کے انتہائی جذبے پیش کیے ہیں،وہاں مضامین اور موضوعات میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔مجھے امید ہے کہ یہ کتاب عشق و محبت کے صحیفوں میں اپنا مقام ضرور حاصل کرے گی۔

ڈاکٹر منور ہاشمی

بحیثیت غزل گو

منور شاعری

سید ضمیر جعفری

ادب اور فن کے حوالے سے شعری شعور کی بھی تاریخ ہوتی ہے۔ تاریخ ہوگی تو اس کے ادوار بھی ہوں گے۔ مثال کے طور پر اُردو شاعری میں غالب و اقبال شعوری تاریخ کے دو مینار ہی تو ہیں جو اپنے اپنے عہد کی سرحدوں پر کھڑے ہیں ۔میری دانست میں اس اعتبار سے قومی زبان پاکستان کی شاعری شعراء کی تیسری نسل میں سفر کررہی ہے، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اب تک کافی مسافت طے کرچکی ہے۔ شاعر کا شعور غیر شاعر افراد کے مقابلے میں بہت جلد بالغ ہو جاتا ہے۔ اس مسافت کو زمین ''جریبوں'' سے نہیں زندگی کی حیات سے ناپا جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک تو اس عمل کے لیے پیمانہ امروز و فردا بھی ہیچ ہے۔ میرے خیال میں ابوالاثر حفیظ جالندھری، صوفی تبسم، احسان دانش، سید عابد علی عابد اور ان کے ہم عصر پاکستانی شعراء کی پہلی نسل کی نمائندگی کرتے تھے۔

منور ہاشمی ہمارے شعراء کی موجودہ نسل کی پہلی صف کا شاعر ہے۔ مغلوں کی تاریخ کے حوالے سے ہماری آج کی شاعری گویا اکبر اعظم کے زمانے میں جارہی ہے۔ اور اس بات میں کیا شبہ ہے کہ ہمارے شعراء اپنے عہد کو نئے زمین و آسمان فراہم کررہے ہیں۔ یہ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے اور منور ہاشمی کی شاعری آپ کے سامنے ہے۔ جس طرح ہر شخص اپنی صلیب خود اٹھاتا ہے اسی طرح ادب کا ہر قاری اپنا فیصلہ مستقل ہی کرتا ہے۔ نمونے کے طور پر منور ہاشمی کی صرف ایک غزل کے یہ اشعار دیکھیے:

سب کی آواز میں آواز ملا رکھی تھی
اپنی پہچان مگر سب سے جدا رکھی تھی

دوستوں نے سرِ بازار اچھالا مجھ کو
بات جو میں نے ابھی خود سے چھپا رکھی تھی

جانے کس راہ سے آجائے وہ آنے والا
میں نے ہر سمت سے دیوار گرا رکھی تھی

ایک لمحہ مرے آگے نہ رکا وہ منظر
میں نے جس کے لیے بینائی بچا رکھی تھی

''بے ساختہ'' کی ساری غزلوں میں یہی رنگ اور یہی خوشبو موجود ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جس شخص نے اپنے معاشرہ کے لیے خود کوئی کام کیا اسے اپنی خاندانی نجابت کے آسرے یا اشتہار کی ضرورت نہیں رہتی، مگر منور ہاشمی کے بارے میں ہی ''ادبی ریکارڈ'' کے طور پر اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اس خاندان میں علمی فضیلت موسلا دھار رہتی ہے۔ ان کے والد ماجد محترم مخدوم عبداللطیف شاہ مجروحؔ لسانیات کے فاضل، قدیم غزل گو اساتذہ کے نغز گو شاعر ہیں اور برخوردار غضنفر ہاشمی بھی ان کی شاہراہ پر بڑی تیز رفتاری سے اپنے بڑے بھائی کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔

منورؔ ہاشمی کی شاعری کے بارے میں میرا پہلا ذاتی تاثر یہ ہے کہ پہلی محبت غزل سے ہے اور وہ رہی نہیں ہے۔ روایت کی پاسداری وہ کرتا ہے مگر روایت کو اس نے آقا نہیں بننے دیا۔ اس نے جسم اور پیرہن کو غازہ (ڈکشن) کی کرامات سے روشن کیا ہے مگر جسم سے زیادہ روح کو جھنجھوڑا ہے۔ وہ بے حد مؤدب بیٹا ہے مگر شاعری میں اس کا سلوب اتنا مختلف اور نیا ہے کہ اپنے باپ سے بالکل الگ تھلگ راہ پر گامزن ہے۔ اس کے ہاں رومان کم اور ارمان زیادہ ہے۔ ارمان سے میری مراد انسان کے احساسِ محرومی سے ہے۔ اپنے ملک کے عوامی دکھ درد سے ہے۔ زندگی کی چلچلاتی دھوپ سے ہے۔

میں نے بھی چند لمحے گزارے تھے سائے میں
اک عمر اس لئے مجھے سہنی پڑی ہے دھوپ
ہم کو تو موسموں نے تحائف دیئے یہی
اندر بلا کا حبس ہے باہر کڑی ہے دھوپ
تاریکیوں پہ اس کا بھی کچھ بس نہیں چلا
چہرہ چھپا کے رات بھر روتی رہی ہے دھوپ
میں جس طرف بھی جاؤں مرے ساتھ ساتھ ہے
میرے لئے تو اب مرا سایہ بنی ہے دھوپ

اس کی شاعری میں امید کی چھاؤں اور رومان کے سائے ہیں تو سہی مگر ایسے ہی جیسے راولپنڈی شہر میں لیاقت باغ ہو۔ یوں بھی منورؔ ہاشمی کی شاعری میں راولپنڈی ہے اسلام آباد نہیں ہے۔ وہ راولپنڈی کو ہی وطنِ عزیز کے ہر شہر بلکہ ہر قصبے کو اسلام آباد کی طرح روشن اور منور دیکھنا چاہتا ہے۔ باہر ہی سے نہیں اندر سے بھی۔ یہ البتہ اس کی خوش اُمیدی کا کمال ہے کہ اس کی شاعری تمام اندوہ کے باوجود سوکھے پتوں کی شاعری معلوم نہیں ہوتی۔

منورؔ ہاشمی ایک ایسے ادارے سے وابستہ ہیں جہاں شہرت کے ہزاروں مواقع ہیں اور کئی مشہور شعراء اپنی تشہیر میں

منوّر ہاشمی کی معاونت سے انکار نہیں کر سکتے، مگر اس نے خود اس ادارے کو کبھی اپنی شہرت کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔ ویسے بھی ملاح کے حقے میں عموماً پانی نہیں ہوتا۔ چراغ تلے اندھیرے کی مثال کس نے نہیں سنی۔ اس کے باوجود بھی اسے شہرت ملی، تاہم وہ اتنا زیادہ مشہور نہیں ہے جتنا زیادہ معتبر ہے کیونکہ اگر خوبیوں کو سمندر میں بھی پھینک دیں تو جزیرے اُگ آتے ہیں۔ اصل چیز ٹیلی ویژن، ریڈیو پلیٹ فارم یا اداکاری نہیں، اصل چیز لفظ ہے اور لفظ بے آواز نہیں۔ منوّر ہاشمی کی ”منور ہاشمی“ کی کتاب عصری شعری ادب میں بہت زیادہ قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

(دیباچہ شعری مجموعہ ”بے ساختہ“)

منور ہاشمی کی غزل

پروفیسر فارغ بخاری

منوّر ہاشمی کی غزل میں نئے لہجے کی کھنک اپنی بات کہنے کی اُمنگ اور تیکھے اسلوب کے رس کی کرشمہ سازی قاری کو بے ساختہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔اس میں ایسا جادو ہے جو از دل خیزد،، بر دل ریزد کی تاثیر رکھتا ہے۔وہ لفظوں کی شعبدہ بازی کی بجائے مضمون کو شاعری کی اساس سمجھتا ہے۔

خلائی تسخیر کی عصری فتوحات کا پھیلاؤ محض سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی تک محدود نہیں رہا۔اس کے ہمہ جہت اثرات کی خوشبو اگر آج ادب و شعر کی فضاؤں میں بھی محسوس ہو رہی ہے تو یہ ایک ایسا منطقی عمل ہے جو ناگزیر ہے۔ہر دور میں نئی نسل کی ذہانت نے اپنی فلک پیما اڑانوں کو لامحدود وسعتوں سے ہمکنار کرنے میں مخالف ہواؤں کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی کیونکہ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ وقت کے طوفانی دھارے کے آگے کوئی بند نہیں ٹھہر سکتا اور نہ ہی زمانے کے برق رفتار قدم اس کے الٹی زقند بھر سکتے ہیں۔نئی نسل کے جن اعتدال پسند شعراء کو جدتِ فکر کے ساتھ ساتھ ماضی کی مثبت اقدار سے اپنا رشتہ استوار رکھنے کا فخر حاصل ہے۔منوّر ہاشمی کا نام ان کی صفوں میں ایک اہم نام ہے۔اس کی غزل کا نمایاں وصف اس کی عوامی سوچ ہے۔زندگی کی داخلی اور خارجی مسافتوں میں اس نے روزمرہ کے ایسے چھوٹے موٹے تجربات و مشاہدات کو اپنا موضوع بنایا ہے جنہیں عموماً پیش پا افتادہ سمجھ کر درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا اور کمال یہ ہے کہ شاعر کی ہنرمندی نے ان نقوش کو لازوال بنا دیا ہے۔اسی طرح بعض نہایت تلخ طبقاتی المیوں کو بھی وہ اپنے موثر پیرایہ اظہار سے خوش گوار رنگ دینے میں کامیاب رہا ہے۔

(دیباچہ ”سوچ کا صحرا“)

آج کی کتاب: بے ساختہ

ڈاکٹر اسلم فرخی

قدیم شعری لفظیات میں دو اصطلاحیں بہت عام تھیں: آمد اور آورد۔ آمد برجستگی، بے ساختہ پن، ذاتی واردات، تجربے کی گہرائی اور تاثر کا اشارہ تھی۔ آورد سے سجاوٹ، تکلف، کاریگری اور ہنرمندی کا احساس ہوتا تھا۔ اگرچہ شعروشاعری کے حوالے سے ان دونوں اصطلاحوں کا استعمال متروک ہوگیا ہے تاہم میں نے آج کی کتاب یعنی منور ہاشمی کی غزلوں کے مجموعے "بے ساختہ" کا مطالعہ کیا تو اس عنوان کی معنویت سے آمد کی شعری اصطلاح اور اس سے وابستہ مفاہیم کا ایک پورا سلسلہ میرے ذہن میں اُبھر آیا۔ فن کار اپنے مجموعوں کے نام بہت سوچ سمجھ کر منتخب کرتے ہیں۔ منور ہاشمی نے جب اپنی غزلوں کے مجموعے کا نام "بے ساختہ" تجویز کیا تو ان کے ذہن میں برجستگی، تازگی اور تازہ کاری کا تصور ضرور رہا ہوگا اور اسی تصور کے تحت انھوں نے اپنی غزلوں کے مجموعے کا نام بے ساختہ تجویز کر کے قاری کو اپنی غزل کی بنیادی خصوصیات سے خود ہی آگاہ کر دیا ہے۔

غزل اُردو شاعری کی مقبول ترین اور محبوب ترین صنف ہے۔ مقبولیت اور محبوبیت کے باوجود سرد و گرم زمانہ اور منفی تنقید سے بھی گزر چکی ہے مگر سدا بہار اور تازہ کار ہے۔ غزل کہنا بہت آسان بھی ہے اور بہت مشکل بھی ہے۔ آسان اس لیے کہ پھر وہی آورد کی اصطلاح ذہن میں آتی ہے۔ ہزاروں شاعر اپنے اپنے انداز سے سکہ بند غزلیں کہہ رہے ہیں اور مگن ہیں۔ دشوار ہونے کا مسئلہ یہ کہ غزل گو شعرا کے ہجوم اور بھانت بھانت کی بولیوں اور اپنی آواز کی انفرادیت نمایاں کرنا۔ اپنے لہجے کو خصوصی انداز دینا اور اپنی راہ الگ نکالنا واقعی بڑا مشکل کام ہے۔ غزل کے مطالبے بھی بہت سخت ہیں۔ یہ فن کار سے سرخیِ خونِ جگر، سوزِ دل، فکر کے اُجالے اور عشق کے بے کراں اضطراب کی متمنی ہوتی ہے۔ رنگِ نشاط سے سنورتی اور اظہارِ غم واندوہ سے نکھرتی ہے۔ غزل کا دامن بہت وسیع ہے۔ پوری زندگی، پوری کائنات اس کی دسترس میں ہے مگر یہ صرف ہلکا سا اشارہ کرتی ہے۔ کُل کو جز کے پیرائے میں اس طرح پیش کرتی ہے کہ "آئے ہے جُز میں نظر کُل کا تماشہ ہم کو"

منور ہاشمی نے اپنے طور پر غزل کے مطالبوں پر لبیک کہا ہے اور آج کی غزل میں ان سے عہدہ برا ہونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ اپنے عہد کے ذہنی اور روحانی اضطراب کے ترجمان ہیں:

موت کی راہوں پہ ہم اکثر سفر کرتے رہے
زندگی کی منزلیں اس طرح سر کرتے رہے

موت کی راہوں پر سفر آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بڑا حوصلہ اور ہمت چاہیے۔ منور ہاشمی میں یہ ہمت اور حوصلہ ہے۔ شاید اس لیے انھوں نے کہا ہے:

صورتِ شمع پگھلتا رہوں لمحہ لمحہ
میں منوّر ہوں اندھیرا نہیں چھانے دیتا

یہ محض تخلص سے فائدہ اٹھانے کی بات نہیں۔ منور ہاشمی کے شعری مزاج اور خصوصیت کا سچا اظہار ہے۔ ان کی کیفیت کا اندازہ ایک اور شعر سے ہوتا ہے:

اک دھوپ کی چادر ہے ہر اک شخص کے سر پر
میں سب سے جدا اپنے ہی سائے میں کھڑا ہوں

یہاں بھی منور ہاشمی کی انفرادیت اور عزم دونوں نمایاں ہیں۔ ان کے لہجے میں نیا پن ہے۔ میں نے جب ان کا یہ شعر پڑھا:

جو بات دل میں ہے ہونٹوں پہ آ نہیں سکتی
ہماری سوچ کسی اجنبی کی قید میں ہے

تو اجنبی کی قید میں سوچ کے آلام اور مجبوری کی ایک پوری تصویر بھی ذہن میں اُبھری اور لہجے کی ندرت کا احساس بھی ہوا۔ مگر عزم و ہمت کے باوجود منور ہاشمی نورمحبت کے شاعر ہیں۔ اُن کے یہاں تشنگی کا بڑا عجیب احساس ملتا ہے۔ وہ تشنگی جو صرف چاہنے والے کا مقدر نہیں تھی:

میں بھی پابندِ انا تھا وہ بھی مجبورِ خودی
میں بھی پیاسا رہ گیا اور وہ بھی پیاسا رہ گیا

بڑا عجیب تاثر ہے اور اس شعر میں تو یہ تاثر اور زیادہ گہرا ہو گیا:

وہ چاند تھا تو منوّر یہ فرض تھا اپنا
ہمارے گھر میں بھی کچھ دیر روشنی ہوتی

روشنی ہوتی تو تشنگی ختم ہو جاتی مگر اندھیرا بھی چھا گیا اور تشنگی بھی برقرار رہی۔ شاید برقرار ہی رہے۔ بہرحال ”بے ساختہ“ غزلوں کا ایسا مہکتا ہوا گلدستہ ہے جو نظر نواز بھی ہے اور مشامِ جاں کو معطر کرنے کا وسیلہ بھی ہے۔ غزل کا دامن ایسے ہی مجموعوں سے مالا مال ہوتا ہے۔

(ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر ہوا)

منفعل اَنا کا شاعر: منور ہاشمی

ڈاکٹر عطش درانی

منور ہاشمی سے ہماری جان پہچان کو پندرہ بیس برس گزر چکے ہیں۔ ہم اس کے شاعر ہونے سے بھی واقف ہیں لیکن نہ کبھی اس نے اپنے شعر سنانے کی فرمائش کی، نہ اس میں ایسا روایتی شاعروں کا سا چسکا پایا گیا جب کہ ہم ایک زمانے میں شاعروں کو داد دینے میں ''معروف'' تھے۔ یہ داد اتنی بڑھ جاتی تھی کہ اکثر بے داد ہو جایا کرتی۔ ایک مرحوم شاعر ہماری اس داد بے داد کے بہت گرویدہ تھے اور اتنے پکے پینڈے شاعر تھے کہ جب ہم ترنگ میں آ کر ان سے فرمائش کیا کرتے کہ ذرا ساتویں شعر کے مصرع اولیٰ کو اٹھارویں شعر کے مصرع اولیٰ کے ساتھ ملا کر پڑھیے، واہ کیا نیا مضمون بنتا ہے، کمال ہے، واہ واہ! تو وہ یہ بھی کر دیا کرتے مگر ہاشمی سے تو ہمیں اس بارے میں مایوسی تھی جب کہ ان محفلوں کے شریک وہ بھی تھے اور کبھی کبھار میرے ہاں اپنا کلام سنایا کرتے مگر وہی پانچ سات شعروں کا روایتی غزل کا پیمانہ۔

شاید منور ہاشمی شاعری کو ذریعۂ عزت نہیں گردانتے۔ اپنے اس ہنر کو یوں لوگوں سے چھپا چھپا کر رکھتے ہیں جیسے کوئی جرم کر بیٹھے ہیں۔ کچھ شرمندہ شرمندہ سے، کچھ منفعل سے:

کہاں یہ تیرا ہاشمی ، کہاں یہ شعروشاعری
کسی نے نام لکھ دیا ہے شاعروں کے درمیاں

گوشۂ عافیت ہے گمنامی
کوئی میرا پتا نہ لے جائے

منور کا یہ انفعالی جذبہ ان کی شاعری میں بھی در آیا ہے۔ اگر چند لفظوں میں ان کی شاعری کا جائزہ لینا ہو تو جہاں خلوص اور سادگی کے حوالے سے وہ تلاشِ ذات کا شاعر نظر آتا ہے، وہاں ذات کی انفعالیت بھی ظاہر ہوتی ہے مگر ایسی انفعالیت جو من و تو کا امتیاز بھی برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ ادراک ذات کا تسویہ بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے اور کسی کی ذات میں کھو جانا بھی بنیادی خواہش ہے مگر اسی انفعالت کے ساتھ:

میں نے چاہا تھا کہ خود اپنی بناؤں قسمت
میں بناتا جو کوئی مجھ کو بنانے دیتا

میں اپنے واسطے لمحہ کوئی بچا لیتا
اسی پہ عمر کی تعمیر ہوگئی ہوتی

دستک دیتے ہاتھ مرے دروازے پر
اور کسی کے کب ہیں، میرے اپنے ہیں

وہ ایک دور تھا جب ہم بھی عشق کرتے تھے
وہ دور خواب ہوا اور وہ خیال گیا

کون دہلیزوں پہ اپنا سر پٹختا رہ گیا
تم ذرا بامِ تکبر سے اتر کر دیکھتے

وہ جفاکار بھی اکیلا ہے
جھیلتا میں بھی ہوں ستم تنہا

کل ایسا اتفاق تھا گھر میں بھی کچھ نہ تھا
اچھا ہوا کہ وعدے سے تم بھی مکر گئے

میں اپنے شہر میں اپنے ہی گھر نہیں پہنچا
کسی سے مجھ کو ملا ہی نہیں پتا میرا

ان شعروں میں انفعالیت کے ساتھ ساتھ جو ایک دبی دبی سی انا کی تسکین ہے، وہ کہیں کہیں شدید انا پرستی کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے۔ ایسی انا پرستی جو ہر شے کو تہس نہس کر دینے سے بھی نہیں چوکتی بلکہ اپنی شکل بھی بگاڑ لیتی ہے:

اپنے ہاتھوں سے اڑا دیتا ہوں مٹی اپنی
کوئی آندھی، کوئی طوفاں نہیں آنے دیتا

مجھ کو دل کی دھڑکنوں کے ساتھ رکھ
یا مرے سینے میں تو دھڑکا نہ کر

اک دھوپ کی چادر ہے ہر اک شخص کے سر پر
میں سب سے جدا اپنے ہی سائے میں کھڑا ہوں

تاہم اس شدتِ انا پرستی میں بھی خلوص اور بے ریائی کی خواہش اس کا وتیرہ ہے۔ منافقت، جھوٹ اور ریا کاری اس کے شعری فکر میں کرب اور تکلیف دہ صورت میں نمایاں نظر آتی ہے۔ معاشرے میں اردگرد یہ چلن دیکھ کر ان کی نشاندہی

بھی کرتا ہے مگر جلد ہی اپنے اس منفعل رجحان کے باعث اس میں بھی اپنی انا بگاڑنے پر تل جاتا ہے:

عہدِ ریا میں ہم کیوں مخلص بنتے ہیں
ہم ہی برے ہیں لوگ تو سارے اچھے ہیں

وہ کہتے ہیں منافق بن کے رہنا
اسی صورت پذیرائی بڑھے گی

تری ہر بات کیسے مان جاؤں
تری ہر بات کے پہلو بہت ہیں

وہ بارسوخ ہے مجھ کو سزا دلا دے گا
مرے خلاف اگرچہ کوئی گواہ نہیں

دراصل منور ہاشمی اپنی شاعری میں ایک ایسے مثالی شخص کو تلاش کرتا نظر آتا ہے جس میں انسان کامل کی تمام صفات موجود ہوں، جس کا نقشہ کسی حد تک برگساں نے کھینچا ہے یعنی جو خلوص و بے ریائی میں بھی کامل ہو۔ مکمل انفعالیت اور سپردگی بھی رکھتا ہو اور جور و تعدی میں بھی پورا ہو۔ جو چھا جائے حلول کر جائے، جو قبول بھی کرلے اور مقبول بھی ہو جائے۔ منور کے نزدیک ایسا فرد ابھی خیال ہے۔ وہ اس خیال کا سامنا کرنا چاہتا ہے۔ اپنی ذات کے حوالے سے اسے دیکھنا چاہتا ہے اور اسی کے آئینے میں خود کو اسی مثالی فرد کا پرتو سمجھتا ہے۔ یہ کامل شخص اس کی اپنی اسی منفعل انا کا مثالیہ ہے جسے وہ محبوب سمجھتا ہے۔ اسی ایک محبوب کو وہ کثیر شکلوں میں دیکھتا ہے مگر کسی شکل میں اس کا محبوب بجا طور سے جلوہ گر نہیں ہوتا۔ مایوس ہو کر وہ کہتا ہے:

میں جس کے واسطے ملبوسِ حرف بُنتا ہوں
وہ اک خیال ابھی ذہن میں بھی آیا نہیں

ہزار گزرے حسین جن میں عکس تھا تیرا
تری طرح کا کوئی ہو بہو نہیں گزرا

جس کو دیکھا نہیں ابھی میں نے
اس کے بارے میں سوچتا ہوں میں

وہ پہچانے نہ پہچانے مگر میں
مقابل اس کے ہونا چاہتا ہوں

ایسے تمام شعروں کے تقابلی مطالعے سے یہ بات بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ شاعر کو اپنی اس منفعل انا کا ادراک بھی ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا مثالی شخص وہ خود اپنی ذات میں تلاش کرتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اس مثالی شخص کو دوئی میں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ گویا خود کو دوسرے آئینے میں دیکھنے کی خواہش اور اس خواہش کی تکمیل میں ناکامی، جھنجھلاہٹ اور ہر شے کو تہس نہس کر دینے کا ارادہ نیرو کی بنسری سے لے کر ہٹلر کی قیادت تک ہر ایسے ابنارمل کارنامے میں نظر آئے گا۔ یہی منور ہاشمی کی شاعری کا حاصل ہے۔ فرق صرف ارادے اور عمل کا ہے۔ شاعر صرف خواہشات اور ارادوں تک محدود ہوتا ہے اور سیاست دان اور حکمران عملی اقدام تک چلے جاتے ہیں۔ شاعر صرف ان نفسیاتی ادراکات کو محسوسات میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ عمل کی خواہش نہیں رکھتا کہ ایسی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ وہ اپنی انا کے بگاڑ کی تصویر کھینچتا اور اسی تصویر کاری میں مگن رہتا ہے مگر غیر شاعر محسوسات کو محاکات کی بجائے عملیات کی روشنی میں دیکھتا اور معاشرے کی شکل بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ''سوچ کا صحرا'' سے ''بے ساختہ'' تک منور ہاشمی کا شعری سفر صرف اسی منفعل انا کے ادراک کی شدت کو ظاہر کرتا ہے اور یہی اس کی شاعری کا حاصل ہے اور اس کی پہچان کا سبب بنتا ہے۔

(مطبوعہ: سہ ماہی ''انشاء'' حیدرآباد، شمارہ ۱۰، ۱۱)

غزل کا جہانِ نو

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھارت)

منوّر ہاشمی اس حد تک خارجی نظریہ نہیں رکھتے جس قدر وہ نظر آتے ہیں بلکہ ہر اس منظر کا ایک حصہ بن جاتے ہیں جس کا وہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ثقافتی معانی کے کسی مطالعے کے لیے چاہیے کہ کسی مفروضے، انتخاب کے عمل اور بعض طرح کے پہلے سے بتائے ہوئے فیصلہ جات سے آغاز کیا جائے، نہیں تو امکانی مفروضات کے ہجوم میں سے کچھ بھی نہیں پایا جا سکتا۔ منوّر ہاشمی اپنی involvement کے بارے میں ہمیشہ صاف اور واضح رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی میں ان کی غزلوں کی انفرادیت پوشیدہ ہے۔ وہ indigement values کو Reading for values سے الگ رکھنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں اور بڑی سنجیدگی سے فکر کے نظام اور آرٹ کے اہرام تعمیر کرتے ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے سوچنے کے نئے ڈھنگ اور اظہار کے نئے سانچے تلاش کیے ہیں:

اب اس کے بند کواڑوں کے پاس بیٹھ رہیں
جو شخص گھر سے گیا ہے وہ گھر بھی آئے گا

گر حرفِ غلط ہے تو منور کو مٹا دو
لیکن یہ اُجالا جو اسی نام سے آیا

کہتا ہے زمانے کی نظر ٹھیک نہیں ہے
آئینہ کبھی اس کو سنورنے نہیں دیتا

جونہی دیکھا اسے ساحلِ آب پر، آب میں جھانک کر
میں اشاروں سے اس کو بلاتا رہا، چاند چپ ہی رہا

کوئی اولاد کو بیچے منور کیسے ممکن ہے
میں زندہ ہوں مری غزلوں کا سودا ہو نہیں سکتا

منوّر ہاشمی کی غزلوں میں اسلوبِ سخن اور پیرایہ اظہار کے ایک جہانِ نو، ایک نئی فضا اور تخیل و تفکر کی نئی وسعتوں کا سراغ ملتا ہے۔ ان کا سوچتا ہوا لہجہ ان کے پاس ہونے والے واقعات کی اندرونی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔ گیر اور ملک گیر اُن کے مشاہدہ کی گرفت میں حسنِ بتاں نہیں بلکہ سلگتا ہوا تکتا پہ بھی ہے۔

اپنے اپنے آشیانوں میں پرندے دیکھ کر
خون ہو جاتا ہے میری حسرتِ تعمیر کا

سنتا رہتا ہوں اذانوں پہ اذانیں لیکن
دل کسی طور نہیں ہوتا مسلماں میرا

جن کو اک عمر کا نذانہ دیے بیٹھے ہیں
آج تک ان سے تعارف بھی مفصل نہ ہوا

پھیلا ہوا ہے چار سو جنگل حیات کا
مل جائیں ایک دو بھی جو انسان ہیں بہت

دن کے تین پہر میں جس کے سر پہ پاؤں رکھوں
شام کے وقت میں اس مٹی کے تودے میں دب جاؤں

آج اکیسویں صدی میں مابعد جدید عہد نامہ کی یہ سنگینی ایک تلخ حقیقت ہے اسی لیے منوّر ہاشمی کا لہجہ کہیں کہیں پر تیکھا اور بیباک ہو گیا ہے۔لیکن انسان سے محبت اور زندگی کے اتار چڑھاؤ کی کرب ناکی کو بیان کرتے وقت وہ پامال اور اوراق پارینہ ہوتے ہوئے انسانی شرف کو بھی مدِ نظر رکھتے ہیں۔انداز فکر میں ندرت اور جدت کے ساتھ پیار محبت کے تصورات اور انسانی بازی گری کو نمایاں کرنے میں وہ منفرد ہیں۔

اس کو تباہ کرنے کے در پے ہے تیرا شہر
وہ ایک گھر جو میں نے بسایا نہیں ابھی

منزل کی سمت بھی ہے زمانوں کا فاصلہ
گھر سے چلے ہوئے بھی زمانے گزر گئے

عام طور پر ذاتی تجربے اور مشاہدے اور اندرونی مطالعے سے اقدار کا رشتہ حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس طرح کی تخلیق یا شاعری یا غزلیں اپنی معاصر زندگی کے بارے میں کیا کہتی ہیں اور اپنی ذاتی شخصیت کے لیے وہ کن باتوں کا معتقد ہے۔اس طرح سے Quality of Life جیسے مشتبہ فقرے سامنے آتے ہیں۔یہ مشکوک اس لیے ہے کیونکہ لوگ اکثر سوچتے ہیں کہ آدمی کے پاس مختلف رجحانات کا تجزیہ کرنے کے لیے ایک کسوٹی ہے اور نہ اس Quality کے لیے اسی کسوٹی کے مطابق نمبرات ہیں ،لیکن منوّر ہاشمی کی طرح غزلوں میں ایک اچھا ادبی اور ثقافتی تجزیہ Quality of

Life کو بیان کرنا ہے، اور اچھی طرح سے یہ دریافت کرنے کی کوشش ہے کہ زندگی کا مزاج، احساس یا Fabrics تصنیف یا شاعری میں کس طرح گتھا ہوا ہے۔ منوّر ہاشمی کی غزلوں کے مطالعے کے مفروضے طے شدہ ہیں کیونکہ ان کے مشاہدے اور تجربے بالکل عیاں ہیں۔ کہیں کہیں اضافی صورت بے معنی بھی لگتی ہے لیکن منوّر ہاشمی استعارے سے کام لیتے ہیں:

چشمِ آہو اور ہے اس کی کہانی اور ہے
جس میں مَیں رہتا ہوں چشمِ آسمانی اور ہے

خیر ہو اپنی انائے تشنگی کی خیر ہو
پیچھے پیچھے شہر کے جام و سبو پھرتے رہے

ایک جانب ہے حرم اور اک طرف سب کچھ حرام
جانے کیا کیا شاہی مسجد کا منارہ سوچتا ہے

مخصوص سادگی اور سیدھی سادی ترکیبوں میں پھول اور پتھر کے سمندر موج زن ہیں۔ منوّر ہاشمی تجربے سے ایک اہم اور منظم کل ترتیب دیتے ہیں اسی لیے ان کی ساری رنگینیٔ خونِ دل میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ انہوں نے ہر چہار سمت کے درد کو سمیٹ کر اپنے دل کو ایک گلابی میں بھر لیا ہے۔ ان کی غزلیں اندروں بینی کی تفسیر ہیں اسی لیے تغزل میں نازک شبنمی پیرائے فن کی بلندی اور استواری کا خیال دلاتے ہیں۔ ان کے یہاں روایتی عشق و عاشقی کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ دراصل نازک جذبات اجاگر کرنے کا ذریعۂ اظہار ہے۔ اسلوب کی سادگی اور تازہ کاری نے خالص تاثراتی فضا قائم کرنے کی عمدہ مثال پیش کی ہے:

آنکھ کی خیرگی یہ کہتی ہے
کوئی شعلہ تھا، نور تھا، کیا تھا

وہ سراپا حسن ہے اور میں سراپا عشق ہوں
ساز سے دل اس کا میرا سوز سے معمور ہے

اس کی نظر کا رنگ نظر میں ملالیا
اپنی نظر سے خود کو گرانے کے واسطے

اک جانِ جاں تھی آئی اور آ کر چلی گئی
اک جان تھی لبوں پہ اڑی دیکھتی رہی

شجر درد سے رشتہ جوڑنے اور پیار کے بندھن سے وابستہ رہنے والے منوّر ہاشمی کے آشنا دل نے عشق کے فلسفے کو کئی روپ عطا کیے ہیں۔ عشق کی جلوہ سامانیوں اور عشق کے نئے امکانات وآفاق کے سلسلے میں ان کا نظریہ جداگانہ ہے۔ مادی اور زمینی عشق کا پرتو دیکھیے:

اک جستِ عشق لے گئی افلاک سے پرے
گردش زماں کی ٹھہری گھڑی دیکھتی رہی

عشق دنیا پہ عنایات کیے جاتا ہے
کس کو کرنے ہیں یہ سب قرض ادا میرے بعد

مثالِ طائرانِ سادہ دل ہیں ہم بھی عشق میں
کہ دانہ دانہ رزق جن کے حق میں دام ہوگیا

منوّر ہاشمی کی غزلوں میں نفسیاتی تجزیہ بدرجہ اتم ملتا ہے اور ادراکِ حقیقت کے طریق کار میں جرأت پرواز نمایاں ہے:

روز گرے اک خواب عمارت ملبے میں دب جاؤں
صدیوں کی دیواریں پھاندوں لمحے میں دب جاؤں

لازم ہے ایسے دوستوں کی ہم مدد کریں
جو ایک ایک بات پہ سب سے حسد کریں

میں تیری طلب میں تھا مگر میری طلب میں
اڈ آیا تھا اک شہرِ جفا تیری گلی میں

میری وفا کا ہر گھڑی رہتا ہو منتظر
میں دوست ایسے شخص کو گردانتا نہیں

اذان روح کے معبد میں ہو بلند کوئی
یہاں صلوٰۃ کا ساماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اُردو غزل کے تمام سرمائے میں اداسی اور کرب کا حوالہ نمایاں ہے۔ منوّر ہاشمی کی غزلوں کی چمک، جذبہ، قوت

حرارت اور پیغام حیات میں مضمر ہے۔ آشوب آگہی اور روح عصر کی فکری توجیہ سے مرصع ان کی غزلیں نئے جہان اور زندگی کی نئی تعبیر کا حوالہ ہیں۔ روابط اور رشتوں کی نوعیت، بدلے ہوئے نظام اور عمل اور ردِ عمل کے سلسلے کے نئے پیمانے اور سانچے کی وجہ سے ان کی غزلوں میں راہیں الگ نظر آتی ہیں۔ نمایاں جدت طرازی اور تنوع کے ساتھ ساتھ غزل کی منجھی ہوئی روایت کا نکھار صد کیف بداماں ہے:

حسرتیں ، ناکامیاں ، مایوسیاں ، محرومیاں
بے دلی ، بے چارگی ، افسردگی اے زندگی

شر آدمی کے ساتھ ہے وابستہ اس قدر
شامل یہ لفظ جس قدر لفظِ بشر میں ہے

وہ ایک شخص میری زندگی اجال گیا
یہ اور بات کہ خود مجھ کو بھول بھال گیا

منور ہاشمی قنوطی شاعر نہیں ہیں بلکہ انہیں فن کی بلندی اور استواری کا خیال رہتا ہے۔ وہ ناکامیوں، بے رحمیوں اور کرب آمیزیوں سے اپنی شخصیت سازی کا کام لیتے ہیں۔

منور ہاشمی کا نیا مجموعۂ کلام ــــــ ''بے ساختہ''

ڈاکٹر محمود الرحمٰن

موجودہ دور میں جن حوصلہ مند شاعروں نے کشتِ غزل کی آبیاری میں خود کو کھپا رکھا ہے، ان میں منور ہاشمی بھی پیش پیش ہیں۔غزل اپنی تمام بدنامیوں اور نام نہاد نقادوں کی نظر اندازیوں کے باوجود اوج وعظمت کا جادو اس طرح جگا رہی ہے کہ کروڑوں سامعین و قارئین میں کسی کو معریٰ نظموں کا ٹکڑا بھی یاد نہیں رہتا جبکہ اس کے اشعار ان کے ذہن و دل پر حکومت کر رہے ہیں۔''وحشی صنفِ سخن'' قرار دی جانے والی غزل اس ٹیکنالوجی کے دور میں وحشت زدہ انسان کو صبر و سکون عطا کر رہی ہے۔ذہنوں کی پراگندگی، دلوں کی الجھنیں اور روحوں کی بے تابیاں غزل کی نغمگی سے کالعدم ہوتی جا رہی ہیں۔ یہی دراصل غزل کا معجزہ ہے اور اس معجزے کی شان منور ہاشمی کی غزلوں میں اس طرح در آئی ہے کہ:

مثالِ نور منور بکھر گیا ہر سُو
وہ ایک چاند تھا اور آسماں سے اُترا تھا

منور ہاشمی نے غزل کے مزاج کو اچھی طرح پرکھا ہے۔ پھر پرکھ کر اپنے مزاج میں ڈھالا ہے، روایتی انداز میں نہیں، نفسیاتی و تجرباتی انداز میں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل گوئی میں ایک انفرادی پہلو نمایاں ہے، اپنا ایک خاص انداز ہے، اپنی ایک جدا آواز ہے، ان تمام عناصر نے شاعروں کی اس بھیڑ میں اس کم گو، شرمیلے اور شہرت پسندی سے کوسوں دور بھاگنے والے شاعر کو گم نہیں ہونے دیا۔ بلکہ بھرپور انداز میں متعارف کروا دیا ہے۔نہ چاہنے اور سلوک و معرفت کے حجرے میں بند رہنے کے باوجود اس سیدزادے کی شہرت طشت از بام ہو گئی ہے۔وجہ؟

سب کی آواز میں آواز ملا رکھی ہے
اپنی پہچان مگر سب سے جدا رکھی ہے

باہم دگر ہونے کے باوجود اپنی پہچان جدا رکھنا نہایت مشکل کام ہے۔اس کے لیے بڑا ریاض کرنا پڑتا ہے، خونِ جگر کی قندیل جلانی پڑتی ہے، پلکوں کی نمی سے ترشح کرنا پڑتا ہے، فکر کی بھٹی میں جلنا پڑتا ہے، تب کہیں جا کر یہ''رنگِ دگر'' نمایاں ہوتا ہے، شعر میں تڑپا دینے والی کیفیت پیدا ہوتی ہے، قارئین کو مسحور کر دینے کا فن جاگتا ہے اور پھر فکر کی اس بلندی ، لہجے کے نیاپن، آواز کی انفرادیت اور غزل گوئی کی رعنائی کے باعث معتقدینِ منور کو یہ کہنا پڑتا ہے:

تم کیا گئے اے ہاشمی سب ہاتھ کٹ گئے
بے شک تمھاری موت ہے دنیائے فن کی موت

میں نے جب عالمِ بے ساختگی میں''بے ساختہ'' پر نظر ڈالی تو ہر ہر لمحے چونکنا پڑا۔ایک ایک شعر دامنِ دل کھینچتا

رہا۔ مجموعے کی تخلیق کے پس پردہ منور ہاشمی کا خلوصِ فن، شعور و آگہی، مشاہدات کی مہریں، تجربات کے شعلے اور وفا کے دلفریب جھونکے محسوس ہوتے رہے۔ ۱۵۰ صفحات سے بھی کم اس شعری مجموعے نے مجھے نہال کر دیا۔ اس کی تمام تر وجہ یہ اشعار ہیں جو مجھ جیسے ''کتابی کیڑے'' کو کہیں اور نہ ملے:

ہم کو تو موسموں نے تحائف دیے یہی
اندر بلا کا حبس ہے، باہر کڑی ہے دھوپ
نہ پھول ہیں ،نہ شگوفے مگر درختوں پر
جو اڑ گئے تھے پرندے وہ لوٹ آئے ہیں
اک قافلہ تھا ساتھ مرے جانے کیا ہوا
سب لوگ اک مقام پہ رستہ بدل گئے
اک دھوپ کی چادر ہے ہراک شخص کے سر پر
میں سب سے جدا اپنے ہی سائے میں کھڑا ہوں

منور ہاشمی اور غزل

شبنم شکیل

غزل ایک جل پری ہے جسے اپنی گرفت میں لینے کے لیے شاعر تگ ودو میں مصروف رہتا ہے مگر یہ جل پری کسی کے ہاتھ نہیں آتی اور اکثر ہاتھ میں آ کر پھسل جاتی ہے۔ کسی کو اس کا ذرا سا لمس میسر آ جائے تو وہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت گردانتا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو، اس لمس کی وجہ سے بڑے بڑے شعر سرزد ہوتے ہیں، وہ تغزل نصیب ہوتا ہے جس کی تلاش میں مدتیں گزر جاتی ہیں۔ یہ جل پری کا کمال ہے کہ بڑے بڑے شعرا منظر پر آ گئے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض اوقات یہ جل پری خود ہی کسی کے دامن میں آ گرتی ہے، ایسا کسی بہت بڑے خوش نصیب کے ساتھ ہوتا ہے۔ آج کے منظر نامے پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہ خوش نصیب منور ہاشمی کے نام سے ہمارے سامنے موجود ہے۔ منور ہاشمی ایک ایسا شاعر ہے جو غزل کو مکمل طور پر میسر ہے۔ وہ حقیقی شاعر ہے۔ غزل بھی اسے اس طرح میسر ہے جیسے اس کی پہلی محبوبہ ہے۔ دونوں کی ملاقات پر شعروں کے پھول کھلتے ہیں، محبت کی باتیں ہوتی ہیں، ساتھ نبھانے کے پیمان ہوتے ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ یہ عہد و پیمان پکے ہیں، کبھی ٹوٹنے والے نہیں ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عام شاعر، ایک مشاعرے میں غزل سن کر خوش ہو جاتا ہے، اسے ملنے والی داد اس کے لیے سرمایۂ زندگی بن جاتی ہے مگر منور ہاشمی کا معاملہ دوسرا ہے۔ اسے طمانیت اور مسرت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ ایک اچھی اور معیاری غزل کہہ لیتا ہے۔ مشاعرہ اس کا مسئلہ نہیں ہے، یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ اگر مشاعرہ منور ہاشمی کا مسئلہ ہوتا تو اسے اس مسئلے کے حل کے لیے ایک بہت بڑا میدان میسر تھا یعنی وہ ریڈیو پاکستان میں ایک ایسے عہدے پر فائز تھا کہ اپنے آپ کو شاعروں ادیبوں اور عوام میں مشہور کرنے کے لیے بے شمار مواقع موجود تھے۔ ہر گلوکار منور ہاشمی کی غزل گا رہا ہوتا اور تنظیمیں اس کے اعزاز میں روزانہ مشاعرے منعقد کروا رہی ہوتیں مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اپنے عہدے سے کوئی اس قسم کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ غزل کہتا ہے اور خوب کہتا ہے "بے ساختہ" اس کا تیسرا شعری مجموعہ ہے جس میں اس نے اپنی محبوبہ یعنی غزل سے پیمانِ وفا نبھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ "بے ساختہ" کی غزلیں آسان، سادہ مگر معنویت سے بھرپور ہیں۔ عصرِ حاضر کے اُردو شعرا میں یہی اس کا امتیاز ہے کہ اس نے الفاظ کی بجائے معنی کو اہمیت دی ہے۔ اس کی غزل اس کے دل سے نکلتی ہے اور قاری اور سامع کے دل میں اُتر جاتی ہے۔ یہ ایسی غزل ہے جو کلاسیکی رنگ کے باوجود جدید غزل ہے یعنی دونوں سوالوں کا جواب ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ آج کے دور میں کلاسیکی غزل کون سی ہے تو جواب میں منور ہاشمی کی غزل پیش کی جا سکتی ہے اور اگر کوئی جدید غزل کے بارے میں سوال کرے تو جواب میں منور ہاشمی کی غزل ہی پیش کی جائے گی۔ یہ اعزاز شاید کسی شاعر کو میسر نہیں۔ اس کے علاوہ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ آج کی غزل کو کیسا ہونا چاہیے تو میں برملا کہوں گی کہ آج کی غزل منور ہاشمی کی غزل جیسی ہونی چاہیے۔ بہرحال یہ منور ہاشمی کا اعزاز ہے اور میں اس اعزاز پر اسے مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

(شعری مجموعہ "بے ساختہ" کی تقریبِ رونمائی [۱۹۹۵ء] میں پڑھا گیا)

زندہ رہنے والی غزل کا شاعر

ڈاکٹر احسن جمال (بھارت)

گزشتہ ربع صدی میں جن شاعروں نے اردو غزل کو حقیقی معنوں میں آبرو بخشی ان میں منوّر ہاشمی کا نام بہت نمایاں ہے۔ وہ پاکستانی شعرا کی صفِ اول کے شاعر ہیں۔ اس سے قبل ان کے مجموعہ ہائے کلام میں سے دو میرے مطالعہ سے گزر چکے ہیں۔ ان کی شاعری میں سلاست، روانی اور بے ساختگی بدرجہ اتم موجود ہے۔ گویا میر تقی میرؔ نے غزل کی جو تعریف کی تھی منوّر ہاشمی کی غزل اس پر پوری اترتی ہے۔ ان کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہی وہ غزلیں ہیں جو ہر دور میں تروتازہ اور جدید رہیں گی۔ میں اس ضمن میں محترم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی رائے سے مکمل اتفاق کرتا ہوں جو انہوں نے منوّر ہاشمی کے گزشتہ شعری مجموعے "بے ساختہ" کے فلیپ پر تحریر فرمائی:

> "غزل کی روایت ایک قدیم اور توانا روایت ہے جس میں اپنی الگ پہچان ظاہر کرنا قریب قریب ناممکن ہے لیکن منوّر ہاشمی نے غزل میں اپنی انفرادیت ظاہر کر دی ہے۔ وہ روایت پرست نہیں ہے اس لیے اس نے غزل کے بندھے ٹکے لہجے میں بھی اپنی شخصیت کا الگ رنگ دکھایا ہے:

سب کی آواز میں آواز ملا رکھی ہے
اپنی پہچان مگر سب سے جدا رکھی ہے

غزل کے روایتی سانچوں میں عموماً ہمارے شاعر اپنے آپ کو گم کر کے اپنی شعری توانائی کو بحال نہیں رکھ پاتے۔ منوّر ہاشمی حرماں نصیبی کا شاعر ہے لیکن انسانی نفسیات سے گہری واقفیت کی بنا پر اس نے جذبوں کی جو دنیا آباد کی ہے۔ وہ ہماری عمومی دنیا سے مختلف ہے۔ اس کا طرزِ احساس جدیدیت کی ایسی چمک رکھتا ہے جس نے اس کی غزلوں کو ایک نیا حسن، نیا آہنگ اور نئی طرزِ فکر سے آشنا کیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی اس وقیع و معتبر رائے کے بعد اگرچہ کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی تاہم ان کی شاعری کے بارے میں جناب افتخار عارف کی رائے درج کرنے میں کوئی حرج نہیں:

> "منوّر ہاشمی ہماری جدید ترین غزل کے نمایاں اور مختلف طرزِ احساس رکھنے والے نمائندہ شعرا میں بہت اہم گردانے جاتے ہیں۔

یہ ان آوازوں میں نہیں جو شور میں گم ہو جانے کے خطرے سے دوچار ہوں کیونکہ یہ آواز اپنی الگ پہچان بنا چکی ہے۔ اتنی آوازوں کے ہجوم میں ہم کسی آواز کی طرف یونہی متوجہ نہیں ہو جاتے، کوئی جادو ہوتا ہے جو ہمیں کھینچتا ہے، کوئی خاص منظر ہوتا ہے جو ٹھہرنے پر مجبور کرتا ہے۔ کوئی پھوار کہیں دھیرے دھیرے نغمہ خواں ضرور ہوتی ہے جو ٹھہرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ منوّر ہاشمی تازہ خیال، تازہ فکر اور تازہ دم شعرا کی صف تازہ تر کی نمایاں تر آواز ہے۔ غزل میں لفظ لکھے نہیں جاتے ان کو روشن کیا جاتا ہے اور منوّر ہاشمی لفظ کو روشن کرنے کے ہنر سے آگاہی رکھنے والوں میں بہت اہم نام ہے"

محترم افتخار عارف نے منوّر ہاشمی کی غزل کا انتہائی مختصر مگر جامع تجزیہ کر دیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ایسا کلام جو تغزل، شعریت اور معنویت کے امتزاج سے وجود میں آتا ہے، وہی زندہ رہنے والا کلام ہوتا ہے۔ اور یہ خوبیاں حسین امتزاج کے ساتھ جس طرح منوّر ہاشمی کی غزل میں پائی جاتی ہیں کہیں اور شاید نظر نہ آسکیں۔ اس لیے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ جب تک اُردو زبان ہے منوّر ہاشمی کی غزل زندہ رہے گی۔

میں یہ بات بھی دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ لمحۂ موجود میں لکھی جانے والی غزل کے تنقیدی مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں اگر کوئی غزل ہیئتی اور صنفی تقاضوں کے عین مطابق ہے تو وہ منور ہاشمی کی غزل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان سے بہتر غزل کہیں نظر آتی ہے۔ جواں سال شاعروں نے غزل میں نئے مضامین سمونے کی بھرپور کوشش کی ہے مگر وہ روایت شکنی کے شوق میں غزل کی اس روح سے بھی دور ہو گئے ہیں جو غزل کے اصل علم برداروں بالخصوص میر تقی میر اور اسد اللہ غالب نے غزل کے جسدِ لاغر میں پھونک دی تھی بلکہ میں کہوں گا کہ غزل میر کی وراثت ہے۔ یہ کھیلنے اور ضائع کرنے کے لیے نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کھلواڑ کرنے کا مطلب میر کی امانت میں خیانت کرنے کے مترادف ہے۔ یہ ایک قبیح جرم ہے جس پر ادبی تاریخ انھیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ غزل کو غزل ہی رہنے دیا جائے اور جن کا خونِ جگر اس بوٹے کو سینچتا رہا، ان کے ساتھ بے وفائی ہرگز نہ کی جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ وہی غزل زندہ رہے گی جو اس کی کلاسیکی روایت کے ساتھ آگے بڑھے گی اور غزل کا آغاز کرنے والے شعرا کے جذبوں سے متمتع ہوتی رہے گی۔ بقول اقبال:

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر لائقِ میراثِ پدر کیونکر ہو

منور ہاشمی کی غزل بھرپور تاثر کی حامل ہے۔ وہ لفاظی کو غزل کی روح کے منافی سمجھتے ہیں۔ ان کا شعر انتہائی آسان الفاظ سے بُنا ہوا مگر مطالب کے سمندر سے قاری کو مطالبِ فکر دیتا ہے۔ منور ہاشمی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے آسان الفاظ میں مشکل باتیں کی ہیں، اسی وجہ سے ان کے شعر میں کشش ہے، ہر شعر پڑھتے ہی دل میں اُتر تا ہے، سوچ سوچ کر یا بار بار پڑھ کر مفہوم سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ جسے تغزل اور شعریت کہا جاتا ہے، وہ منور ہاشمی کی غزل میں بدرجہ اتم

موجود ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ابھی منور ہاشمی جیسے چند شعرا موجود ہیں جو غزل کو غزل کی حیثیت سے قائم رکھے ہوئے ہیں۔ وہ غزل پر ہونے والے ہر وار کے سامنے ڈھال بنے ہوئے ہیں۔ اگر غزل آج پوری آب وتاب کے ساتھ زندہ ہے تو اس طرح کے چند دیوانوں کے باعث ہے ورنہ بعض اچھے اچھے شاعر بھی ہم نے بھٹکتے ہوئے دیکھے ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ غزل کی روح کے خلاف تجربے کرنے والے اپنا نام اور مقام کھو بیٹھے، زندہ وہی ہیں یا انھی شعرا کی غزل زندہ ہے جو غزل کی ہیئتی اور صنفی روح کے ساتھ چل رہے ہیں۔

اس دور میں منور ہاشمی جیسے شعرا کا وجود بلاشبہ غنیمت ہے۔ انھیں ان کی ثابت قدمی نے عظمت عطا کی ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی غزل خود بھی زندہ رہے گی اور ان شعرا کو بھی زندہ رکھے گی اور منور ہاشمی اس زندہ رہنے والے قافلے کے سالار کی حیثیت سے زندہ رہیں گے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزل کی فکری وفنی جہات

ڈاکٹر سید قاسم جلال

درجن بھر کتب کے خالق، معروف شاعر، محقق اور نقاد جناب ڈاکٹر منور ہاشمی کی ادبی خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے۔ان کی علمی، تحقیقی اور تدریسی رہنمائی سے طلبا کی ایک بڑی تعداد فیض یاب ہو کر اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بطور اساتذہ خزانۂ علم کی تقسیم میں سرگرمِ عمل ہے۔

ڈاکٹر موصوف جیسی عظیم شخصیات حقیقت میں کسی ملک اور قوم کے لیے ایک قیمتی اور قابلِ قدر اثاثہ ہوتی ہیں۔ان کی نثری کتب ہوں یا شعری مجموعے، ان کی ہر کاوش ان کی وسعتِ مطالعہ اور فکری وفنی ریاضت کا منہ بولتا اظہار ہے۔

اصنافِ شعر میں انھوں نے غزل کو بطور خاص ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔ سوچ کا صحرا (۱۹۸۲ء)، کربِ آگہی (۱۹۸۵ء)، بے ساختہ (۱۹۹۵ء)، اور تیند پوری نہ ہوئی (۲۰۰۵ء) ان کی وہ شعری کتب ہیں جن میں ان کی غزلوں کا بیشتر سرمایہ محفوظ ہے۔ ڈاکٹر منور ہاشمی کی شعری کاوشوں خصوصاً غزل گوئی کے بارے میں جن مشاہیر اہلِ قلم نے تعارفی وتجزیاتی مضامین لکھے ہیں، ان میں سید ضمیر جعفری، پروفیسر فارغ بخاری اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی قابلِ ذکر ہیں۔

منور ہاشمی کا ایوانِ غزل رنگا رنگ موضوعات کی تجلی زار ہے۔ طلسم گاہ کائنات ہو یا وحشت کدۂ ذات، زندانِ بے مہریٔ حالات ہو یا غم خانۂ معاملاتِ حیات، اُن کی دور بین نگاہ کی دسترس سے آزاد نہیں۔

شاعری سلگتے جذبات اور مرتعش افکار کی ساحرانہ عکاسی کا عمل ہے۔ خاص طور پر غزل کے عناصر کا تجزیہ کرتے ہوئے نقادانِ فن کو جذبہ وفکر دونوں کے ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ منور ہاشمی کی غزل حسی ذکاوت اور فکری حلاوت کے امتزاج کا خوب صورت نمونہ ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں آج کے انسان کی محرومیوں، مجبوریوں اور دکھوں کی روح فرسا داستانیں جس اثر آفریں اُسلوب میں پیش کی ہیں، وہ انھیں کا حصہ ہے۔ غمِ ذات ہو یا غمِ عشق ہو یا غمِ روزگار، ان کا دل حساس ہے، ہر سانحے پر تڑپ اُٹھتا ہے۔ وہ اپنے تجربات ومشاہدات کو جب نوکِ قلم پر لاتے ہیں تو ہر شعر تاثر آفرینی کا شاہکار بن جاتا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

یہ اور بات ، ترے روبرو نہیں گزرا
میں جس عذاب سے گزرا ہوں، تُو نہیں گزرا

تمھارے بعد بھی دیکھوں کسی کو
مری آنکھوں میں اتنا دم نہیں ہے

ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزلوں میں سوز و گداز کا عنصر بدرجۂ اُتم نظر آتا ہے۔ انھوں نے اگر چہ بیشتر اشعار میں واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے لیکن ان کے ذاتی غم میں آفاقیت کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے خزینۂ اشعار کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کو اپنے دکھ یاد آ جاتے ہیں اور ان اشعار میں اپنا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ منور نے موضوعات کی صداقت، جذبات کی لطافت اور احساسات کی نزاکت کو جس پُر تاثیر، سادہ، رواں اور مسحور کن اسلوب میں پیش کیا ہے، میں اس کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ان کے کلام کی ایک خاص خوبی اس کا استفہامیہ انداز ہے جس نے اشعار میں ڈرامائی تاثر انگیزی اور تجسس آفریں رنگ پیدا کر دیا ہے۔ مثلاً ان کے ذہن میں اس قسم کے سوالات بار بار آتے ہیں کہ میرے دل کو تو پے در پے صدمات نے پتھر کی طرح بے حس کر دیا تھا، اس پتھر کو جادو کر کے کس نے موم کر دیا؟ میرا دل تو غموں نے مقفل کر دیا تھا، اسے کس نے کھولا اور کیسے کھولا؟ میرے بعد میرے محبوب کا کیا بنے گا؟ محبت کے بدلے میں نفرت کیوں ملتی ہے؟ یہ تضادات کیوں ہیں؟؟ انسان کو اس کی خواہش کے مطابق گوہرِ مقصود کیوں نہیں ملتا؟ کومل کومل جذبوں کی لطیف لطیف پیرایۂ اظہار میں ترجمانی کے حامل منور ہاشمی کے اشعار دیکھیں:

وہ ایک شخص جو مجھے پہچانتا نہیں
میرے بغیر کوئی اسے جانتا نہیں

یہ حوصلہ ہے ترا، تُو ہے آج بھی زندہ
بچھڑ کے تجھ سے مگر میں تو مر گیا، جاناں

جوں جوں عمریں کم ہوتی ہیں، حسرت بڑھتی جاتی ہے
عین جوانی کے عالم میں مر جاتے تو اچھا تھا

منور ہاشمی نئے اور انوکھے خیالات کی جستجو میں رہتے ہیں۔ ان کے خیالات آج کے دور کے اُن نام نہاد جدید شعرا سے قطعاً مختلف ہیں جو اُردو زبان و بیان کی خوبیوں کو خامیاں قرار دیتے ہیں اور اس کی صالح روایات پر خطِ تنسیخ پھیرنے کو ترقی پسندی سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر منور ہاشمی، غالب اور دیگر اساتذۂ سخن جیسی ندرتِ تخیل سے نگارِ غزل کی مشاطگی میں مصروف ہیں۔ ان کے موضوعات میں ایسے ایسے نادر الوجود خیالات بھی موجود ہیں جو عصرِ حاضر کے بہت کم شعرا کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ تخیل کے یہ چند جواہر ریزے ملاحظہ کیجیے جو اشعار کے روپ میں ایک نئی سج دھج کے ساتھ موجود ہیں:

چاند کی رعنائیوں میں راز یہ مستور ہے
خوب صورت ہے وہی جو دسترس سے دور ہے

یہ مانتا ہوں کہ اُس نے سپردِ مرگ کیا
مگر وہ غم کے بھنور سے مجھے نکال گیا

آج کا انسان اپنی ذات کے نہاں خانے میں مستور گہر ہائے آبدار تک رسائی تک نہیں رکھتا۔ المیہ یہ ہے کہ وہ دنیا بھر کے علوم پر دسترس حاصل کر لیتا ہے لیکن اپنی ذات کے عرفان سے محروم ہوتا ہے۔ بقول منور ہاشمی:

اپنے حالات سے نہیں واقف
ساری دنیا سے آشنا ہوں میں

منور ہاشمی نے اپنے اشعار میں انسانوں کی نفسیاتی کیفیات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ انسانی ذہن پیچ در پیچ خیالات کی آماج گاہ ہے۔ صدیوں سے فلسفی، دانش ور، ادبا اور شعرا نفسیاتی عوامل کی گرہ کشائی میں مصروف ہیں:

جانے اس کے نام پر کیوں آنکھ بھر آئے مری
میں منوّر جانتا بھی ہوں کہ وہ میرا نہ تھا

اُردو کے قدیم اور نامور شعرا میں حکیم مومن خان مومن اپنے ذومعنی اشعار کے حوالے سے خاصے معروف ہیں۔ منور ہاشمی بھی اُردو زبان کے قواعد و ضوابط کے ساتھ اس کی نزاکتوں اور الفاظ کے حسنِ استعمال سے خوب واقف ہیں۔ مومن کی طرح ان کے ذومعنی اشعار ان کی قدرتِ کلام اور فنی مہارت کے عمدہ ترجمان ہیں۔ بطور ثبوت دو اشعار پیش خدمت ہیں:

اک اجنبی کو اپنا بنانے کے واسطے
ہم نے دیے ہیں سارے زمانے کے واسطے
میرے لہو کی اس کو ضرورت ہے آج کل
کچھ رنگ چاہیے ہے فسانے کے واسطے

کچھ اس طرح سے بسر کی ہے زندگی میں نے
غموں کی چھاؤں میں ڈھونڈی ہے ہر خوشی میں نے

غمِ ذات ہو، غمِ جاناں ہو یا غمِ دوراں، جو لوگ مصائبِ حیات کے وار سہہ کر جینے کا ڈھنگ سیکھ لیتے ہیں، وہی خوشیوں کے اصل حق دار ہوتے ہیں۔ کامرانیوں کی منزلیں انھی لوگوں کے انتظار میں ہوتی ہیں۔ منور ہاشمی رجائی اندازِ فکر کے حامل ہیں۔ اُن کے حوصلہ انگیز و امید افزا اشعار دیکھیے:

اتنی امید تو ہے اپنے پسر سے مجھ کو
میری تربت پہ جلائے گا دیا، میرے بعد

یہ اور بات کہ گرتے سنبھلتے رہتے ہیں
تری تلاش میں ہم لوگ چلتے رہتے ہیں

منور ہاشمی دلوں کی دھڑکنوں کے نبض شناس تو ہیں ہی، انھیں ان مسائل کا بھی خصوصی ادراک ہے جو ہمارے دماغوں کو اپیل کرتے ہیں۔ وہ صرف مسائل کی نشان دہی نہیں کرتے، ان کا حل بھی بتاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں فکر انگیزی کا رنگ بھی نمایاں نظر آتا ہے:

سمندروں کا اسے کس طرح ہو اندازہ؟
کبھی جو شخص، لب آب جُو نہیں گزرا

ڈاکٹر منور ہاشمی کو جدید و قدیم اُردو ادب کے وسیع مطالعے نے سیر حاصل فکری غذا عطا کی ہے۔ ان کے ذوق لطیف نے کلاسیکی ادبی روایات کو خوب ہضم کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں وہ تشبیہات، استعارات، رموز اور علامتیں بھی موجود ہیں جو اساتذۂ سخن کے کلام کا طرۂ امتیاز تھیں:

خوف گل چیں کا نہ خطرہ یہاں صیاد کا ہے
تیرے گلشن سے تو بہتر ہے بیاباں میرا

تصوف اُردو شاعری کا ایک ایسا موضوع ہے جس سے قدما نے خاص طور پر اپنے کلام کو آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔ آج کے دور میں جو چند شعرا اس موضوع پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں، ان میں ڈاکٹر منور ہاشمی بھی شامل ہیں۔ وہ بے ثباتی دنیا کے بارے میں لکھتے ہیں:

ہستی اپنی ایک سراب، جیسے دریا بیچ حباب
پل دو پل کی ہے مہمان کل من علیہا فان

آخر میں منور ہاشمی کی خدمت میں اپنا ایک شعر پیش کرتا ہوں:

صبح دم، گردوں کی پہنائی میں کھو جاتا ہے چاند
پر، مرے ماہِ منور پر زوال آتا نہیں

(مشمولہ: پاکستان کے چند اہم غزل گو، تحقیق و ترتیب: ڈاکٹر احمد ہادی)

سخنِ عشق: ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزل

اکرم کنجاہی

غزل ایسا جامِ جہاں نما ہے کہ جس میں ساری دنیا کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ ہمارے عہد میں غزل کے حوالے سے حسن و عشق کے روایتی قصے یکسر بدل چکے ہیں کہ اب غزل میں عشقیہ واردات اور تجربے کا بیان کسی اصول اور ضابطے کا پابند نہیں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جس طرح حیات و کائنات کی کچھ بنیادی صداقتوں میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی، جیسے موت کا وجودی تجربہ اور مذہبی تجربے کا سحر، بل کل اسی طرح عشقیہ تجربے کی کشش اور اُس کے شعری اظہار میں عجیب سحر پوشیدہ ہے جس میں کہیں بھی کسی عہد میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ خاص طور پر ہمارے کلاسیکی شعرا نے اس موضوع کو اس درجہ تسلسل اور جامعیت سے برتا ہے کہ زندگی اور عشق میں کوئی حدِ فاصل باقی نہ رہی۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عشق محض ایک موضوع نہیں رہا بلکہ تمام تر تخلیقی سرگرمیوں کا سرچشمہ بن گیا۔ میر سے فراق اور ناصر کاظمی سے احمد مشتاق تک غزل میں عشقیہ شاعری کے لاتعداد رنگ پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ عشقیہ تجربے اپنے احساسات اور اپنی جہات کے اعتبار سے مختلف النوع ہیں۔ یہ وجودی بھی ہو سکتے ہیں اور روحانی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ زمانے بیت گئے مگر اپنی تکرار کے باوجود اسے یک رنگ، بوسیدہ اور فرسودہ خیال نہیں کیا جاتا، یہ تازہ ہے اور شاعری ہمیشہ اپنے اسی تجربے پر ہمیشہ نازاں اور فریفتہ رہی ہے۔ شعرا نے اپنے اس ذاتی عمل اور اسے نجی معاملے کو جو شاید عام زندگی میں ناقابلِ بیان بھی کہا جا سکتا ہے، کچھ اس انداز سے کہا ہے کہ جو پہلے کہا گیا اُس کی یاد بھی آتی ہے اور نیا پن بھی برقرار رہتا ہے۔ اصلاح پسندوں اور ترقی پسندوں کی کاری ضرب تک سہہ گیا۔ اس نے کسی فلسفے کے بوجھ تلے دم نہیں توڑا۔ سچ ہے کہ چاہنا اور چاہے جانے کی خواہش رکھنا انسان کی جبلت میں شامل اور کلاسیکی غزل میں کل وقتی مشغلہ ہے۔ ایسا کوئی بڑا شاعر نہیں گزرا جس نے عشقیہ اشعار نہ کہے ہوں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہمارا تنوع اور انفرادیت پسند شاعر غالب کلامِ حسن اور سخنِ عشق کو حسنِ کلام کے لیے ناگزیر خیال کرتا ہے۔

تیرے ہوتے جو ہمیں یاد بھی آیا کوئی کام
ہم نے موقوف اُسے وقتِ دگر پر رکھا (مصحفی)
عشق وہ کارِ مسلسل ہے کہ ہم اپنے لیے
ایک لمحہ بھی پس انداز نہیں کر سکتے (رئیس فروغ)

ڈاکٹر منور ہاشمی کی شاعری اُن کے اندرونی تجربات، لاشعور اور وجدان کے اظہار کا نام ہے۔ اُن کی دروں بینی کی اساس لطیف تخیل اور نازک جذبہ ہے اور یہ دونوں عناصر غنائی شاعری میں اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ میں ڈوب کر شعر

کہنے والوں میں سے ہیں۔اُن کے دل کی دنیا میں چمن اندر چمن آباد ہیں اور تخیل نے اُس میں ایسے ایسے حسین پیکر سجا رکھے ہیں کہ جس کی سیر میں وہ اس قدر منہمک ہیں کہ انھیں خارجی عالم کے مشاہدات کی فرصت نہیں اور خوبی یہ ہے کہ کمال ہُنر مندی سے وہ اپنے مشاہداتِ دل میں اپنے قاری کو شریک کر لیتے ہیں جس سے وہ بھی لطف اٹھاتا ہے۔اُن کے ہاں دل ہی حقیقتِ اشیا کا پیمانہ اور معیار ٹھہرا ہے۔

ہمارا جمالیاتی تجربہ دو طرح کا ہوتا ہے۔اشیا کی مقصدیت اور افادیت کے وسیلے سے یا پھر آزاد اور کسی متعین مقصد کے بغیر۔ایک با ذوق انسان یا شاعر کا پھول کے حوالے سے جمالیاتی تجربہ بغیر کسی مقصد کے ہوتا ہے۔پھول کی لطافت اور اُس کے رنگ و بو سے حظ اٹھانے کے لیے ہمارا ماہر نباتات ہونا شرط نہیں اور پھول سے متعلق علمی معلومات بھی ضروری نہیں۔اُسی پھول کو ایک سائنسدان بغیر مقصد کے نہیں دیکھے گا اور وہ اُس کے حسن سے ایک جمال پرست کی طرح لطف بھی نہیں اٹھا سکتا۔ہاں، بعد ازاں وہ اپنے مقصد کے توسل سے محظوظ ضرور ہو سکتا ہے۔ہم اپنے مکانات، مدرسوں اور عبادت گاہوں سے آزادانہ و بلا واسطہ نہیں بل کہ اپنے مقصد کے وسیلے سے مسرت کشید کرتے ہیں۔جمالیات میں بنیادی قدر حسن ہے جو جمال میں بھی پنہاں ہوتا ہے اور جلال میں بھی۔یہ دلربائی میں بھی مضمر ہوتا ہے اور عظمت و وجاہت میں بھی جھلکتا ہے۔ظاہر ہے کہ دل ربائی نسوانی صفت ہے اور عظمت مردانہ اوصاف میں سے ہے۔چوں کہ غزل کی سب سے اہم تعریف عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں سے متعلق باتیں کرنا ہے،لہذا شاعری میں اکثر جمالیات سے مراد کسی پری رخ کے خال و خط کی تعریف ہی ہو سکتی ہے۔محبت میں دھوکا کھانے کے باوجود بھرتری ہری کا ماننا ہے کہ" دنیا میں صرف محبوب کا مسکراتا چہرہ ہی دیکھنے کے لائق ہے۔اُس کے منہ سے نکلی خوشبودار ہوا ہی سونگھنے کے لائق ہے۔محبوب کی باتیں ہی سننے کے لائق ہیں۔محبوب کے ہونٹوں کا رس ہی چکھنے کے لائق ہے۔اُس کا جسم ہی چھونے کے لائق ہے اور ہر جگہ موجود اُس کی شوخی ہی دھیان کے لائق ہے۔باقی درشن یوگ،دھیان وغیرہ کی باتیں بے مطلب ہیں" ڈاکٹر منور ہاشمی کے فکر و فن میں جمال آفرینی نمایاں ہے وہ ایک طرف تو کلاسیکی غزل کی ہیت پر کار بند ہیں تو دوسری طرف مواد کے اعتبار سے اپنی تخلیقات کو کسی مہ وش کے حسن و جمال کی خوشبو سے مہکائے ہوئے ہیں۔اُس کے خیال سے اپنے اشعار کو یادوں کا صحیفہ بنائے ہوئے ہیں۔اُن کا کہنا ہے کہ خدا اگر حسن کی تخلیق میں مگن ہے تو شاعر کا کام حسن کی ستائش کرنا ہے۔اُن کی نظر میں حسن جذبِ دروں جوان رکھتا ہے، جب ترو تازہ ہو کر سامنے آتا ہے تو عشق کا شباب عود کر آتا ہے، اس لیے کہ ہر نیک و بد حسن کے تیرِ نظر کا گھائل ہوتا ہے۔اُن کے خیال میں کسی لالہ رخ کے تصور سے ذہن کو بالیدگی اور انفاس کو نکہتیں ملتی ہیں۔اُن کے ہاں داخلیت کی اہمیت یوں ہے کہ انہوں نے انسان کے حسن کا ادراک کیا۔اظہار کی تمنا نے تخلیقِ حسن کی طرف راغب کیا۔یہی بات ہے جس سے ایک طرف شعری روایت نے جنم لیا تو دوسری طرف تخلیق کا رنگ و نور دوسروں کے لیے باعث کشش بنا۔حسن روح کی پاکیزگی کی ایک شکل ہے۔صرف انسانی حسن یا حسن مجازی،اُن کے ہاں عشق ہی کی طرح حسن کا بھی ایک

ہی رنگ ہے۔ہم اس بات سے واقف ہیں کہ عصرِ حاضر میں قدم قدم پر انسان کا دل خراش سانحات سے واسطہ پڑتا ہے۔ ہر طرف خوف اور دہشت ناکی ہے۔ ہر شریف انسان اپنے ہی ماحول، سماج اور معاشرے میں، اپنوں کے درمیان سہما سہما ہے۔ جمالیات کا تصور بھی معاشیات واقتصادیات سے جڑا ہوا ہے، اس دوڑتی بھاگتی زندگی،نت نئے مسائل، روایتی طور پر بھی منور ہاشمی کے ہاں حسن و جمال کی شبنمی ٹھنڈک ہے۔آج کی عمومی شعری ڈکشن سے مختلف پیرایۂ اظہار میں حسن و عشق کے تذکرے ہیں۔فی زمانہ ایک موضوع کی حیثیت سے اگرچہ عشق کی مرکزیت تقریباً ختم ہو چکی ہے مگر ہمارے ممدوح کا جمالیاتی رنگ و آہنگ حسن و عشق کی سحرانگیزیوں کا منت کش ہے۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

حسن کی تخلیق میں مصروف ہے ربِ جہاں
اور شاعر حسن کی تعریف پر مامور ہے
وہ سراپا حُسن ہے اور میں سراپا عشق ہوں
ساز سے دل اس کا میرا سوز سے معمور ہے

دل کے جذبے جوان رکھتی ہے
تیرے حسن و جمال کی خوشبو
ہے متوّر تمھارے ہونٹوں میں
اک پری رُخ کے خال کی خوشبو

وہ جب بھی حسن کا شہکار کوئی دیکھنا چاہے
مری آنکھوں کے آئینے میں خود کو دیکھ لیتا ہے

ذہن کو بالیدگی کس کے تصور سے ملی
ان دنوں انفاس کو یہ نکہتیں دیتا ہے کون

ترے خیال نے بخشی جلا مرے فن کو
ہر ایک شعر تری یاد کا صحیفہ ہے

ڈاکٹر جمیل جالبی نے کیا عمدہ بات کہی تھی کہ ادیب کی ذمے داری صرف یہ ہے کہ ایک طرف وہ اپنے فن کا وفادار رہے، اُسے صرف اُسی کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔ادیب کی ذمے داری یہ ہے کہ وہ ادیب رہے ہرکارہ نہ بن جائے۔"

اسی نوعیت کی بات مظہر امام نے بھی کہی تھی ''شاعر اور ادیب سے یہ توقع کرنا کہ وہ زندگی میں بیدار ہونے والے ہر مسئلے پر کوئی فن پارہ تخلیق کرے درست نہیں۔ عالمی، ملکی یا مقامی سطح پر بہت سے حادثات و واقعات رونما ہوتے ہیں، اُن پر شاعر و ادیب کی طرف سے فوری ردِعمل ظاہر کرنا اچھے ادب کی تخلیق کا ضامن نہیں ہوتا۔ شاعر کا شیوہ نہیں کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کے سامنے مستقبل کی آویزشوں کا تاریخی حل تیار مال کے طور پر پیش کردے۔''

اِس لیے کوئی رجحان بذاتِ خود افراد کے عمل سے پیدا ہونا چاہیے۔ منور ہاشمی کی شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ یہ اُن کے ذاتی جذبات و احساسات ہیں، غزل اُن کے حُب اور عشق میں رچی بسی ہے اِس لیے اس میں انھیں صناعی یا کرافٹ کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ فطری جذبے کو خالص فطری رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ مزید براں حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرکے اظہار کی راہیں نکالی گئی ہیں۔ ایک ذمے دار پاک باز استاد سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی سپردگی و وارفتگی، ناکام محبت، لاشعوری کیفیات اور داخلی مشاعر و احساسات کا اظہار جب اپنے کلام میں کرتا ہے تو وہ ''عذری غزل'' کا روپ دھارتی ہے۔ یعنی عذری غزل ایسے جذبات کا فنی اظہار ہے جو بہ یک وقت پاک باز بھی ہیں اور بھڑک بھی رہے ہیں اور شاعر اس فنی اظہار کے ذریعے جذبات کی آگ کو دھیما کرنے اور فطرت و جبلت کو بلندیوں سے ہم کنار کرنے کا کام لیتا ہے۔ یوں عشق و محبت کے آفاقی مضامین و مفاہیم کے در کھلتے ہیں۔ منور ہاشمی چشم و لب و رخسار کی شاعری میں خونِ جگر کی آمیزش کرنے والوں میں سے ہیں۔ اُن کی نگاہیں محبت پر مرکوز رہتی ہیں اور خیالات محبت پر ہی مرتکز رہتے ہیں۔ یہ تخلیقی کام صدقِ دل اور کامل اخلاص سے جاری رہتا ہے تو روح کو اپنی منزلِ مقصود کا ادراک اور عرفانِ ذات ہونے لگتا ہے۔ اُن کے بے پایاں جذبات محبت میں سپردگی، ایثارِ نفس اور خود فراموشی ہے۔ جذبہ سب کے لیے نہیں تو وہ ایک کے لیے محبت میں غرق ہیں اور اُس تک پہنچنے کے لیے آرزو شاعر کو ہر لحہ آتشِ زیرِ پا رکھتی ہے۔ حسن کے ہر جلوے اور ہر شیوے سے اُن کا ایک تعلق خاطر ہے۔ اُن کی شیفتگی کا دائرہ ہر آن وسیع تر ہوتا محسوس ہوتا ہے:

مانا مری جبیں میں تڑپ ہے سجود کی
لیکن کشش عجیب ترے سنگِ در میں ہے

اس کی نظر کا رنگ نظر میں ملا لیا
اپنی نظر سے خود کو گرانے کے واسطے
ہونا پڑا ہے مجھ کو منوّر زمیں سے پست
اس کا مقام خود سے بڑھانے کے واسطے

تجھ سے میرے ربط کا اظہار لفظوں میں کہاں
میں نے اپنے آپ کو بھی اس قدر چاہا نہیں

تو میری جاں ہے، میرے جسم میں آ
تجھے خود میں سمونا چاہتا ہوں

جس پہ رکھی تھی مجھے اپنی اساسِ ہستی
اپنی قسمت میں منور وہی اک پل نہ ہوا

بچھڑے تو اس سے ہیں مگر لگتا ہے اس طرح
خود سے ملے ہوئے بھی زمانے گزر گئے

ایسا ہوتا ہے کہ پتھر بھی پگھل جاتا ہے
تو نے سینے میں مگر چیز یہ کیا رکھی ہے

عشق بھی ہم نے کیا تو اک عبادت کی طرح
قریۂ جاں میں ہمیشہ باوضو پھرتے رہے

کتنے گزرے کتنے باقی مرحلے ہیں ضبط کے
آنکھ کی دہلیز پہ بیٹھا ستارا سوچتا ہے

ورق ورق پہ تیرا نام جس میں لکھا ہے
وفا و مہر کی وہ دل کتاب ہے کہ نہیں

اس عشقِ بے پناہ پہ ہو خاص التفات
اس حسنِ بے نیاز کو کوئی پیام دے

اپنے ایک مضمون ''عشق، ادب اور معاشرہ'' میں محمد حسن عسکری اس لطیف خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ'' معاشرے میں انسان کی پہلی ضرورت اخلاق نہیں ہے، بلکہ زندگی کا شعور ہے اور عشق زندگی اور کائنات کے خوبصورت اور بد صورت، نیکی اور بدی، ہر پہلو اور ہر قدر کا شعور حاصل کرنے کا وسیلہ بنتا ہے'' روایت کا گہرا تعلق زیادہ تر پختہ کاروں کے یہاں ملتا ہے جو تخلیقِ فن میں ذہانت اور خلوص کے ساتھ کچھ عرصہ گزار چکے ہوتے ہیں۔ منور ہاشمی اپنے اندر کی صداقتوں سے

اس طرح بے نیاز نہیں ہوئے کہ شعر گوئی بے معنی ہو جائے۔ اُن کے کلاسیکی مزاج کا اعجاز ہے کہ عشق کا مضمون خواہشِ وصل اور جسم کے لمس یا آتشِ ہجر کی تپش میں راکھ ہو جانے پر ختم نہیں ہوا۔ بل کہ ایک بے پایاں اضطراب نے مستقل سحر آفرینی کی ہے کیوں کہ اُن کے لیے قرب ہی وجہِ تسلی نہیں یادیں بھی آفتِ جاں ہیں۔ نشاطِ وصل ہی باعثِ افتخار نہیں حسرتِ ناکام بھی سرمایۂ دل ہے۔ اُن کا قلب آتشِ عشق سے سوزاں و تپاں ہے۔ اس لیے کہ ہجر ہے جو اُن کے کلام میں سورنگ اور کیفیات میں نمایاں ہے۔ وہ تو اُس زخم کی لذت سے بھی سرشار ہیں جو ابھی لگا ہی نہیں۔ منور ہاشمی نے روایت کو فروغ دیا ہے اور اپنی ذات کے نہاں گوشوں کو روشن کیا ہے۔ وہ اُن شعرا میں سے ہیں جو اس حوالے سے روایت سے ہٹے ہوئے ہیں کہ وہ فریبِ وصل نہیں کھاتے، کوچۂ دل دار میں پہنچ کر مطمئن اور آسودہ نہیں ہو جاتے، اُس سے آگے نکل کر اپنا اضطراب اور بے کلی برقرار رکھتے ہیں اور آتشِ عشق بجھنے نہیں دیتے۔ اُن کے ہاں بوالہوسی سے آگے، عشق کی لطافتیں اور دکھ عشقیہ شاعری کے تنوع میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اُن کے ہاں فطری سادگی اور خلقی معصومیت بے لوث اور گہرے عشقیہ تجربے کا پتا دیتی ہے۔ مزید براں اُن کے ہاں ''ہجر'' کا غلبہ ہے۔ جس میں کیفیت، معاملہ اور فکر تینوں تخلیقی قوتیں فعال ہیں۔

کل دل کے لیے وجہِ تسلی تھا ترا قرب
اب یاد تیری میرے لئے آفتِ جاں ہے

اک حسرتِ ناکام جو سرمایۂ دل تھی
اب اس کے لیے وقف مری عمرِ رواں ہے

افسوس! کسی سے بھی اٹھایا نہیں جاتا
یہ بارِ محبت ہے کہ اک کوہِ گراں ہے

چھپائے پھرنے سے کب عشق و مشک چھپتے ہیں
چڑھے گا چاند تو سب کو نظر بھی آئے گا

ہم جو فطرت کو بدل دینے کی رکھتے قدرت
موجِ بے تاب کو آسودۂ ساحل کرتے

میرے لیے سرمایۂ توقیر رہے گا
اک سنگِ ملامت جو ترے بام سے آیا

ہر شخص ہوا جاتا ہے اب عشق سے تائب
سوچوں میں تغیّر مرے انجام سے آیا

اورکوئی بھی نہیں اپنا سہارا باقی
اب ہے سینے میں فقط درد تمھارا باقی
اُس کے آنے کی ہے موہوم سی امید ابھی
آسماں پر ہے ابھی ایک ستارہ باقی

اس کا دل گوش بر آواز رہے یا نہ رہے
درد رہتا ہے ہمیشہ سے غزل خواں میرا

خوف گلچیں کا نہ خطرہ یہاں صیّاد کا ہے
تیرے گلشن سے تو بہتر ہے بیاباں میرا

گزرا ہے کیسے موسمِ باراں کسی سے پوچھ
کتنے ہی تشنہ کام تجھے ڈھونڈتے رہے

ہم اُس کی لذتوں سے ہیں سرشار پیشگی
جو زخم تو نے دل پہ لگایا نہیں ابھی

ترسیل وابلاغ کا پرچم کتنا بھی بلند کیوں نہ ہو، زبان کا ہر تجربہ، غزل کی لفظیات میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔ اگر کبھی ایسی بچگانہ کوشش ہوئی بھی تو ایک وقتی تجربے کی حد تک رہی اور غزل کے مزاج سے نہ تو ہم آہنگ ہو پائی نہ ہی جگہ بنا سکی۔ غزل کی تہذیب کے دھارے کا رخ موڑنا اتنا سہل نہیں ہے جتنا کچھ نادان دوستوں نے سمجھا۔ شاعری میں لفظیات کے دہرائے جانے کا اعتراض عام ہوا تو شیلے نے اپنے مضمون "شاعری کے دفاع میں" اظہارِ خیال کیا کہ اشیا کے باہمی رشتوں کے ادراک سے جو الفاظ وضع ہوتے ہیں وہ کچھ عرصے بعد رمی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسے میں جب بھی کوئی نیا شاعر سامنے آتا ہے تو دوبارہ الفاظ کا تعلق اشیا کے باہمی رشتوں سے قائم کر دیتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو زبان کی حیثیت محض رمی رہ جاتی مگر نئی اشیا، نئے نئے حادثات و واقعات اور بدلتے سماجی و معاشرتی تناظر میں الفاظ نئی معنویت کے ساتھ زندگی کی قوت اور جمال کے آئینہ دار رہتے ہیں۔ یوں کہیے کہ شاعری میں سارے الفاظ معانی کی علامتیں ہی تو ہوتے ہیں، اب معانی کی ہمہ گیریت، گہرائی اور تہہ داری کا انحصار برتنے والے کے ہنر اور پروازِ فکر سے ہوتا ہے۔ جیسے جیسے الفاظ استعمال میں

آتے ہیں، کچھ تو کثرتِ استعمال سے اپنا وقار کھو بیٹھتے ہیں، اُن کی جگہ نئے الفاظ لے لیتے ہیں یا وہی الفاظ کسی ماہر کوزہ گر کے ہاتھ میں آتے ہیں تو معنویت کی نئی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

منور ہاشمی نے اپنی شاعری میں کچھ ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جو کلیشے بن چکے ہیں کہ جن کے بغیر شاید زندگی کی معنویت تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔ جدید غزل اپنی ڈکشن اور مواد کے اعتبار سے اتنی بدل چکی ہے کہ اس کی پہچان بہت واضح ہے۔ مثلاً منور ہاشمی کے ہاں درج ذیل الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ توبہ، جام، کوچۂ جاناں، شہرِ نگاراں، خاکِ دشت، اشارۂ ابرو، واعظ، گناہ و ثواب، نیک عمل، چشمِ غزالاں، دشتِ انا، سایۂ دیوار۔ یہ الفاظ ظاہر ہے پرانے ہیں، ہماری کلاسیکی اور روایتی شاعری میں ان کا بہت استعمال ہوا ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اثر آفرینی اور معنویت نے نئی نئی شکلیں اختیار کی ہیں۔ ہمارے ممدوح الفاظ کا استعمال سادگی اور برجستگی سے کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں ''خواب'' ایک بنیادی استعارے کے طور پر آتا ہے جو آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں کی علامت ہے۔ ایسی تمنائیں جو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے سے مکمل نہ ہوئیں، ایسی آرزوئیں جو کانچ کے طرح شکستہ ہیں اور شاعر کو پلکوں سے چننا پڑ رہی ہیں۔ ایسی خواہشات جو تعبیر سے محروم اور ناآسودہ ہیں۔ موصوف عہدِ جدید کے آدمی ہیں جو ماضی، حال اور مستقبل کے تسلسل میں زندگی کی اکائی کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ روایت اور کلاسیک سے منسلک رہنے کے باوجود وہ ماضی کے اندھیرے غاروں میں نہیں ٹھہرے بلکہ ماضی کو مستقل دریافت کرنے میں لگے ہیں۔ روایت اُن کے ہاں داخلی صداقت کا نام ہے۔ اُن کی شعری بصیرت اسی روایت سے پیوستہ ہے اور اُن کے خوابوں نے بھی اسی روایت سے جنم لیا ہے۔ اگر میں کہوں کہ اُن کی اگر کوئی شعری انفرادیت ہے تو اُس نے روایت سے نمو پائی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ منور ہاشمی کی غزل میں، روداد عشق کے تین مرکزی کرداروں میں سے ''رقیب'' ندارد ہے۔ باقی دو کے اوصاف وہی ہیں جو عام طور پر ہماری غزلیہ شاعری میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ شاعر عشق میں بیمار بھی ہے، وفا شعار بھی اور پیکرِ حسرتِ دیدار بھی، پروانہ بھی ہے، دیوانہ بھی اور ہجر نصیب بھی۔ اسی طرح محبوب اپنی طرزِ ادا اور میلانات میں پری رو، مہ وش، چاند، شمع، حور شمائل ہونے کے باوجود ظالم، جفا شعار اور وصل بیزار ہے۔ قاتل اور ستم شعار ہے۔ موصوف نے بدلتے ہوئے شعری تناظر اور جدید تقاضوں کے پیشِ نظر غیر مانوس اور مبہم علامتی و استعارتی فضا قائم کرنے کی بجائے، اپنی شخصیت کے فطری مذاق و مزاج اور صحت مندانہ فکر تو اپنایا ہے اور غزل کی اشاریت، رمزیت اور کوملتا کا خیال رکھا ہے، بڑے سلیقے سے اظہارِ ذات اور انکشافِ ذات کے مراحل طے کیے ہیں، کہیں رمز سے کچھ چھپایا ہے اور کہیں کنائے سے کچھ بتایا ہے مگر وقتی واہ واہ کی خاطر کوئی طفلانہ حرکت نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کی دل ربائی اُن کے کلام میں نمایاں ہے۔ مختصر یہ کہ ہمارے ممدوح نے کہیں وقتی و عصری ضرورت کی وجہ سے عشقیہ موضوعات اور فنی روایات سے شعوری اجتناب و انحراف نہیں کیا۔ اُن کی غزل کا خمیر عشقیہ موضوعات سے اٹھا ہے۔

خوابوں کا سلسلہ بھی نہیں ٹوٹتا کبھی
اور جاگتے ہوئے بھی زمانے گزر گئے

اک چھناکا سا مقوّر کانچ کے گھر میں ہوا
کرچیاں میں خواب کی پلکوں سے چنتا رہ گیا

اک تمنا ہے کہ مجنوں سے ملاقات کریں
کھینچتی رہتی ہے جو سوئے بیاباں ہر دم

شان و شوکت شبِ ہجراں کی نہ کم ہو جائے
ہم نے اشکوں سے کیے رکھا چراغاں ہر دم

اپنے کوچے سے چلے جانے پہ مجبور نہ کر
کس سے پوچھے گا کوئی تیرا پتا میرے بعد

تری گلی میں قتل ہوگیا ہوں میں تو ٹھیک ہے
ترا بھی کام ہو گیا ، میرا بھی کام ہو گیا

یہاں تک آ گئے ہیں اس کی تہمتوں کے سلسلے
ہوا بھی تیز چل پڑی تو میرا نام ہوگیا

درد و الم ، جفا وستم ، بے قراریاں
ہم پر جمالِ یار کے احسان ہیں بہت

اسی ہوا کا بہت انتظار تھا سب کو
کہ جس ہوا نے ہمارے دیئے بجھائے ہیں

میں نے چاہا تھا وفا کی روشنی مدھم رہے
جذبہ دل کو مگر یہ شدتیں دیتا ہے کون

انسان کائنات کا مرکز ومحور ہے۔دنیا کے تمام عذاب وثواب کا سبب یہی ہے۔یہ خیر وشر کا ایسا مجمہ ہے کہ سب

نیکی و بدی کا تصور اسی کے دم سے قائم ہے۔ مغربی تہذیب کا بڑا شاعر گوئٹے اس دکھ میں مبتلا رہا کہ انسان نے بے پایاں علم کے حصول کے لیے اپنی روح شیطان کے حوالے کر دی۔ تمام وجودی مفکرین ایک دوسرے سے فکری اختلاف کے باوجود انسان کی بے معنویت کے اس المیے کو بیان کر رہے ہیں جو جدید تہذیب نے پیدا کیا ہے۔ وہ جو "احسن تقویم" کی منزل میں پیدا کیا گیا۔ اشرف المخلوقات قرار دیا گیا۔ دنیا کی بہترین مخلوق کے طور پر منصبِ خلافت پر فائز ہوا۔ تسخیرِ کائنات کے عزائم سے اُس کے اعلیٰ منصب کا پتا چلتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسا مجموعۂ ضدین ہے کہ کوئی اُس کا ہم سر نہیں۔ اقبال تو اُس کے ارفع تر مقام کے یوں قائل ہیں کہ اُس کی پہلی حکم عدولی کو بھی اُس کی آزاد فطرت کا حصہ مانتے ہیں۔ ترقی پسندوں نے بھی انسانی حرمت و عظمت کے گیت گائے مگر وہ انسان جس کو اقبال نے علم و محبت کا سرچشمہ قرار دیا تھا، اُس کے مضبوط و غالب حصہ نے، کمزور اور بڑے حصے کو اپنی طاقت اور اقتدار کی خاطر عرصۂ حشر اور میدانِ جنگ بنا دیا اور پھر انسان پر انسان کا تسلط بڑھتا گیا۔ مشہور یونانی فلسفی دیو جانس کلبی دن میں ہتھیلی پر چراغ رکھ کر چلا کرتا۔ لوگ پوچھتے تو کہا کرتا تھا کہ میں کوئی انسان تلاش کر رہا ہوں جو دیانت دار ہو۔ ڈاکٹر منور ہاشمی نے عصرِ حاضر کے انسان کی منافقتیں، اندر کی تنہائی و اُداسی، طوطا چشمی، مصلحت کوشی، انا پرستی کو اپنے اشعار کا موضوع بنایا ہے، ایسا کیوں نہ ہوتا کہ انسان ہی کائنات کی سب سے بڑی کھلی مگر پُر اسرار کتاب ہے اور اُس کا مطالعہ سب سے اہم مطالعہ ہے۔ اُن کے نزدیک، اس کی بوالعجبیاں رنگ رنگ کے دل چسپ، شگفتہ، درد انگیز و کرب ناک افسانوں میں مرکزی کردار کا درجہ رکھتی ہیں۔ اُس سے توقع تو یہ تھی کہ عرفانِ ذات کی منزل سے گزر کر دنیا میں امن و آشتی کا پیامبر بنے گا مگر ـ ـ ـ ہر عہد میں اُس نے جنگوں کا آغاز ہوا۔ چنانچہ ٹکراؤ، تصادم، تشدد حیاتِ انسانی کے جزو لاینفک بن گئے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ کتاب درد میں جس کا نام تھا وہ وفا کے نام ہی سے ناآشنا ہو گیا۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:۔

پھیلا ہوا ہے چار سو جنگل حیات کا
مل جائیں ایک دو بھی جو انسان ہیں بہت

اپنی سوچوں کے مطابق کچھ بھی کر سکتا نہیں
آدمی حالات کے ہاتھوں بہت مجبور ہے

ایسا بھی ہو جائے اکثر ویسا بھی ہو جائے
سیلابوں کا رستہ روکوں قطرے میں دب جاؤں

زمانہ سارا بدل جائے سب کی مرضی ہے
اگر بدلتا نہیں ہے تو رب کی مرضی ہے

خداوندا! تیری دنیا کا انساں
وفا کے نام سے نا آشنا ہے

کتاب درد میں تھا ذکر جس کا
قسم حق کی وہ انساں مر چکا ہے

انسان مادی خواہشات کے تعاقب میں محبتوں کی سر زمین سے بہت دور نکل گیا ہے۔ہم جنسوں سے بچھڑ گیا۔وہ جسمانی طور پر انسانوں کے درمیان ہے مگر روحانی طور پر فاصلے ہی فاصلے ہیں۔ اِس لیے کہ لطیف جذبات محبت مر گئے ہیں۔احساس کی دولت عنقا ہے۔دھرتی ایسے بنجر ہوئی ہے کہ خلوص و مروت کے فصلیں اُگنا ختم ہو گئی ہیں۔ایسے میں منور ہاشمی جیسے شعرا اپنے فن سے انسان دوستی اور محبت کا اعادہ کر رہے ہیں۔ایسے نفیس خیالات دراصل کلاسیک کی نو دریافت ہے۔دراصل عظمتِ انساں کا احساس اُن کے ہاں انسان دوستی کے جذبے کی پرورش کرتا ہے۔چوں کہ وہ خلاقِ ذاتِ الٰہی کا مظہر ہے تو خلقِ خدا سے محبت خدا سے محبت کے مترادف ہے۔مزید براں محبوب کی ذات کے پردے میں عاشق تمام عالمِ انسانیت سے محبت کرتا ہے اور اُس کی محبت کا ایک لمحہ بھی زمانوں پر بھاری ہوتا ہے۔محبت کو کسی اور جذبے یا محرک کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مجھے تو اپنے مارِ آستیں سے بھی محبت ہے
وہ ڈستا ہے مگر مجھ سے پرایا ہو نہیں سکتا
لہو کا ایک بھی قطرہ ہے اپنے جسم میں جب تک
گلستاں میں گلوں کا رنگ پھیکا ہو نہیں سکتا

نفرت کی ان کی سمت سے حد ہو گئی تو کیا
ہم اپنی سمت سے تو محبت کی حد کریں

عشق کے علاوہ موت بھی شاعری کے دائمی موضوعات میں سے ہے۔زندگی، وقت اور دنیا ناپائیدار، بے اعتبار اور فانی ہیں۔دنیا ایک سرائے سے زیادہ نہیں۔ہرگز بھروسے کے لائق نہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ عالم بشریت انسان ہی کے لیے تخلیق ہوا ہے مگر انسان یہاں رہنے کے لیے نہیں ہے۔اُسے ایک نہ ایک دن یہاں سے جانا ہے۔اُس کے اثاثے، مال و

دولت اور عیش و آرام فنا ہو جانے والے ہیں۔منور ہاشمی کے نزدیک حسن، جوانی، شان و شوکت، نخوت، شوخی، ناز و ادا، غرور و تکبر، نشہ و سرور، نام و نمود، سب کچھ ایک دن فنا ہو جائے گا۔وہ حیرت سے کہتے ہیں کہ جانے لوگ کس سمت کو روانہ ہو رہے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ شہر میں، میں ہی ایک درد کا مارا باقی رہ گیا ہوں۔شعرا کے ہاں موت کے موضوع پر اشعار دو طرح کی فکر کے حامل ہوتے ہیں۔ایک کیفیت تو وہ ہوتی ہے کہ جب انسان جیون کی کٹھنائیوں، دکھ درد اور مسلسل سانحات کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور گھبرا کر موت کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ایسی شاعری بالخصوص پُر عزم نوجوان نسل کی فکر کے لیے زہر قاتل ہوتی ہے کہ اُن کے آگے ابھی جدوجہد کے لیے زندگی کا وسیع میدان ہوتا ہے۔فانی بدایونی کے کلام میں ایسے اشعار کی بہتات ہے۔موت کے حوالے سے شعرا کی فکر کا دوسرا پہلو یہ ہوتا ہے کہ جس میں زندگی اور اُس کے متعلقات کی بے ثباتی پر بات کی جاتی ہے۔ڈاکٹر منور ہاشمی کے کلام میں بھی آخر الذکر پہلو نمایاں ہے۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے:۔

جانے کس سمت ہوئے لوگ روانہ سارے
ایک میں شہر میں ہوں درد کا مارا باقی

دن کے تین پہر میں جس کے سر پہ پاؤں رکھوں
شام کے وقت میں اُس مٹی کے تودے میں دب جاؤں

کاندھوں پہ لے کے چل دیے ہم محملِ حیات
اور موت ہم کو دور کھڑی دیکھتی رہی

حسن ، جوانی ،شوکت ،شان کُلُّ مَنْ عَلَیْھَافَان
خالق مالک کا فرمان کُلُّ مَنْ عَلَیْھَافَان
نخوت، شوخی، ناز، غرور، طاقت، نشہ اور سرور
نام ، نمود، نمائش ،آن کُلُّ مَنْ عَلَیْھَافَان

حادثوں سے رہے آمنا سامنا ، زندگی ہے یہی
موت کے کھیل میں جان کر ہارنا، زندگی ہے یہی

مری زندگی کا حاصل ہے یہ تجربہ منوّر
کہ ہیں رابطے ابد کے یہی راستے اجل کے

موت کا تصور، انسان کو اخلاقیات کی بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔مولانا الطاف حسین حالی کا اپنا ایک ادبی

مکتبِ فکر تھا۔ وہ جس عظیم مقصد کے لیے کام کر رہے تھے، اُس کی سچائی اور حالی کے خلوص و نیک نیتی پر ہرگز شک و شبے کی گنجائش نہیں، انہوں نے قومی اخلاق کو سدھارنے کے لیے سادہ اور عام فہم اصلاحی نظمیں لکھیں، دوسروں کو بھی لکھنے کی دعوت دی اور مروجہ غزل کے نقائص واضح کرنے کی کوشش کی مگر کیا سب غزلیں رکاکت اور فحش گوئی پر مبنی ہوتی ہیں؟۔ چند ایک ادبا و شعرا کے سوا اُن کی اصلاحی تحریک کو زیادہ پذیرائی نہ ملی۔ اگر ایسا ہوتا تو میر، حسرت، جگر، فانی اور اصغر جیسے شعراؑ کی غزل آج تک زمزمہ پیرا نہ ہوتی۔ اس حد تک ضرور ہے کہ اُردو شاعری میں فلسفۂ اخلاق کسی نہ کسی طور ہر عہد میں موجود رہا ہے۔ مولانا ظفر علی خان، خوشی محمد ناظر، اقبال، غلام بھیک نیرنگ وغیرہ کے ہاں اخلاقیات پر گراں قدر کلام ملتا ہے۔ ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزلیات میں صبر، انصاف، خوشامد، جھوٹ، رقابت، جاہ و حشمت کی تندیا، نیکی و بدی، خیر و شر، منافقت اور انسان دوستی کے جذبے پر اشعار ملتے ہیں جو اخلاقی بلندی اور کردار سازی کا محرک بنتے ہیں۔ ہر انسان دوست شخص اخلاقیات کی بات ضرور کرتا ہے اور اُن تمام کاموں کو عیب گردانتا ہے جو انسان سے نفرت کا درس دیتے ہوں۔

اسی یقین پر ہر ظلم سہتے رہتے ہیں
کہ شاخِ صبر پہ اک دن ثمر بھی آئے گا

کتنے ہی جھوٹ گھڑ کے سنائے گئے مجھے
بس ایک جھوٹ مجھ سے چھپانے کے واسطے

رقابت میں بہت آگے نکل جانا نہیں اچھا
جو میرا ہو نہیں سکتا کسی کا ہو نہیں سکتا

ہم فقیروں سے دور رہتی ہے
حشمت و جاہ و مال کی خوشبو

جبیں پہ داغ ہے روشن سجود کا بے شک
چراغِ دل کا فروزاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اذان روح کے معبد میں ہو بلند کوئی
یہاں صلوٰۃ کا ساماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

برائی کے عوض نیکی مؤثر مل نہیں سکتی
جہاں کانٹا کوئی بوئے وہاں کانٹا ہی اُگتا ہے
حق کی خاطر پیش کریں جو اپنی جان کا نذرانہ
زندہ رہنے والوں سے بھی بڑھ کر زندہ رہتے ہیں

ظلم کے سیلِ خوں میں اک دن ظالم بھی بہہ جاتا ہے
لشکر مر جاتا ہے اور رہبر زندہ رہتے ہیں

جیون کی کٹھنائیوں سے گزر کر دھیمے اور نرم لہجے اور سادگی کے ساتھ اپنے تجربات کو بیان کر دینے کی ایک خاص قدرت اُن میں پائی جاتی ہے۔انہوں نے ایامِ گزشتہ کی تلخی اور شیریں و تلخ مشاہدات و تجربات کو آتشِ دل سے پگھلا کر اظہار کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ اُن کا اپنا ایک شاعرانہ مزاج، اپنی ڈکشن اور اپنا لہجہ ہے۔اُن کے کلام میں عشق و محبت کی سرمستی کی جو خاص کیفیت ملتی ہے یا غزل کا جو کلچر پایا جاتا ہے اُسے غزل کی تہذیب کا نام دینا چاہیے جو در حقیقت منور ہاشمی کے مزاج کا اظہار ہے۔ بہت سے احباب غزل کہتے ہیں جس میں کسی خاص کیفیت یا اُن کے مزاج کا اظہار نہیں ہوتا، اس لیے کہ وہ اظہار کے سانچوں میں تجربوں کو بیان نہیں کرتے۔ زمانے کی چیرہ دستیاں، زندگی پر چھائی ہوئی مُردنی، سب ضمیر صیدِ مصلحت، سرخمیدہ، حیات گویا جبر کا صحرا اور صحرا بھی بے آب، چھاؤں کی آرزو مگر دھوپ کی سازش ایسے میں شاعر کی بے کلی اور تلخ لہجہ کربِ آگہی کی وجہ سے ہے مگر کوئی کرب، دکھ سکھ، کٹھنائی یا دشواری اُن سے شعر گوئی کا شائستہ سلیقہ نہیں چھین سکی کہ اُن کے تجربات تشنۂ اظہار یا گونگے رہ جاتے۔ اُن کے کلام میں ہمارے سماج، معاشرت اور معاش کے حوالے سے کچھ ایسی صداقتیں بھی ملتی ہیں جن میں کربِ آگہی کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

نہ میں ڈھونڈتا کسی کو نہ میں جانتا کسی کو
مری بے کلی کا باعث مرا کربِ آگہی ہے

اک طرف تُو اور تیری ساری چیرہ دستیاں
اِک طرف میں اور میری شاعری اے زندگی
سر خمیدہ اور صید مصلحت تیرا ضمیر
سر کشیدہ ، بے خطر میری خودی اے زندگی
مسکرا کے جس نے بھی اِک لمحے کو دیکھا مجھے
میں سمجھ بیٹھا اسے بھی زندگی اے زندگی

حیات جبر کا صحرائے بے کراں جس میں
محبتوں کے شجر کا کہیں بھی سایا نہیں

چھاؤں کی خواہشیں ،دھوپ کی سازشیں، جسم جلتے رہیں
ایک صحرائے بے آب میں گھومنا، زندگی ہے یہی

ہم صداقت کے علمبردار ہیں لیکن یہاں
جھوٹ جو کہتا رہا وہ شخص اچھا رہ گیا

زندگی جن ساعتوں کا نام تھا اے دوست ہم
جستجو ان ساعتوں کی عمر بھر کرتے رہے

گھر اپنے جب شام کو لوٹ کے آیا خالی ہاتھ
میری جانب دیکھ رہے تھے سب بچے خاموش

آج منور جیب میں جو کچھ تھا بازار کی نذر ہوا
ہم جو دفتر سے اٹھے تھے گھر جاتے تو اچھا تھا

ٹی ایس ایلیٹ نے اپنے ایک مضمون ''شاعری کا سماجی منصب'' میں ایک بات پتے کی کہی ہے۔وہ کہتا ہے۔۔۔ہمارا شعور وادراک جیسے جیسے ہمارے گردوپیش کی دنیا بدلتی ہے،خود بھی بدلتا رہتا ہے۔مثلاً اب ہمارا شعور وادراک وہ نہیں ہے جو چینیوں کا ہندوؤں کا تھا۔بلکہ وہ اب ویسا بھی نہیں ہے جیسا کئی سو سال پہلے ہمارے آباؤاجداد کا تھا۔یہ ویسا بھی نہیں ہے جیسا ہمارے باپ دادا کا تھا۔بلکہ ہم خود بھی وہ شخص نہیں ہیں جو ایک سال پہلے تھے۔'' ہر عہد کی اپنے مخصوص رجحانات ہوتے ہیں۔ان کی شناخت، واقفیت اور گرفت ہی اصل فنکار کا کام ہوتا ہے اور اُس کی فنکارانہ فرائض کا تخلیقی اظہار۔منور ہاشمی نے اپنی شاعری کے بنیادی مذکورہ بالا موضوعات کے علاوہ بہت سے مقامات پر ایسے اشعار ضرور کہے ہیں جو قاری کے ذہن پر شعور کی دستک دیتے ہیں۔موصوف کے ایسے کلام بہت حد تک اُن کے تجربات و مشاہدات کی عکاسی کرتے ہیں۔وہ اسے ماحول، سماج اور معاشرت کا حصہ ہیں۔انہوں نے دنیا کو شعور کی عینک سے دیکھا بھی ہے، برتا بھی ہے اور یوں کہنا چاہیے کہ ناچاہتے ہوئے گوارا بھی کیا ہے۔اس لیے ان تمام باتوں کا شعری اظہار سماجی ،معاشرتی و معاشی حقیقت نگاری پر مبنی ہے۔بے شک یہ ایک جہاں دیدہ شخص کے مشاہدات پر مبنی علم و حکمت کے موتی ہیں جن سے ادب کے

سنجیدہ قارئین استفادہ کرتے رہیں گے۔

نکلا جو زباں سے تو ہوا لفظ پرندہ
اک پل میں پہنچ جاتی ہے ہر بات کہیں اور

بڑھتا جاتا ہے بہت کارِ جہاں روز بروز
گھٹتی جاتی ہے مگر عمرِ رواں روز بروز
ایسا ملبوسِ یقیں ہم کو ملا ہے جس میں
لگتے ہی رہتے ہیں پیوندِ گماں روز بروز
حرمتِ حرف کہاں، عصمتِ خامہ ہے کہاں
قحطِ افکار کے پیدا ہیں نشاں روز بروز

کتنی تعداد میں مہر و مہ و انجم کھائے
پھر بھی دل سیر، نظر سیر نہیں ہے دنیا
میں کسی حال میں دنیا کا ہو نہیں سکتا
دوستو، میری نہیں، میری نہیں ہے دنیا
اس کے بارے میں منوّر کبھی سوچا بھی نہیں
ہم فقیروں سے بہت دور کہیں ہے دنیا
کتنے افکار کو ملتا نہیں لفظوں کا لباس
لفظ کتنے ہیں جو محرومِ بیاں رہتے ہیں

اُن کے ہاں ایسی غزلیات کی کمی نہیں جو کسی بھرپور کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ایسی غزلوں کے کئی اشعار انفرادی طور پر پُر اثر بھی ہیں مگر پوری غزل میں جو کیفیت ہے وہ پہلے مصرعے سے آخری مصرعے تک برقرار رہتی ہے۔ یہ اُن کے بیان کا حسن ہے کہ متعدد اشعار ایک ہی موضوع مثلاً خواہشِ دید، بے ثباتی، ہجر اور جمالیات یا ایک ہی فضا میں ہونے کے باوجود نئے اور دل کش محسوس ہوتے ہیں۔ اگرچہ غزل کا مزاج منتشر خیالی ہوتا ہے مگر منور ہاشمی نے تسلسل بیان سے بھی کام لیا ہے اور اکثر غزلیں ایک ہی کہانی سناتی محسوس ہوتی ہیں اور مسلسل ہیں۔ اگرچہ غزل کی اصلی خوبی مضمون کا تسلسل نہیں ہوتا مگر اُن کی کچھ غزلیات میں جذبہ و آہنگ کا لطیف تسلسل بہر حال آ گیا ہے۔ اُن کی کلیات میں شامل زیرِ نظر غزلیات ایک ہی کیفیت میں کہی گئی ہیں۔

اپنی کہاں کہاں نہ کمند نظر گئی
ہر قریہ، بام بام تجھے ڈھونڈتے رہے

کچھ دیر تو میں جا کے رہا تیری گلی میں
اب تک ہے مگر حشر بپا تیری گلی میں

وادی، دامن اور کہسار، ہر منظر میں رنگ ہزار
غنچے، پھول اور چمنستان کُلُّ مَنْ عَلَیْھَافَانْ

جب زمانے میں فقط افسردگی رہ جائے گی
میری آنکھوں میں کرن امید کی رہ جائے گی

غم زندگی کی اساسی شے کہی جا سکتی ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں المیہ یا ٹریجڈی ہی سے عظیم ترین ادب تخلیق پایا ہے اور اسی کا مرتبہ اعلا رہا ہے کیوں کہ اس سے شعر میں حسن، دل کشی اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ عاشقانہ شاعری کو درد و غم سے جدا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس لیے کہ اکثر نارسائی، نا آسودگی اور ہجر و فراق ہی انجامِ محبت ہوتا ہے۔ لہٰذا جس سے محبت کی جاتی ہے، اُس کے ہجر و فراق کے صدمے بھی اٹھائے جاتے ہیں۔ درد و غم سہا جاتا ہے۔ گویا درد و غم تکمیلِ عشق کی علامت ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غم حقیقتوں کو بے نقاب کرتا ہے، اس لیے غم کے بغیر شخصیت ادھوری رہ جاتی ہے۔ یہ سخن وری ہی نہیں شخصیت میں بھی نکھار پیدا کرتا ہے۔ خوشی کے لمحات گریز پا ہوتے ہیں جب کہ درد و غم کا تاثر دیر پا ہوتا ہے۔ منور ہاشمی کے اشعار کی تہوں میں غم کا ایک ایسا جذبہ پنہاں ہے جو اُن کی روح کو سرشار اور مسرور کر دیتا ہے۔ لطف کا سرچشمہ ہے۔ یہی وہ غم ہے جس کے سہارے عاشق کی زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ وہ اسی غم کو حاصلِ عمرِ رواں خیال کرتے ہوئے جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور اُس کے بدلے ساری خوشیاں بانٹ دینے کو تیار ہیں۔ غم کی چھاؤں میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے گلوں اور گلزاروں سے کیا لینا دینا میں تو اپنے ہی غم کدے میں خوش ہوں۔ میری شاعری کیا ہے؟ مری زندگی کیا ہے، صرف یہ کہ مجھے درد سے الفت ہے اور غم سے دوستی ہے۔ خوشی محض ایک منزل ہے، جس کے آگے کوئی راستہ نہیں بلکہ منزل آشنا ہونے کے بعد بھی انسان ایک کمی یا تشنگی کا احساس لیے ہوئے ہوتا ہے۔ غم تخیل اور سوچ کے نئے نئے در وا کر دیتا ہے۔ اس سے عرفانِ ذات ہی نہیں شعور و ادراک کے نت نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ انسان مردم شناس کہلانے لگتا ہے۔ یوں کہیے کہ غم غارت گر نہیں کردار ساز بھی ہے۔ شرط یہ ہے کہ ذاتی درد و الم کی دولت کو شاعر اپنے سخن کی لطافت اور تاثیر میں اضافے کے لیے کام میں لائے۔ اُسے خود پر طاری کر کے غم پرست اور قنوطی نہ ہو جائے کہ جس کی اگلی

منزل فانی بدایونی جیسی پژمردگی اور جیون بیزاری اور خواہشِ مرگ ہوتی ہے۔

گلوں میں اور گلزاروں میں کیا ہے
میں اپنے غم کدے ہی میں ملوں گا

پہن لی کرب کی پوشاک راہِ ہستی میں
ہم اپنے واسطے خود ہی عذاب لے کے چلے
جدھر جدھر سے بھی گزرے بچھا دیا سیلاب
ہم اشک لے کے چلے یا چناب لے کے چلے

کچھ اس طرح سے بسر کی ہے زندگی میں نے
غموں کی چھاؤں میں ڈھونڈی ہے سرخوشی میں نے

غبارِ غم کو دھونا چاہتا ہوں
میں تھوڑی دیر رونا چاہتا ہوں

آہوں کی گرمی کا موسم اور آنکھوں کی برکھا رت
غم کی دھوپ میں ارمانوں کا ڈھلتا سایہ یاد کرے

عموماً درد میں آتی ہے شدت
دلاسا دیں اگر غم خوار میرے

منور ہاشمی اول و آخر غزل کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں بھی متعدد بار اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ غزل کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تجھ سے میرا وقار ہے۔ تیری رگوں میں میرا خونِ جگر دوڑ رہا ہے۔ تجھ سے میرا پیار کا پیمان ہے، اس لیے میں نے تجھے اپنے شباب کے تمام رنگ دے دیئے۔ میں اور تو لازم وملزوم ہیں۔ مجھے اپنے اشعار پر مان ہے، اس لیے کہ تجھ میں مری فکرِ رسا کارفرما ہے۔ وہ موضوعاتی تنوع اور رفعتِ خیال کے بڑے شاعر غالب سے محبت کرتے ہیں۔ جس کا ثبوت غالب کی زمین میں کہی گئی اُن کی کئی غزلیات ہیں۔ جنھیں وہ عجزِ ہنر کا نام بھی دیتے ہیں۔ اہلِ ہنر کو عام طور پر، اُن کی زندگی میں ناقدریٔ فن کا شکوہ رہتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ کئی بڑے شعرا کی عظمت کو اُن کی وفات کے بعد پہچانا گیا۔ غالب اور میر انیس جیسے نابغۂ روزگار نے ناقدری کا شکوہ کیا۔ موصوف نے اس اعتماد کا اظہار کیا ہے کہ اُن کا فنِ شعر گوئی انھیں ادب کے قارئین میں ضرور زندہ و جاوید رکھے گا۔

میرا انداز سخن اور زمین غالب
ایک بس عجز ہنر اس میں ہے پنہاں میرا

تُو ہے مذاقِ شعر کا عنوان اے غزل
تسکین جسم و روح کا سامان اے غزل
تیری رگوں میں ہے رواں خونِ جگر مرا
تیرا جمال ہے مرا فیضان اے غزل
میں نے شباب کے تجھے سب رنگ دے دیے
تجھ سے ہوا تھا پیار کا پیمان اے غزل
تیرے ہر ایک شعر میں فکرِ رسا مری
مجھ کو ہر ایک شعر پہ ہے مان اے غزل
تجھ سے مرے تعلقِ خاطر کی دین ہے
میرا شعور اور مرا وجدان اے غزل
کتنے تیری تلاش میں خود سے گزر گئے
کتنوں کو اب ہے وصل کا ارمان اے غزل
تیرے ذرا سے لمس نے کیا کچھ بنا دیے
وہ لوگ جو تھے عام سے انسان اے غزل
مجھ کو تمام عمر کے بخشے ہیں رت جگے
مجھ پر کیا ہے تُو نے یہ احسان اے غزل
اس شب نہ جانے کتنی کتابیں رقم ہوئیں
جس شب ہوئی تھی تُو میری مہمان اے غزل
اک دوسرے کے واسطے ہیں دونوں لازمی
میں تیرا جسم تُو ہے میری جان اے غزل

غزل میں زبان، فکر اور ہیئت کے تجربات ہوتے رہے، کچھ ہی وقت بیتا تو پامال اور فرسودہ کہلائے۔ ہر عہد میں شاعر کی رعنائی خیال کا انحصار محبوب کے حسن پر رہا۔ لاشعور انسان کا وہ اثاثہ ہے جو ابتدائے آفرینش سے آج تک نسل در

نسل منتقل ہوتا آیا ہے اور رومانیت وہ چیز ہے جو ہمارے لاشعور میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ لہذا انسان کا رومانوی ہونا بالکل فطری عمل ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ یہ چیز انسان کو کسی نہ کسی طور متاثر نہ کرے۔ ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزل میں جو مغموم اور افسردہ سی مخصوص فضا ہے وہ اُن کی داخلی کیفیات اور تمدنی احوال کی عکاس ہے۔ انہوں نے عشق کے دائمی جذبے کو اپنے گرد و پیش اور عہد کے مروجہ اخلاقی حدود و قیود کے دائرے میں پیش کیا ہے۔ اُن کی غزلوں میں رومانی کیفیات رواں دواں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ حسن و عشق کی دنیا کے تعلق کو فراموش نہیں کرتے، جن کی تہہ میں اُن کے صادق جذبوں کی کارفرمائی ہے۔ جدید سائنسی ایجادات بہتر طور پر نظم کا حصہ بنائی جاسکتی ہیں مگر کامیابی سے غزل کا موضوع نہیں بنائی جاسکتیں۔ غزل میں سائنسی ادب والے بھی زیادہ تر اجرامِ فلکی، چاند ستاروں، اور کہکشاؤں پر ہی بات کرتے نظر آتے ہیں۔ اس لیے ڈاکٹر منور ہاشمی نے اگرچہ کہیں کہیں فکر و فلسفہ، اخلاق و حکمت اور تصوف کو موضوع بنایا بھی ہے تو صرف گوارا کرنے کی حد تک اور حسن و عشق کی داستان کے سوز و گداز ہی سے قاری کی دکھتی رگوں کو چھیڑا ہے کہ حسن سے زیادہ دل اور تخیل کو کچھ اور متاثر نہیں کرتا۔

بے ساختہ غزلیں

شجاعت علی راہی

بعض شعری مجموعوں کے عنوان اور شعری کاوشوں کے مواد میں رشتہ تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کرنا۔ یوں تو ہر قاری اپنے علم وہنر کی مناسبت سے کوئی نہ کوئی رابطہ ورشتہ تلاش کر ہی لیتا ہے لیکن ایسے میں ایک قاری اور دوسرے قاری کی رائے میں بالعموم قطبین کا سا بُعد ہوتا ہے۔

منور ہاشمی کے شعری گلدستہ ''بے ساختہ'' میں جو بے ساختگی ہے، اُس سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔ بے ساختگی اُن کے یہاں اپنی تمام تر لفظی ومعنوی خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یوں اُن کا منتخب کردہ عنوان واقعی معتبر ٹھہرتا ہے۔ اُن کے اسلوب میں ان کا سا بہاؤ ہے اور اُن کی سادگی میں پرکاری سی پرکاری ہے:

جسے سوچا تھا میں نے زندگی بھر
ملا ہے آج وہ مجھ سے گھڑی بھر
بچھڑنا ہے تو پھر اک بار یوں مل
کہ رکھوں یاد پھر میں زندگی بھر

ہوا کا جھونکا تھا آیا، گزر گیا جاناں
مگر وہ ریت کا گھر تو بکھر گیا جاناں

اُس طرف بھی انتہا ہے اِس طرف بھی انتہا
وہ بھی کم ہنستا نہیں اور میں بھی کم روتا نہیں

دلوں پر ضابطے لاگو بہت ہیں
مگر جذبات بے قابو بہت ہیں
مری آنکھو! تمھیں اب جاگنا ہے
مقدر کا ستارہ سو گیا ہے

منور ہاشمی کو نہ تو لفظوں کا میلہ لگانے کا عارضہ لاحق ہے اور نہ ہی انھیں جدیدیت اور علامت کے گورکھ دھندوں میں مبتلا کرنے کا خبط ہے۔ بعض شعرا اپنے اشعار میں رنگ برنگے، حیرت انگیز الفاظ کی دھنک سجا کر بھی جو مقصد حاصل نہیں کر پاتے، منور ہاشمی وہی مقصد عام فہم اور سیدھے سادھے الفاظ میں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کے

یہاں تخلیق کار اور قاری کے مابین ترسیل کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔اس اعتبار سے وہ میر کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں کہ بات سیدھے سبھاؤ پیش کی جائے۔یوں اُن کے کلام میں ''از دل خیزد و بر دل ریزد'' والی کیفیت بھر گئی ہے اور اُن کی غزل شُد ھ سُروں کی شاعری بن گئی ہے:

کہنے والوں کو کچھ خبر ہی نہیں
سننے والوں پہ کیا گزرتی ہے
آنکھ میں بھی سوال ہوتے ہیں
خامشی بھی کلام کرتی ہے
وہاں کیوں رابطے دل کے بڑھائیں
ہمیں جس شہر میں رہنا نہیں ہے
نظر کا کوئی بھی انداز رکھ لو
تمھارا دیکھنا بھی کم نہیں ہے

عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ جب غزل کو داخلی کوائف کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو اس میں ابہام در آتا ہے یا پھر اس میں جذباتیت کا عنصر اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ قلم کار کی ذہنی کیفیت پر شبہ ہونے لگتا ہے مگر منور ہاشمی کے یہاں ابہام کی کوئی چیز نہیں ملتی ،نہ ہی یہاں جذباتیت کی کثافت نظر آتی ہے بلکہ ہر لحہ ایک سنبھلی ہوئی کیفیت کا احساس ہوتا ہے:

گردشِ دوراں کا کہنا مان کر
سو گیا میں غم کی چادر تان کر

اگرچہ موت ہے زخموں کا مرہم
مگر میں زندگی کا ساتھ دوں گا

منور ہاشمی نے اپنی شعری کائنات کم وبیش داخلی تجربوں اور وارداتِ قلبی پر استوار کی ہے۔اُن کے یہاں جو بار بار صیغۂ واحد متکلم استعمال ہوا ہے،اس سے ان کے داخلی معروضات اور ذاتی سیاق وسباق کے خدوخال ابھرتے ہیں:

یا نہ چھینے کوئی دستارِ فضیلت مجھ سے
یا کوئی میرا بدل ڈھونڈ کے لایا جائے

زمانہ میرے قدموں میں پڑا تھا
مگر میں اس سے بچ کر چل رہا تھا

اساسِ زندگی میں جس پہ رکھوں
مرے حصے میں وہ لمحہ نہیں ہے

اُن کے یہاں داخلیت گاہے گاہے عصرِ حاضر کے اجتماعی مسائل سے آگاہی کا پرتو بھی بن جاتی ہے:

میں سر کہاں چھپاؤں گا اس تیز دھوپ میں
وہ موم کا مکان تو کب کا پگھل گیا

گھر کا احساس نہ تھا اپنے ہی گھر میں مجھ کو
ایک دیوار تو تھی ، سایۂ دیوار نہ تھا

نغمگی اور خوش آہنگی تخلیقِ شعری میں جمالیاتی انبساط کا سبب بنتی ہے اور انسان کے حیاتی نظام پر اس کے بڑے حسین اثرات مرتب ہوتے ہیں لیکن میدانِ سخن میں ایسے قلم کاروں کی کمی نہیں ہے جو سخنوری کی تہمت اُٹھائے پھرتے ہیں۔ تغزل اور موسیقیت انھیں چھو کر بھی نہیں گزرتی اور وہ ہیں کہ شاعری کیے چلے جاتے ہیں۔ آہنگ کا انحصار لفظوں کی دروبست پر ہوتا ہے۔ اگر دروبست متناسب ہو تو مصرعے پر لگا کر اُڑتے ہیں۔

منور ہاشمی کی غزل لفظوں کی خوب صورت شیرازہ بندی کا نام ہے۔ ہمارے اس شاعر نے غزل کی لسانی حرمت کو برقرار رکھتے ہوئے جو ایک غنائی پیرایہ اختیار کیا ہے، اس سے ان کی شاعری سراپا خوش آہنگ ہوگئی ہے:

اک گوشۂ تسکین میں ہم سوئے ہوئے ہیں
پہلو میں ہمارے کئی غم سوئے ہوئے ہیں

اک ذرا سوچنے کی فرصت ہے
اس کو بھی وہ چرا نہ لے جائے
اے دلِ درد آشنا، تجھ کو
کوئی ناآشنا نہ لے جائے

منور ہاشمی نے اپنے ڈکشن کی اساس روایت پر رکھی ہے لیکن اس میں جدید اسلوب اس طرح تحلیل ہوگیا ہے کہ لفظوں کے رگ و ریشے سے روایتی اور جدید پیرائے کو الگ الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔

الفاظ بذاتِ خود بے جان اور غیر مرئی ہوتے ہیں لیکن سخنوران میں تخلیقی روح اور توانائی پھونکتا ہے۔ اس تخلیقی عمل میں الفاظ کو جتنا تہہ دار بنایا جائے، اُن کا تاثر اور اعتبار اُتنا ہی فزوں ہوتا ہے۔ منور ہاشمی کے اشعار میں تخلیقی آہنگ تو ملتا ہے لیکن بعض مقامات پر الفاظ سے معنی کی توسیع کا کام نہیں لیا گیا اور انھیں صرف تجربے کی عکاسی یا تشریح ہی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

منور ہاشمی کی غزل کی ایک نمایاں صفت اُن کے اشعار میں طنز کی ایک ابھرتی ڈوبتی لہر ہے۔ اُن کی غزل کے تیور اُس وقت دیدنی ہوتے ہیں جب وہ اپنے شعروں کو طنز کے تیکھے پن میں ڈبو کر نکالتے ہیں۔ طنز کی لہر کبھی تو اُن کے اشعار کی زیریں سطح پر چھپی ہوئی ہوتی ہے تو کبھی بالائی سطح پر اُبھر آتی ہے۔ کہیں ہمارا یہ شاعر تبسم زیرِ لب نظر آتا ہے تو کہیں بذلہ سنجی پر تل جاتا ہے اور کہیں وہ طنز کو تلوار بنا دیتا ہے:

ہم جاگ بھی اُٹھے تو کوئی حشر نہ ہوگا
ہم لوگ ہیں وہ جن کے کرم سوئے ہوئے ہیں

ایک پتھر ہوا ہے دل میرا
تیرے سانچے میں ڈھل چکا ہوں میں

میں اُس سے صلح کرنا چاہتا ہوں
مرا دشمن مرا ہم سر نہیں ہے

ہر ایک شخص پریشاں مگر یہ خندہ بلب
یہ کیسے لوگ ہیں، اس گھر میں کیسے آئے ہیں

وہ ایک شخص جسے بھول بھی گئے سب لوگ
وہ ایک شخص ابھی زندگی کی قید میں ہے

اُردو غزل کی آبرو: منور ہاشمی

ڈاکٹر فرحت عباس

آج کے منظرِ سخن پر جب نظر پڑتی ہے تو غزل کے حوالے سے منور ہاشمی نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ غزل کا معتبر نام منور ہاشمی جن کا کلام بے بدل ہے۔ یہ بات ناقابلِ تردید ہے کہ منور ہاشمی اُردو کے نمایاں ترین غزل گو شاعروں میں شامل ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ غزل کی آبرو ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ ان کی غزل پڑھیں تو فکر و فن کی بلندیوں پر فائز دکھائی دیتے ہیں۔ سادہ مزاج اور درویش صفت منور ہاشمی خوب صورت شعری اسلوب رکھتے ہیں۔ ان کی غزل میں وہ سارے رنگ موجود ہیں جو کسی بھی ذہن کی اعلیٰ ترین شاعری میں ہوتے ہیں۔ میں اگر یہ کہوں کہ وہ غزل کے میدان میں عہد ساز حیثیت رکھتے ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ ان کی غزل میں انفرادیت ہے۔ ان میں کسی دوسرے شاعر کا عکس تک نہیں ملتا۔ انھوں نے ایک سخن کی نگری خود بسائی ہے جس میں ان کی سوچ کا انداز منفرد ہے اور انھوں نے اپنی سوچ کو جدت کے سانچے میں ڈھال کر شعر تخلیق کیے ہیں۔ ان کا کلام پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح غزل کے جہانِ نو میں بہار کے پھول کھلا رہے ہیں۔
منور ہاشمی غزل گوئی میں کس اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں، ان کے کلام سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، وہ کہتے ہیں:

رقابت میں بہت آگے نکل جانا نہیں اچھا
جو میرا ہو نہیں سکتا، کسی کا ہو نہیں سکتا

مجھے تو اپنے مارِ آستیں سے بھی محبت ہے
وہ ڈستا ہے مگر، مجھ سے پرایا ہو نہیں سکتا

لہو کا ایک بھی قطرہ ہے اپنے جسم میں جب تک
گلستاں میں گلوں کا رنگ پھیکا ہو نہیں سکتا

کوئی اولاد کو بیچے منوّر کیسے ممکن ہے
میں زندہ ہوں مری غزلوں کا سودا ہو نہیں سکتا

منور ہاشمی کی غزلوں میں سوچ فکر کے مناظر تازہ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ رجعت نہیں بلکہ جدت پر یقین رکھتے ہیں اور تازہ ہوا میں تازہ خیال کی پرورش کرتے ہوئے تازہ سوچ کو اشعار کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ کرۂ ارض جدتوں کا گھر

ہے، یہاں ہر معاملے میں پیش رفت ریت بن گئی ہے۔ لگتا ہے کہ منور ہاشمی سامری جادوگر کی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جو پیچھے مڑ کر دیکھے گا، پتھر ہو جائے گا۔ ان کی غزل میں ایک جہانِ نو آباد ہے اور فکرِ جدید کے جلوے ہیں۔ منور ہاشمی کی سوچ میں تجربہ اور خلوصِ نیت شامل ہے، اس لیے وہ دل پر خوب اثر کرتی ہے۔ ان اشعار میں ان کا اسلوبِ سخن بلندیوں پر دکھائی دیتا ہے:

لذت ہر ایک درد کی زخمِ جگر میں ہے
زخمِ جگر کا عکس مری چشمِ تر میں ہے
نکلا جو میں سفر پہ تو ایسا لگا مجھے
ہمراہ میرے سارا زمانہ سفر میں ہے
کس کی نظر کے زیرِ اثر ہے وہ ایک شخص
میرا وجود جس کی نظر کے اثر میں ہے
مانا مری جبیں میں تڑپ ہے سجود کی
لیکن کشش عجیب ترے سنگِ در میں ہے

خیال کی بلندی، سوچ کی گہرائی اور بیان میں ابلاغ معیاری شاعری کی پہچان ہیں۔ اگر اشعار فکرِ نو سے لاتعلق ہوں تو وہ اثر نہیں رکھتے۔ الفاظ میں حسنِ انتخاب غزل کو چار چاند لگا دیتا ہے اور جب حسن وعشق کے ذکر کے ساتھ غمِ جہاں کی بات کی جائے تو ایسی شاعری ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ منور ہاشمی کی غزل میں یہ تمام خصوصیات شامل ہیں۔ وہ لفظی ترکیب اس طرح کرتے ہیں کہ وابستگی کا سماں بندھ جاتا ہے اور قاری ہر مصرعے کو اپنی ذات سے جڑا پاتا ہے۔ منور ہاشمی نے حالات کے جبر اور وقت کی سفاکی کا خوب صورت انداز میں حوالہ دیا ہے لیکن یہ بات کرتے ہوئے جدت کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھا ہے۔ جدت کے ہر رنگ میں انوکھا پن ہوتا ہے اور جب جدت کے رنگ دھنک ہو جائیں تو اس کی خوب صورتی عروج کو چھونے لگتی ہے۔

اگر ہم آج کی غزل پر نظر ڈالیں تو ہمیں جو شعرا غزل کا سنگھار نظر آتے ہیں، ان میں منور ہاشمی بھی شامل ہیں۔ وہ ایک نامور اہلِ قلم ہونے کے ساتھ دانش ور مفکر بھی ہیں، اس پر طرہ یہ کہ وہ استاد بھی ہیں۔ نئی نسل کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا ان کا پیشہ ہی نہیں فرض اور لگن بھی ہے۔ منور ہاشمی الفاظ اور بیان کو ہم آہنگ کرنے کا فن جانتے ہیں۔ وہ ہر طرح اور ہر سطح کے قارئین کے لیے قابلِ فہم شاعری کرتے رہے ہیں۔ عام فہم اشعار ہمیشہ مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیتے ہیں اور یہی مقبولیت شاعر کے لیے بے بدل سرمایہ ہوتی ہے:

میں جس کے واسطے خونِ جگر جلاتا ہوں
اسی کو پہلے پہل یہ غزل سناتا ہوں
میں شاخِ نخلِ تمنا وفا کے جنگل میں
ہوائے درد میں ہر وقت لہلہاتا ہوں

گلا میں کیسے کروں ایسے بھول جانے کا
میں اپنے آپ کو خود بھی تو بھول جاتا ہوں
میں اپنی ساری خوشی کس کے نام کر بیٹھا
یہ کس کا بارِ الم ہے جو میں اُٹھاتا ہوں
بتا رہی ہے مجھے میرے دل کی بے تابی
کہیں ضرور کسی سے میں پیار کرتا ہوں

منور ہاشمی کے یہاں کھرا پن ملتا ہے، وہ قنوطی سخن ور ہرگز نہیں ہیں، وہ اشعار میں رکھ رکھاؤ اور سلیقے کو آزماتے ہیں۔ان کے یہاں جلد بازی اور ہلکا پن نہیں ہے۔وہ اپنے اظہار میں مضبوط دلیل کو بھی شامل کرتے ہیں جس سے اظہار کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔منور ہاشمی نے دکھ، کرب، اداسی، ناامیدی اور غم کو شعر کیا ہے لیکن ساتھ ہی پیغامِ امید بھی دیا ہے۔ان کی غزل میں حرارتِ حیات اور قوتِ جذبہ وارادہ ہے جو پیغامِ زندگی دیتا ہے۔

ناقدین نے منور ہاشمی کی غزلوں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے درست کہا ہے کہ منور ہاشمی کی غزلوں کی چمک، جذبہ، قوتِ حرارت اور پیغامِ حیات میں مضمر ہے۔آشوبِ آگہی اور روحِ عصر کی خصوصیات سے مرصع ان کی غزلیں نئے جہاں اور زندگی کی نئی تعمیر کا حوالہ ہیں۔روابط اور رشتوں کی نوعیت، بدلے ہوئے نظام اور عمل اور ردِ عمل کے سلسلے میں نئے پیمانوں اور سانچوں کی آگہی کی وجہ سے ان کی غزلوں میں راہیں الگ نظر آتی ہیں۔نمایاں جدت طرازی اور تنوع کے ساتھ غزل کی منجھی ہوئی روایت کا نکھار بصد کیف جداگانہ ہے۔

شعریت، تغزل، معنویت، توانا تاثر، تازہ خیال اور بھرپور اظہار منور ہاشمی کی غزل کے بنیادی اجزا ہیں۔ان کا ہر شعر ایک ایسا تاثر قائم کرتا ہے جو پڑھنے والے کے لیے طمانیتِ قلبی کا باعث ہوتا ہے اور یہ کسی کسی کے کلام میں خوبی اور تاثیر ہوتی ہے کہ اس کی اثر انگیزی ایسی ہو کہ دیر تک قائم رہے۔وہ اپنی بات پورے اعتماد اور یقین سے کرتے ہیں کہ ہم عشق کا اعتبار اور زندگی کا وقار ہیں۔لیل ونہار کی گرد سہی لیکن غازہ نو بہار ہیں۔اگر دشمنوں کے لیے پیامِ مرگ ہیں تو یاروں کے یار بھی ہیں۔منور ہاشمی کے یہاں الفاظ کی ترتیب اس طرح سے ہے کہ اس سے غزل کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔وہ کہتے ہیں:

عشق کا اعتبار ہیں ہم لوگ — زندگی کا وقار ہیں ہم لوگ

گرد لیل و نہار ہے لیکن — غازۂ نوبہار ہیں ہم لوگ

سر پہ بارِ فلک اٹھائے ہیں — گو نحیف و نزار ہیں ہم لوگ

دشمنوں کے لیے پیامِ مرگ — اور یاروں کے یار ہیں ہم لوگ

زندگانی گنوا نہ دے ہم کو — حاصلِ روزگار ہیں ہم لوگ

اک سفر تیرگی میں جاری ہے — اس پہ شب بھر سوار ہیں ہم لوگ

حسن کی قدر ہے ہمیں معلوم — شاعروں میں شمار ہیں ہم لوگ

آئینہ دیکھنا بھی ہے مشکل — اس قدر شرمسار ہیں ہم لوگ

ہم منورؔ ہیں پاسباں گل کے
اس گلستاں میں خار ہیں ہم لوگ

منور ہاشمی نے غزل کے میدان میں نئے تجربات کیے ہیں لیکن وہ تجربات محسوس نہیں ہوتے بلکہ ان کی کہنہ مشقی کا اظہار دکھائی دیتے ہیں۔ شاعری تو قدیم صنفِ ادب ہے۔ صدیوں سے شاعری کی جا رہی ہے، ہر زبان اور ہر زمان میں کی جا رہی ہے۔ زمانہ تغیر کی زد میں ہے، قدریں بدل گئی ہیں تو شاعری بھی انہی مرحلوں سے گزرتی ہوئی عصرِ حاضر میں داخل ہو گئی ہے۔ زمانہ کی بدلی ہوئی صورت کے ساتھ غزل بھی اپنی جدید حالت میں اہلِ ذوق کو تسکین پہنچا رہی ہے۔ غزل کو آہنگِ جدید سے ہم کنار کرنے والے شاعر ہر زمانے میں سخنوری کرتے رہے ہیں اور آج کے دور میں غزل میں رنگِ جدید بھرنے میں منور ہاشمی بھی شامل ہیں۔ ان کو جدید غزل کے معماروں میں شامل کیا جاتا ہے۔

منور ہاشمی کا اسلوبِ شعر جادوئی اثر رکھتا ہے۔ اس کے ہر مصرعے کا انداز اور رُخ جدا ہے لیکن مجموعی بیان سے جڑا ہوا ہے۔ وہ داستان گو بھی ہیں، داستان گر بھی۔ ان کے الفاظ ان کی داستان کے کردار ہیں اور ہر کردار اپنی جگہ اہم اور دوسرے کرداروں کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ ان کی غزل میں مکالمہ بھی ہے اور نظریہ کا اظہار بھی۔ وہ انسانی اظہار کی ترجمانی کرتے ہوئے اس کو ایک پیغام کی صورت میں پڑھنے والوں تک پہنچاتے ہیں۔ ان کی غزل میں ابلاغ، غنائیت اور مدھرتا شامل ہے۔ ان کے خیالات کا جنگل اس قدر سندر اور حسین ہے کہ اس سے نکلنے کو دل نہیں کرتا۔

منور ہاشمی کا طرزِ اظہار صبح کی ہوا کی طرح تازہ اور معطر ہے۔ جب وہ آتشِ ہجر و فراق پر امید کی شبنم برساتے ہیں تو اس سے کچی مٹی کی سوندھی خوشبو اٹھنا شروع ہو جاتی ہے جو اداس لوگوں کو زندگی کی نئی لہر سے ہم کنار کر دیتی ہے۔ منور ہاشمی کے یہاں امید کے دیے ہمیشہ روشن رہتے ہیں اور وہ ان کو زمانے کی تیز ہواؤں سے محفوظ رکھنے کا فرض نبھاتے ہیں۔ ان کے یہاں آس کے جگنو مایوسی کے گھپ اندھیرے میں ہمہ وقت چمکتے ہیں:

ہم جیسے اہلِ شوق جدھر سے گزر گئے
ان سارے راستوں کے مقدر سنور گئے

آسان کس قدر ہے علاجِ غمِ حیات
دیکھا کسی نے پیار سے تو زخم بھر گئے

ہم کو ملی نہ پیار کی سوغات آج تک
ہم کاسۂ خلوص لیے دربدر گئے

☆☆☆

ہر اک پھول کی خاطر کلی کلی کے لیے
گہر فشاں ہے مری چشم ہر کسی کے لیے

ترے لبوں کا تبسم سدا رہے قائم
یہی ادا ہے بہت میری زندگی کے لیے

وصال اس کا میسر نہ ہو سکا مجھ کو
میں اپنے آپ سے بچھڑا جس اجنبی کے لیے

میں آخری ستارۂ شب کی مثال ہوں
میں ہوں نویدِ صبح مجھے احترام دے

ترے خیال نے بخشی جلا مرے فن کو
ہر ایک شعر تری یاد کا صحیفہ ہے

محبت کو بھول جانا اور محبوب کے خیال کو ترک کر دینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ چاہتوں کے بندھن سدا قائم رہتے ہیں۔ محبوب نظر کے سامنے نہ ہو تو مزاج زندگی ٹھیک نہیں رہتا۔ میں اس کو کیسے بھول سکتا ہوں، اس جیسا تو کوئی اور ہے ہی نہیں۔ ہم نے جس شہر میں قیام ہی نہیں کرنا تو اس شہر کے لوگوں سے رابطے بڑھانے کا کیا فائدہ، جس غزل کا مضمون محبت ہو وہ بھلا دلوں پر اثر کیوں نہیں چھوڑے گی اور جب منور ہاشمی کی غزل پڑھنے کو ملے تو محبت کے سارے خیالات جاگ اُٹھتے ہیں۔ احساسات کا منجمد دریا، تیز و تند لہروں کا مسکن بن جاتا ہے۔ منور ہاشمی کی غزل ایک پُر اثر اظہاریہ کا درجہ رکھتی ہے۔ منور ہاشمی جدائی کے لمحات کی کیفیات کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

اسے جس وقت سے دیکھا نہیں ہے
مزاج زندگی اچھا نہیں ہے

بھلانا بھی اسے چاہوں تو کیسے
کہ ان جیسا کوئی ملتا نہیں ہے

وفا کے خارزار میں جو میرا ہم قدم رہا
وہ شخص کھو گیا کہیں مسافتوں کے درمیاں

منور ہاشمی کا شمار ملک کے سینئر کہنہ مشق اور صاحب اسلوب غزل گو شاعروں میں ہوتا ہے۔ان کا شعری لہجہ جدیدیت کا مظہر ہے۔انھوں نے گلستان غزل میں نئے رنگ کے پھول کھلائے ہیں جن کی خوشبو سے جہان غزل مہک رہا ہے۔

جدید اردو غزل کا کلاسیکی شاعر: منور ہاشمی

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

بیجنگ فارن سٹڈیز یونیورسٹی، چائنا

منور ہاشمی اپنے عہد کے ایک منفرد اور مکمل شاعر ہیں۔ انفرادیت، ان کے کلام سے واضح ہے لیکن انہیں مکمل شاعر اس لیے لکھا ہے کہ ان کی شاعری میں موضوعات کسی ایک خانے میں مقید ہو کر نہیں رہ گئے۔ اردو شاعری میں شاذ ہی کسی شاعر کو اپنے مکمل اظہار کا موقع ملا ہو کیونکہ وہ کسی ایک خاص رجحان یا شخصی رویے کی وجہ سے اپنے فنی موضوعات کو محدود کر دیتا ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ نقد ادب کے شائقین میرؔ اور غالبؔ جیسے فلسفیوں کی فکری پرتوں سے بھی اغماض برتتے ہوئے قاری پر ہونے والی وارادات قلبی و ذہنی کو محدود کر دیتے ہیں۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں جب شاعری بالخصوص غزل نے عصری رجحانات کے اثرات قبول کیے تو جدت کی اس لہر نے غزل کے نظام فکر و فن کو بھی متاثر کیا۔ حسرت موہانی تک آتے آتے غزل کی شعریات میں جدت کے عناصر واضح ہو چکے تھے۔ بعد ازاں غزل نے نظریے کا دامن تھاما تو اس میں فنی خوبصورتی اور کلاسیکی روایت سے انحراف کا رجحان نمایاں ہو گیا۔۔ بعض شعرائے غزل نے سیاسی اور سماجی موضوعات کو پیش تو کیا لیکن ان کے ہاتھ سے شعریت اور نغمگی کا دامن چھوٹ گیا۔ بہت کم شعراء کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ خارج سے باطن اور باطن سے خارج کے سفر میں توازن رکھ پائے ہیں۔ منور ہاشمی کے کلیات کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کو ایک مکمل شعری مزاج نظر آتا ہے۔ جس میں دل اور دنیا کا توازن بلاشبہ غیر معمولی بات ہے۔ اس ضمن میں فارغ بخاری کی رائے کا سہارا لیتے ہوئے اپنی بات کو آگے بڑھاؤں گی، وہ منور ہاشمی کے رنگِ تغزل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''منور ہاشمی کا نام ان کی صفوں میں ایک اہم نام ہے۔ ان کی غزل کا نمایاں وصف ان کی عوامی سوچ ہے۔ زندگی کی داخلی اور خارجی مسافتوں میں اس نے روزمرہ کے ایسے چھوٹے موٹے تجربات و مشاہدات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔۔۔۔ اس طرح بعض نہایت تلخ طبقاتی المیوں کو بھی وہ اپنے موثر پیرایہ اظہار سے خوشگوار رنگ دینے میں کامیاب رہا ہے۔''

منور ہاشمی کے موضوعات کہیں بالکل سادہ تو کہیں خالص فلسفیانہ اظہار ہیں۔ نظم کے دامن میں یہ گنجائش قدرے موجود رہتی ہے کہ بات کو کسی خاص موضوع تک محدود رکھتے ہوئے کئی مصرعوں میں مکمل کیا جا سکتا ہے لیکن غزل اپنے فن میں ایک معنی کا جہان رکھتی ہے تو دوسری طرف اس کا فنی وقار تقاضا کرتا ہے کہ موضوع کو دو مصرعوں میں محدود رکھتے ہوئے بات کو مکمل پیرائے میں بیان کیا جائے۔ اس ضمن میں منور ہاشمی کے اشعار کو بطور نمونہ پیش کرنا چاہوں گی جس میں "انقلاب" کو غزل میں موضوع بناتے ہوئے فنی اور فکری سطح پر کس طرح توازن اور شعریت قائم رہتی ہے:

یوں منور آئے گا اب انقلاب زندگی
آنکھ میرے عہد کی حیران ہی رہ جائے گی

وقت کی سرکش ہواؤ،جب دیا بجھ جائے گا
صبح کی صورت میں اس کی روشنی رہ جائے گی

منور ہاشمی نے سماجی ناہمواریوں کو براہ راست موضوع بنایا ہے۔انھوں نے اپنے عہد کے انسان کے فکری اور روحانی کرب کو موضوع بنایا ہے۔یوں تو ہر دور کے شعراء نے اپنے تئیں غزل میں اظہار کی نئی جہتیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حسرت موہانی کے بعد غزل نے جدیدیت کی راہیں اپنے لیے متعین کر لیں۔اگر چہ اس دور کی شاعری میں پوری طرح جدیدیت کی جڑیں تلاش کرنا مشکل ہے لیکن اس دور کی غزل کے فنی اور فکری رویوں میں جدیدیت کی یہ چھاپ بآسانی دیکھی جاسکتی ہے۔منور ہاشمی کا رنگ تغزل اگر چہ کلاسیکی انداز لیے ہوئے ہے لیکن ان کے موضوعات انھیں جدیدیت کی روش سے بھی جوڑتے ہیں۔روایت سے انحراف یا روایت کی پابندی کسی شاعر کے لیے کافی نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے کلاسیکی غزل سے استفادہ کرنے کا فن اور اپنی فکری اپج کی بلندی کو قائم رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔منور ہاشمی کی شاعری میں کلاسیکی غزل کا رنگ شامل ہے لیکن انھی تشبیہات میں جدت پیدا کرتے ہوئے وہ اپنی انفرادیت کو بھی قائم رکھتے ہیں۔یہ انداز ہمیں ترقی پسند شعرا کے ہاں بھی ملتا ہے لیکن غزل کی لفظیات اور ایمائیت کو قائم رکھنے میں چند شعرا ہی کامیاب نظر آتے ہیں۔البتہ فیض احمد فیض کے کلام میں یہ تجربات پوری کامیابی اور فنی نفاست سے پیش کیے گئے ہیں۔منور ہاشمی کی شاعری میں بھی کلاسیکیت کے رنگ سے جدت کے نقش ابھرتے نظر آتے ہیں۔جہاں وہ جوش کی طرح انقلابیت کا نعرہ تو نہیں لگاتے لیکن ان کی معاصر حسیت کو ذیل میں درج اشعار سے بخوبی اخذ کیا جاسکتا ہے۔اس طرح کے جدید موضوعات کو پیش کرتے ہوئے منور ہاشمی کا رنگ تغزل بھی پھیکا نہیں پڑتا اور شاعر کی انفرادیت بھی قائم رہتی ہے۔شاعر اپنے عہد کے انسان کو آگے بڑھنے کی ترغیب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

خوف جاگ اٹھتا ہے دل میں ہر خوشی کی بات سے
کس قدر مانوس ہیں بے رحمیء حالات سے

حرمتِ حرف کہاں،عصمتِ خامہ ہے کہاں
قحطِ افکار کے پیدا ہیں نشاں روز بروز

ایک فنکار اپنے فن میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔اس شاعر نے بھی اپنی فکر کی آبیاری ایسی بنجر زمین پر کی ہے جہاں صحرا ہے۔اس شعر کے معنی پر غور کرنے سے اپنے اردگرد پھیلی سماجی حقیقتوں کا پردہ چاک ہوتا دکھائی دیتا ہے،جہاں محبت کے

پھول اگانا روز بروز ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا جا رہا ہے۔شاعر اپنے بعد اپنی شاعری میں محبت کا پیغام چھوڑنا چاہتا ہے تاکہ نفرتوں کی کثافتوں کو کم کیا جا سکے۔

پھول صحرا میں کھلائے ہیں منوّر میں نے
تاکہ مہکی رہے کچھ دیر فضا میرے بعد

منور ہاشمی کی غزل میں تصورِ عشق کلاسیکی غزل کی طرح رومان پرور اور گہرے مفاہیم کا حامل ہے۔شاعر نے سادہ الفاظ اور چھوٹی بحروں میں محبت کے فسانوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اشعار میں فنی اور فکری نفاست پوری طرح قائم رہی۔عموماً اس طرح کی شاعری کو ناقدین شعر نے دو مختلف فکری اور صنفی دھاروں میں منقسم کر رکھا ہے۔روایتی معیارِ نقد نے رنگ،خوشبو،جذبوں،اور رومانوی اندازِ شعر کو نسائی شاعری تک محدود کر کے مرد اور خواتین دونوں کے شعری رویوں کو محدود زاویہ نظر سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔جس سے بلاشبہ شاعری کی تفہیم اور ادراک کی منزلوں کی کھوج لگانے والے قاری کے مزاجِ شعر کو نقصان پہنچا ہے۔

یہ اس کا شہر ہے،اس کی مہک بتاتی ہے
ذرا تلاش کرو اس کا گھر بھی آئے گا
چھپائے پھرنے سے کب عشق و مشک چھپتے ہیں
چڑھے گا چاند تو سب کو نظر بھی آئے گا

منور ہاشمی کی شاعری جہاں زمانے کی بے ثباتی ،سماجی ناہمواریوں اور معاشرے میں پھیلی منافرتوں اور منافقتوں کو موضوع بناتی ہے وہیں رومانوی فضا اور محبت کے نئے رنگوں سے متعارف کرواتی ہے۔

ان کے اشعار میں محبت ایک خوبصورت جذبے کی طرح کائنات کی سب سے بڑی حقیقت اور دنیا کا سب سے برا سچ بن کر ابھرتی ہے۔لیکن محبت کے یہ انداز کسی پری چہرہ کے ناز اور فریب کاریوں کا نوحہ بن کر جنون کی حدوں کو نہیں چھوتے۔بلکہ ان کے اشعار میں محبت ایک فہم کی صورت الہام بن کر شاعر کے فن میں نمایاں ہوتی نظر آتی ہے۔

وہ سراپا حسن ہے اور میں سراپا عشق ہوں
ساز سے دل اس کا،میرا سوز سے معمور ہے

ایک شعر میں منور ہاشمی محبت اور جذبوں کے فقدان کا نوحہ اس طرح لکھتے ہیں:

محبتوں میں بھی لازم ہے اعتدال کا رنگ
خلوص حد سے بڑھا جب تو لوگ ڈر بھی گئے

ان کی غزل کا ایک مصرع ہے کہ "دلوں میں درد کا طوفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں" گویا وہ درد کو ہی حاصلِ زندگی

سمجھتے ہیں کیونکہ اسی کی بنیاد پر ہر فنکار اپنے فن کی عمارت اٹھاتا ہے۔ شاعر اپنے فن میں درد کے رنگ بھرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

اقرار نہ ہوتا مرے ہونے کا جہاں میں
میں کوچۂ جاناں میں جو بدنام نہ ہوتا
راس آیا ہے اب ترکِ تعلق بھی منورؔ
یہ کام نہ ہوتا کوئی کام نہ ہوتا

منور ہاشمی کی غزل میں عشق کا یہ تصور جدید انسان کا تصور ہے جسے عشق کی چاہ تو ہے لیکن وہ زنجیر دیکھ کر فصلِ گل کا اندازہ نہیں لگاتا۔ وہ اپنے اردگرد پھیلی حقیقتوں کا ادراک رکھتا ہے۔ حالات کی تبدیلی کا خواہاں ہے۔ محبوب سے وصل کے لمحوں کو حاصلِ زندگی سمجھتا ہے لیکن محبت میں ہار کر تارک الدنیا ہو کر صحراؤں کا رخ نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے ہنر کے گلابوں کو ہجر کے درد سے سینچ کر پروان چڑھاتا ہے۔

منور ہاشمی کی غزل میں "معرفت" کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ یوں تو کلاسیکی غزل کا محبوب عام طور پر مایوسی کے لمحوں میں یا تو عقل کی منزلوں سے دور ہو جاتا ہے یا پھر وجدان کی اس منزل پر جا پہنچتا ہے جہاں عام آدمی کا گزرنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ لیکن منور ہاشمی کی شاعری میں "عرفان" کی منزلیں عشقِ مجازی کے سہارے طے نہیں کی گئیں بلکہ وہ فلسفیانہ فکر کا نتیجہ ہیں۔ وہ فلسفے کی ایک جہت انسان اور خدا کے تعلق کو بھی سمجھتے ہیں۔ جہاں انسان اپنے ہونے کا سوال اٹھاتا ہے تو کبھی وحدت الوجود کے تصور سے مغلوب ہو کر اپنے اصل سے جدا ہونے کا پرسوز نغمہ بن کر ابھرتا ہے۔

انسان اور خدا کے اس تعلق کے بیچ جنم لیتی زندگی، سراب اور خواب کے درمیان بھٹکتی منزلوں کی کھوج کو بھی منور ہاشمی اپنی غزل کا موضوع بناتے ہیں۔ ذیل میں درج اشعار میں جہاں کلاسیکی رنگ نظر آتا ہے وہاں منور ہاشمی کا ہر شعر ان کی قلبی واردات بن کر فکری مماثلت رکھنے کے باوجود فنی سطح پر اپنے لیے الگ راہ متعین کر لیتا ہے۔

آج میں تجھ سے دور ہوں کیا ہوں
کل میں تیرے حضور تھا کیا تھا

دن رات، صبح و شام تجھے ڈھونڈتے رہے
اپنا تھا یہی کام تجھے ڈھونڈتے رہے

دل تو اس کا گھر ہے اس میں وہ رہے یا اس کی یاد
خواہشیں جتنی بھی ہیں ان سب کو باہر پھینکنا

یہ اور بات کہ گرتے سنبھلتے رہتے ہیں
تری تلاش میں ہم لوگ چلتے رہتے ہیں

انہی سے کشتِ محبت ہے اصل میں سیراب
تہ جبیں جو یہ چشمے ابلتے رہتے ہیں

تمہارا نام اسی واسطے تو زندہ ہے
تمہارے نام پہ مرنا تھا جن کو مر بھی گئے

غم زیاں کے سوا کچھ نہیں ہے منزل پر
سفر کا لطف گیا اور ہم سفر بھی گئے

انسان کی ذات جہاں اپنی ہی اناؤں کی انتہاؤں کو چھولے تو خدائی کی دعویدار بن جاتی ہے۔لیکن ادراک کی منزلیں طے کرلے تو عجز کی اس سطح کو جا چھوتی ہے جس کا ذکر منور ہاشمی کے اس شعر میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

زخم خوردہ سہی ، افسردہ سہی اپنی جبیں
جیسی بھی ہے تیری دہلیز پہ لا رکھی ہے

عرفان کی ایک منزل رب کو پالینا ہے تو دوسرا درجہ خودی کے گہرے سمندر میں ڈوب کر سراغ زندگی کی کھوج ہے۔منور ہاشمی نے بھی اپنے نام کے حروف کا مشاہدہ کرتے ہوئے انسان کے ہونے نہ ہونے کی بات انتہائی فنی چابکدستی سے پیش کی ہے۔انسان جس کا ایک قدم خلاؤں میں ہے تو دوسرا بے ثباتی کی گھاٹیوں میں۔

میرے نام کا ''نون'' منوّر اصل میں ایک معما
لاکھوں شرحوں میں ابھروں اک نکتے میں دب جاؤں

موضوعات کا تنوع منور ہاشمی کی شاعری کا ایک بڑا خاصہ ہے۔وہ شاعری میں کردار بھی متعارف کرواتے ہیں اوران کے رویے بھی۔یہاں تک کہ غزل کے روایتی کرداروں کے ساتھ ساتھ زمانہ بذات خود ایک کردار بن کر ان کی غزل میں ایک انفرادیت پیدا کر دیتا ہے۔

خواہش ہے منور کہ بدل جائے زمانہ
لیکن یہ الگ بات یقیں ہے نہ گماں ہے

منور ہاشمی کی ذات کی جھلک ان کے فن میں بھی واضح ہے۔وہ جس طرح گوشہ نشینوں کا سا مزاج رکھتے ہیں ان

کے اشعار میں بھی اس کا اظہار کہیں نہ کہیں پایا جاتا ہے۔

یہ کار جہاں ہم کو کبھی راس نہ آیا
جو اپنا منافع تھا وہی اپنا زیاں ہے

دشمنوں میں بھی بصد ناز چلا جاتا ہوں
واں بھی رکھتا ہے خدا رتبہ نمایاں میرا

اسی طرح شاعر نے خدا سے دل بینا طلب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

جس کو بھی احساس ہونے یا نہ ہونے کا نہیں
اے خدا! اس آنکھ کے آگے نہ منظر پھینکنا

وہ اپنے نام کی مناسبت سے مقطعے میں روشنی کا مفہوم لاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

روشنی لے کر منوّر میں گیا کس کس کے گھر
غیر ہو یا کوئی اپنا یہ کبھی دیکھا نہیں

سجاد ظہیر نے اردو غزل کے مزاج کے بارے میں لکھا تھا کہ غزل کے لیے بنیادی شرط ہے کہ ایک طرف تو معنویت، اشاروں کنایوں، تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعے جمالیاتی حظ پہنچاتے تو دوسری طرف بلند ترین انسانی احساسات کو بلندی عطا کرے۔ غزل میں نئے مضامین کو قبول کرنے انھیں فنی تخلیق میں بدل دینے کی غیر معمولی صلاحیت ہے، غزل بے حد زمانہ ساز ہے۔

متذکرہ بالا رائے کی روشنی میں منور ہاشمی کی شاعری کو پرکھا جائے تو بلا مبالغہ وہ ان تمام پیمانوں پر نا صرف پوری اترتی ہے بلکہ نئے دور کے شاعر کے لیے راستہ بھی متعین کرتی ہے کہ وہ روایت سے جڑ کر جدت کے افق کیسے چھو سکتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے میرؔ سے منورؔ تک کی روایت کو سنبھال رکھا ہے، منور ہاشمی کا شعر ہی ان کے فن کی نذر

عشق کا اعتبار ہیں ہم لوگ
زندگی کا وقار ہیں ہم لوگ
زندگانی گنوا نہ دے ہم کو
حاصلِ روزگار ہیں ہم لوگ

منور ہاشمی کی شعری کائنات: ایک مطالعہ

ڈاکٹر نذر عابد

شاعر کے لیے مطالعہ لازم ہے۔ یہ مطالعہ کتاب کا ہو، کتابِ فطرت کا ہو یا پھر کسی کتابی چہرے کا، مطالعہ بہر صورت ضرورت ہے۔ مطالعہ کی یہ تینوں صورتیں شاعر کے شعری پیکروں میں وہ رنگ بھرتی ہیں کہ خود شاعر ہو، قاری ہو یا سامع بقدرِ ظرف ان رنگوں کی پھوار میں بھیگتا چلا جاتا ہے۔ بعض اوقات کتاب سے زیادہ کسی کتابی چہرے کے مطالعے سے استفادے کی بہتر صورتیں برآمد ہوتی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ بقول ناصر کاظمی:

بس ایک چہرہ کتابی نظر میں ہے ناصرؔ
کسی کتاب سے میں استفادہ کیا کرتا

بلکہ یوں کہا جائے تو شاید غلط نہیں ہوگا کہ شاعر کو اکثر اسی سطح کے مطالعے سے واسطہ پڑتا ہے کہ وہ جس سماج میں زیست کر رہا ہوتا ہے، اس میں بسنے والے لوگوں کے دکھ درد کو اس نے اپنی ذات میں سموتے ہوئے اپنی شعری واردات کی تکمیل کرنی ہوتی ہے۔ محسن نقوی کا مشورہ دل کو چھوتا ہے:

اجڑے ہوئے لوگوں سے گریزاں نہ رہا کر
حالات کی قبروں کے یہ کتبے بھی پڑھا کر

منور ہاشمی بھی شاعروں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو لکھنے سے قبل بے تحاشا پڑھنے کے قائل ہیں۔ وہ عرفِ عام میں بھی پڑھے لکھے اور صاحبِ مطالعہ انسان ہیں۔ کتابِ فطرت سے ان کے قلبی لگاؤ کی کیفیت یہ ہے کہ انھوں نے اقبال جیسے فطرت دوست شاعر کی منظر نگاری کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی نوعیت کا خاصا وقیع کام کر رکھا ہے۔ تاہم ایک خالص اور حقیقی شاعر ہونے کے ناتے ان کے ہاں چہرے پڑھنے کی امنگ بھی موجود ہے۔

اگر پڑھنے کو جی چاہے نکل جاتا ہوں گلیوں میں
جہاں چہرے ہوں تم جیسے کتابیں کون پڑھتا ہے

شاعر کے اس فکری مرحلے پر ایک لمحے کو توقف کرتے ہوئے غور کیا جائے تو جو حقیقت منکشف ہوتی ہے، وہی دراصل شاعر کے شعری منشور کا اعلامیہ ہے۔ یہاں شاعر نے چہرے اور کتاب کے ساتھ ساتھ ایک اور کلیدی لفظ ''گلیوں'' کا استعمال کیا ہے۔ اپنی بستی کی اپنی گلیوں میں بسنے والے اپنے لوگ ہی درحقیقت شاعر کی توجہ کا اصل مرکز و محور ہیں۔ منور ہاشمی کے تمام تر شعری تجربات انھی گلیوں سے کشید کیے ہوئے ہیں۔ ان کے ایسے تجربات نے لمحہ موجود کی تلخی کو بھی اندر سمو لیا ہے اور آنے والے سمے کے خوشگوار احساس کو بھی شاعر نے اپنی ذات کا حصہ بنایا ہے۔ موجود صورتِ حال کی سفاکیت بعض

اوقات شاعر کے لہجے میں یاسیت کے اداس رنگ نمایاں کر دیتی ہے۔

ایسی حالت میرے شہر پہ طاری ہے
عید کے دن بھی بچے روتے پھرتے ہیں

جلتے ہوئے گھروں کو بھلا کیسے دیکھتے
ہم لوگ اپنے شہر سے باہر نکل گئے

موجود لمحے کی اس سفاکیت کو گوارا بنانے کے لیے شاعر اپنے خوابوں کا سہارا لیتا ہے۔ منور ہاشمی کے ہاں انفرادی واجتماعی ہر دو سطح پر تمام تر نا آسودہ خواہشیں خواب کا ملبوس اوڑھ کر خوش رنگ شعری پیکروں کا روپ دھار لیتی ہیں۔

سب حسرتوں کو خواب کا ملبوس مل گیا
سب خواب میرے شعر کے پیکر میں ڈھل گئے

رات کو دن کے الم اوڑھ کے سو جاتا ہوں
دن کو میں رات کے خوابوں کی گرہ کھولتا ہوں

تاہم دکھ کی بات یہ ہے کہ کبھی یہ خواب شاعر کے لیے عذاب بھی بن جاتے ہیں۔ شاعر خواب دیکھتا بھی ہے، دکھاتا بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ روشن تعبیروں کا طلب گار بھی ہوتا ہے۔ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوں تو شاعر ایک داخلی کرب کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ ایک سچے شاعر کی طرح منور ہاشمی کے ہاں تعبیرِ خواب کی شدید خواہش بھی نمایاں ہے اور ایک حساس شاعر ہونے کے ناتے ان کے ہاں کرچی کرچی ہوتے زخمی خوابوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے داخلی کرب کا اظہار بھی ہوا ہے۔

ہے میرا ذہن تو تخلیقِ خواب میں مصروف
تمہارے ذہن میں تعبیرِ خواب ہے کہ نہیں

اک چھناکا سا منوؔر کانچ کے گھر میں ہوا
کرچیاں میں خواب کی پلکوں سے چنتا رہ گیا

روز گرے اک خواب عمارت ملبے میں دب جاؤں
صدیوں کی دیواریں پھاندوں لمحے میں دب جاؤں

خوابوں کے چکنا چور ہونے کا مرحلہ درپیش ہو تو خواب دیکھنے اور دکھانے والے کی روح بھی شکستگی کے مراحل

سے دوچار ہونے لگتی ہے۔ایسے میں زندگی کے ارتقا پر یقین رکھنے والا فن کار اپنے راکھ ہوتے خوابوں کے ملبے سے آس اور امید کی چنگاریاں دریافت کر لیتا ہے۔منور ہاشمی ایسے کربناک لمحوں میں بھی آس اور امید کا کوئی ایسا دریچہ ضرور وا رکھتے ہیں جو زندگی کے گھٹن زدہ ماحول میں حیات بخش جھونکوں کی آمد کا سبب بنا رہے۔

کھلے رہیں گے دریچے اس آس پر گھر کے
کبھی تو جھونکا ہوا کا ادھر بھی آئے گا

اس کے آنے کی ہے موہوم سی امید ابھی
آسماں پر ہے ابھی ایک ستارہ باقی

منور ہاشمی کے شعری رویوں میں ابھرنے والا رجائیت کا یہ پہلو ان کے باطن میں پنپتا وہ زرخیز موسم ہے جو خارج کے ناہموار اور ناسازگار موسموں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ان کے قلب و روح کو سرشار کر دینے والا یہ موسم نہ صرف ان کی ذات کے لیے تقویت کا باعث بنتا ہے بلکہ وہ اپنے آس پاس بستے اپنے لوگوں کو بھی ایسی ہی روحانی و قلبی کیفیت میں سرشار رکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

ہے کائنات وجد میں اس کے خیال سے
جو گیت میری روح نے گایا نہیں ابھی
دل اس کے رنگ و نور کے حلقے میں ہے اسیر
منظر جو میرے سامنے آیا نہیں ابھی

منظر جو ابھی موجود نہ ہونے کے باوجود شاعر کے سامنے موجود ہے،شاعر کے اس زرخیز تخیل کی عطا ہے جس کی بدولت اسے وہ روشن بصیرتیں میسر ہوئیں کہ اس کی ذات رنگ و نور سے سیراب ہے۔منور ہاشمی کے ہاں رنگ و نور کی اسی سیرابی نے ان کی شاعری کو ایسا وقار و اعتبار بخشا ہے کہ خیال کے نزول سے الفاظ کے انتخاب اور برتاوے تک کے تمام تخلیقی مراحل ان کے ہاں ایسے کڑے معیار پر پورا اترتے ہیں جو ان کی شعری کائنات کو عام ڈگر کی شاعری سے ہٹ کر انفرادیت اور امتیاز کے زاویوں سے آشنا کر دیتا ہے۔اطمینان کی بات یہ ہے کہ وہ خود بھی اس کڑے معیار کو شعوری طور پر برقرار رکھنے پر یقین رکھتے ہیں۔خود ان کے بقول:

گر میں ایسا لکھوں جیسا اکثر لکھا جائے
اتنا لکھوں خود ہی اپنے لکھے میں دب جاؤں

منور ہاشمی: عصرِ رواں کا ایک توانا شاعر

ڈاکٹر محمد امجد عابد

شاعری شعور و ادراک اور جذبات و احساسات کا آئینہ ہوتی ہے جس میں زندگی اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ شاعری زندگی کو احساس کی دولت سے مالا مال کرتی ہے۔ جینے کا اسلوب سکھاتی ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ شاعری جذبات کی دل آویز موسیقی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ شاعری کا اثر دل و دماغ دونوں پر ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی ''(شاعری) حواس کے تاروں کو چھیڑتی ہے اور روح پر خوشی بن کر چھا جاتی ہے۔ وہ جذب و شوق کی ایک لغزشِ مستانہ ہے۔ عقل و شعور کا ایک حسین ارتعاش ہے، حسن و جمال کی ایک دل موہ لینے والی اور لطیف تھرتھراہٹ ہے۔'' شاعری کا بنیادی عنصر جذبہ ہے۔ شاعر اپنی شاعری کے ذریعے جو کچھ بھی پیش کرتا ہے اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی جذبہ ہی کارفرما ہوتا ہے اور یہ جذبات شاعر کی داخلی اور خارجی زندگی کے پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ جب جذبات کے ساتھ ساتھ کسی شاعر کا فکر و شعور، مشاہدے کی دولت اور تخیل کی فراوانی بھی در آئے تو شاعری حسن کاری کی دولت سے مالا مال ہو جاتی ہے۔

اس تناظر میں جب ہم ڈاکٹر منور ہاشمی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں شوقِ فراواں، مشاہدے سے لبریز نگاہ، قوتِ تخیل، دردمند دل، حساس طبیعت اور بے مثال بصیرت افروزی سے نوازا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں روانی، سلاست، اسلوب میں ندرت اور غور و فکر میں ایک گہرائی موجود ہے۔ انھوں نے اپنی ذہانت اور موزونی طبیعت کے باعث دھڑکتے ہوئے احساس کو لفظی پیکر عطا کیے ہیں۔ غزل ان کی پہچان ہے۔ جو شعرا بطور غزل گو اپنی پہچان مکمل کروا دیتے ہیں پھر ان کا دل کسی دوسری شعری صنف کی طرف نہیں پلٹتا۔ یہ وفاداری بشرطِ استواری والی بات ہے۔ اس پر پورا اترنے والے سخن ور ہمیشہ یاد رکھے جاتے ہیں۔ ایسے ہی یاد رکھے جانے والے معدودے چند سخن وروں میں ایک توانا اور محترم نام جناب منور ہاشمی کا ہے۔

منور ہاشمی کے شعری سفر کا آغاز ستر کی دہائی سے لمحۂ موجود تک اپنے تخلیقی سلسلے رواں دواں رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا شمار ایسے غزل گو شعرا میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنی ساری تخلیقی عمر اسی صنف کے بنانے، سنوارنے میں لگا دی اور اب ان کی تخلیقی شاخ پر فکر و خیال کے ایسے برگ و بار لہرا رہے ہیں جن کی خوبصورتی ہر دیکھنے والے کو اپنا اسیر کر لیتی ہے۔ بقول ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی:

> ''منور ہاشمی کی غزلوں میں اسلوبِ سخن اور پیرایۂ اظہار کے ایک جہانِ نو، ایک نئی فضا اور تخیل و تفکر کی نئی وسعتوں کا سراغ ملتا ہے۔ ان کا سوچتا ہوا لہجہ ان کے پاس ہونے والی واقعات کی اندرونی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔ گیرا اور ملک گیر ان کے مشاہدہ کی گرفت میں حُسنِ بُتاں نہیں بلکہ سُلگتا ہوا تقاضا بھی ہے۔''

منور ہاشمی کی شاعری جذبات کی آئینہ داری اور احساسات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے بلکہ ان کی شاعری ایک ایسے مصور کا انداز اختیار کر لیتی ہے کہ جس کے لفظی مرقعے ہماری آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی تصویریں بن کر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا کلام انفرادی اور اجتماعی شعور کا حسین امتزاج ہے۔ ان کا نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے۔

ملتے ہیں منور سے اگر اہل سیاست
کہتے ہیں یہ شخص تو سادہ ہی بہت ہے

ایسے لوگوں کا مر جانا جینے سے بھی بہتر ہے
وہ جو لوگ منور سب سے ڈر کر زندہ رہتے ہیں

آپ کی شاعری میں جذبوں کی گہرائی ملتی ہے، محبت، خلوص اور سچائی ملتی ہے۔ آپ کا تصور حسن و عشق اور واردات قلبی کا اظہار بے حجابانہ اور بے باکانہ نہیں بلکہ نہایت مہذب اور شریفانہ ہے۔ آپ بھی دوسرے شعرا کی طرح محبوب کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں مگر آپ کا انداز انتہائی منفرد اور دل کو چھو لینے والا ہے۔ آپ کے ہاں محبوب کی یاد کی شدت دلوں کے تار اس انداز سے چھیڑتی ہے کہ ایک دل آویز کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

شاید میری کٹیا کا پتا تجھ کو بتائے
چھوڑ آیا ہوں نقشِ کفِ پا تیری گلی میں

شہر میں تیرے تھیں بے رحم ہوائیں کتنی
مجھ سے مت پوچھ دیا دل کا جلایا کیسے

اس نے جو کچھ بھی کہا، میں نے وہ سمجھا ہی نہیں
میں اسے دیکھ رہا تھا اسے سنتا کیسے

دل کے جذبے جواں رکھتی ہے
تیرے حسن و جمال کی خوشبو

منور ہاشمی کے ہاں بھی دیگر شاعروں کی طرح زندگی کے کرب اور وجود کے عذاب کا شدید احساس اور اپنے ماحول سے ناآسودگی کا احساس پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں رومانویت کے حوالے سے حسن و عشق کے تذکرے ملتے ہیں وہاں ہجر اور تنہائی بھی جزو لاینفک ہے اور ایک اہم موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر شاعر کا ہجر کی کیفیات بیان کرنے کا الگ انداز ہوتا ہے۔ منور ہاشمی کا انداز بھی دلنشیں ہے۔ آپ تنہائی کا ذکر کرتے ہوئے اکثر فطری عناصر کو شامل

ہیں۔ جہاں ہجر اور تنہائی کا سماں ہوتا ہے وہیں محبوب کی یاد ہر لحہ شاعر کے دل پر عجیب سی کیفیات پیدا کرتی ہیں۔ جن کو لفظوں کا روپ دینا ہی کمال فن ہے اور ان سے منور ہاشمی بخوبی واقف ہیں۔

کھلے رہیں گے دریچے اس آس پر گھر کے
کبھی تو جھونکا ہوا کا ادھر بھی آئے گا

صحرا کی طرح خشک میرے لب ہیں منوؔر
ہے اس کے نگر پیار کی برسات کہیں اور

منور ہاشمی کی شاعری میں سادگی کا اپنا بانکپن ہے۔ وہ اپنے محسوسات اور ذاتی تجربوں کو بڑی سادگی اور سلاست کے ساتھ شعری قالب میں ڈھالتے ہیں۔ ان کے ہاں روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ خیالات کی جدت بھی موجود ہے لیکن فیشن زدہ جدیدیت سے وہ کوسوں دور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری سادگی اور پرکاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

منور میرے فن میں تازگی ہے
میں خوشبو کی طرح زندہ رہوں گا

تمہارے بعد بھی دیکھوں کسی کو
مری آنکھوں میں اتنا دم نہیں ہے

کہنے والوں کو کچھ خبر ہی نہیں
سننے والوں پہ کیا گزرتی ہے

منور ہاشمی کی شاعری کی ایک بڑی خصوصیت ان کی زبان کا حسن ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو ثقیل ترکیبوں، فارسی و عربی کے غیر مانوس الفاظ سے بچانے کی کوشش کی ہے اور سادہ زبان میں محسوسات اور خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تصنع اور بناوٹ سے ان کا کلام پاک ہے اور وہ شعر کو شعر کی طرح کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔

علم بیان اور علم بدیع شعرا کو ایک ہی بات کو مختلف قرینوں سے ادا کرنے میں آسانی فراہم کرتے ہیں۔ ان سے مضمون میں خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان علوم پر دسترس حاصل کرنے کے بعد ایک تخلیق کار صحیح تخلیق کار بن سکتا ہے اور اپنا تخیل کئی قرینوں اور طریقوں سے قاری تک پہنچا سکتا ہے۔ منور ہاشمی بھی علم بیان اور علم بدیع کی نزاکتوں سے بخوبی بہرہ ور ہیں اور اپنی شاعری میں انھوں نے ان کا خوب التزام کیا ہے۔

انہی سے کشتِ محبت ہے اصل میں سیراب
تہ جبیں جو یہ چشمے ابلتے رہتے ہیں

تیرگی بڑھتی چلی جاتی ہے
کوئی تارا ، کوئی جگنو آئے

ہر ایک پھول کی خاطر کلی کلی کے لیے
گہر فشاں ہے مری چشم ہر کسی کے لیے

رمز و ایماء اور تہ داری قدیم و جدید غزل کی ایک خصوصیت ہے۔ یہ رمز و ایمائیت کبھی اشارے و کنائے سے پیدا ہوتی ہے تو کبھی استعارے اور علامت سے۔غزل گوشعراء نے ہر عہد میں علامتوں سے کام لیا ہے۔منور ہاشمی نے بھی اپنی غزل میں علامات سے کام لیا ہے جن سے ان کی غزل کے حسن میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔

ہم کو تو موسموں نے تحائف دیے یہی
اندر بلا کا حبس ہے باہر کڑی ہے دھوپ

جس پیڑ پہ تھا ناز منوّر ہمیں کبھی
سائے میں اس کے جال سا اب بن چکی ہے دھوپ

منور ہاشمی کی غزل میں علامتی الفاظ زیادہ تر مظاہر فطرت سے اخذ کیے گئے ہیں مثلاً چاند، سورج، تارے، دھوپ، ہوا، بادل اور درخت وغیرہ

اسی ہوا کا بہت انتظار تھا سب کو
کہ جس ہوا نے ہمارے دیے بجھائے ہیں

میں مچلتا رہا چاندنی رات میں، اک ملاقات میں
اور مجھے دیکھ کر مسکراتا رہا ، چاند چپ ہی رہا

منور ہاشمی نے سانحہ کربلا کے حوالے سے بھی علامتوں کا استعمال کیا۔ان کے ہاں نہ صرف کربلا کی مجموعی فضا ملتی ہے بلکہ وہ واقعے کی جزئیات کو علامتوں میں پیش کرنے کا ہنر بھی خوب جانتے ہیں۔

پتھر مارنے والے اک دن خود پتھر ہو جاتے ہیں
راہ وفا میں جو سہتے ہیں پتھر زندہ رہتے ہیں

حق کی خاطر پیش کریں جو اپنی جان کا نذرانہ
زندہ رہنے والوں سے بھی بڑھ کر زندہ رہتے ہیں
ظلم کے سیلِ خوں میں اک دن ظالم بھی بہ جاتا ہے
لشکر مر جاتا ہے اور بہتر زندہ رہتے ہیں

ہر شاعر ماحول کی پیداوار ہوتا ہے اور معاشرے کا ایک حساس فرد بھی۔ اس کی انگلیاں معاشرے کی نبض پر ہوتی ہیں۔ وہ اپنے گردوپیش کے حالات واقعات اور عصری شعور سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ اس کی شاعری اپنے عہد کے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ منور ہاشمی نے بھی عصرِ رواں کے مسائل و معاملات کو نہ صرف اپنی شاعری میں بڑی خوبصورتی سے سمویا ہے بلکہ ان کے حل کے لیے کوئی لائحہ عمل بھی دیا ہے۔ منور ہاشمی اپنے عصر سے بخوبی واقف ہیں ان کی شاعری میں زندگی، معاشرہ اور تہذیب کلام کرتی دکھائی دیتی ہے۔ جو کچھ وہ اپنے گردوپیش میں دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں انہیں شاعری کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔

اردو شعرا کے ہاں تصوف کو ایک اہمیت حاصل ہے جسے نہ صرف کلاسیکی شعرا بلکہ جدید شعرا نے بھی اپنی شاعری اور کلام کا حصہ بنایا۔ انھوں نے جہاں انسان کی پیکر تراشی میں فن و جمال کے جلوؤں کو بڑی نزاکتوں کے ساتھ سمیٹا ہے وہاں طہارت کردار اور نفاستِ افکار سے اس کے اندرون کو روشن اور تاباں بنانے کے لیے بھی سامان کیا گیا ہے۔ انسان اپنے جوہر کو اگر مہ کامل کی طرح سنبھالے رکھے اور آلائش زمانہ کے بُرے اثرات سے خود کو بچائے رکھے تو ممکن نہیں کہ جس نے اسے تخلیق کیا ہے اس کے جمال کا لحہ، عرفاں بن کر اس پر نہ اترے۔ منور ہاشمی کی شاعری میں صوفیانہ افکار اور معرفت وجدان کے مظاہر بڑی خوبصورتی سے جلوہ گر ہیں اور قاری ان کے درویش صفت اور سیمابی صوفی لہجے کی صوفیانہ سرمستی کے بادہ و جام سے اپنی روح کو سرشار کر سکتے ہیں۔

ہے کائنات وجد میں اس کے خیال سے
جو گیت میری روح نے گایا نہیں ابھی
دل اس کے رنگ و نور کے حلقے میں ہے اسیر
منظر جو میرے سامنے آیا نہیں ابھی

منور ہاشمی نے زندگی کی بے ثباتی اور اس کی ناپائیداری کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور زندگی کی حقیقت کو عیاں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

اک طرف تیرا فریب آگہی اے زندگی
اک طرف اہل جنوں کی سرکشی اے زندگی

مسکرا کے جس نے بھی اک لمحے کو دیکھا مجھے
میں سمجھ بیٹھا اسے بھی زندگی اے زندگی
حسرتیں، ناکامیاں، مایوسیاں ، محرومیاں
بے دلی، بے چارگی ، افسردگی اے زندگی

اس مختصر سے مضمون میں منور ہاشمی کی شاعری کی گونا گوں خصوصیات کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ مختصراً یہ کہ ان کی شاعری میں حمد و نعت کا رنگ، نادر تشبیہات، استعارے، خوبصورت بندشیں، رنگ تغزل، جزئیات نگاری، اخلاقی مضامین، سوز و گداز، رومانویت، ماحول کی عکاسی، عظمت انسان کا تصور، فلسفہ و حکمت کی آمیزش، شخصیت اور فن کی ہم آہنگی، ملی افکار کی نمود، کلاسیکیت اور جدیدیت کا حسین امتزاج، فکر اقبال کا پرتو، شاعرانہ خلوص، طنز و مزاح، منظر نگاری، تصوف و معرفت، صداقتوں کی ترجمانی، پیکر تراشی، سماجی شعور، انقلابی رنگ، رجائیت، حقیقت نگاری، انا و نرگسیت اور مذہبی رنگ نمایاں ہیں۔

الغرض جب ہم منور ہاشمی کی شاعری کا بالاستعجاب مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کی شعری جہات میں ایک تنوع ملتا ہے جو ایک طرف ہمیں ان کے قادر الکلام شاعر ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے تو دوسری طرف ان کی فنی جہتوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے جن کے مطالعے سے ان کے فن کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

آبروئے غزل

پروفیسر کلیم احسان بٹ

''غزل اے غزل'' کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ منور ہاشمی کی شاعری کا امتیازی وصف اس کی سادگی ہے۔ یہ سادگی زبان، اسلوب اور خیال ہر سطح پر موجود ہے۔ وہ کبھی پیچیدہ اور ثقیل زبان استعمال نہیں کرتے۔ وہ کبھی الجھا ہوا اور غیر ہموار اسلوب اختیار نہیں کرتے اور وہ کبھی بعید از قیاس اور دور از کار خیالات نہیں باندھتے۔ سادگی اور سہولت کے ساتھ شعر کہتے ہیں اور اس عمل میں سہل ممتنع کی حدوں میں بار بار داخل ہوتے رہتے ہیں:

تمھاری آرزو جیسی ہے ویسا ہو نہیں سکتا
مگر ہم نے کیا اتنا کہ جتنا ہو نہیں سکتا

دل میں ترا قیام تھا پھر جانے کیا ہوا
اے آرزوئے خام تجھے ڈھونڈتے رہے

منور ہاشمی نے بیان و بدیع کے جملہ ذرائع سے بہت کم کام لیا ہے اور جہاں کام لیا ہے، وہ اتنا فطری ہے کہ نظر تک نہیں آتا:

جیسے صحرا ہو کوئی بہتے ہائے دریا کے پاس
ہم سے تشنہ کام اس کے روبرو پھرتے رہے

وہاں ضرور کسی گل بدن کی خوشبو ہے
جہاں نسیم سحر آتی جاتی رہتی ہے

مری وفاؤں کے بادل کو سر پہ اوڑھے ہوئے
وہ مجھ کو سوچ کے صحرا میں روز ملتا ہے

ان کی شاعری میں عشق و عاشقی اور اس سے وابستہ موضوعات غالب ہیں۔ یہ موضوعات غزل میں صدیوں سے بندھتے چلے آرہے ہیں تاہم منور ہاشمی ان موضوعات میں انفرادیت کا رنگ قائم کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں اور ان کی شاعری کو کسی طرح بھی روایتی موضوعات کی شاعری نہیں کہا جاسکتا۔ یہ شاعری روایت کے قریب ہوتے ہوئے بھی روایت سے الگ اور منفرد ہے اور اپنی علاحدہ شناخت کروانے میں کامیاب ہے۔ یہ شاعری عشق و عاشقی کے مضامین سے بھرپور ہے مگر عشق و عاشقی کا تصور منور ہاشمی کا ذاتی اور تجربہ منفرد ہے:

اس کے آنے کی ہے موہوم سی امید ابھی
آسماں پر ہے ابھی ایک ستارہ باقی

اگر پڑھنے کو جی چاہے نکل جاتا ہوں گلیوں میں
جہاں چہرے ہوں تم ایسے، کتابیں کون پڑھتا ہے

جدا ہوا تو نئے وعدۂ وصال کے ساتھ
وہ ایک گرتے ہوئے شخص کو سنبھال گیا

یہ اس کا شہر ہے، اس کی مہک بتاتی ہے
ذرا تلاش کرو ،اس کا گھر بھی آئے گا

اس کے علاوہ ان کی غزل میں معاشرتی اور سماجی مسائل کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے لیکن ان کی شاعری کی مجموعی فضا میں یہ موضوعات نمایاں نہیں ہو پائے۔ منور ہاشمی کہیں بلند آہنگ نہیں ہوئے اور کہیں طنز اور طعن پر نہیں اُترے بلکہ سادگی اور متانت کے ساتھ عہدِ حاضر کی بعض تلخیوں کو دھیمے اور سریلے انداز میں پیش کر دیا ہے:

اب اس کے بند کواڑوں کے پاس بیٹھ رہیں
جو شخص گھر سے گیا ہے، وہ گھر بھی آئے گا

برائی کے عوض نیکی منوّر مل نہیں سکتی
جہاں کانٹا کوئی بوئے وہاں کانٹا ہی اُگتا ہے

منور ہاشمی کی شاعری کی سطح ہموار ہے۔ یہ شاعری تہ دار نہیں اور نہ ہی پست و بلند۔ کلیات کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ ان کی تمام کتابوں میں غزل کا لب و لہجہ یکساں یا قریب قریب یکساں ہے۔ میرے لیے یہ حیرت انگیز ہے کیوں کہ عام طور پر شاعری میں پست و بلند خیالات کی آمیزش موجود ہوتی ہے اور اسلوب کی سطح ہموار نہیں ہوتی۔ غالب کو دیکھیں کہ ''شمار سبحہ مرغوب دل مشکل پسند آیا'' سے ''دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے'' اور ''کوئی امید بر نہیں آتی'' تک کا سفر موجود ہے۔ اقبال کے ہاں بھی ''نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی'' ''لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی'' اور ''کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تابِ رازی'' کی طرح کی سطح ملتی ہیں اور ان کی تمام شاعری کی سطح یکساں بلند نہیں ہے۔ منور ہاشمی نے زبان اور اسلوب کی جو سطح منتخب کی ہے، اس میں سلاست، روانی اور نغمگی ہے۔ ایک دھیمے سے سوز کی کیفیت جو میر کے غم اور ناصر کی اداسی سے جدا ہے۔ بعض اوقات وہ تکرار سے یہ موسیقی پیدا کرتے ہیں اور اکثر نرم آوازوں کی کثرت سے:

میرا رستہ اور ہے اور تیرا رستہ اور ہے
زندگی اے زندگی، اے زندگی ،اے زندگی

کل جو پندار کی دستار لیے پھرتے تھے
تیرے کوچے میں وہی پھرتے ہیں دل دل کرتے

ان کے ہاں فلسفیانہ اور فکری موضوعات کی بھی کمی نہیں۔ تجزیہ اور شواہد کے بعد ایک نتیجہ اخذ کرنا اور اس کے لیے دلائل و براہین پیش کرنا بھی منور ہاشمی کی شاعری میں عام ہے۔ یہ جدید عہد کا ذہن ہے جو محض جذباتی نہیں بلکہ استدلال سے کام لیتا ہے:

یہ اور بات خود کو نہیں دیکھتے کبھی
لیکن یہ کائنات ہماری نظر میں ہے

محنت کوشش اور وفا کے خوگر زندہ رہتے ہیں
جن کو مرنا آجاتا ہے ،اکثر زندہ رہتے ہیں

اس نے جانے کس طرح دیکھا مجھے
میں جہاں بیٹھا تھا پتھر ہوگیا

ان کی شاعری میں اچھے اور کامیاب شعر کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ شاعری ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ،شناخت اور پہچان ہے اور یہی ان کا فخر ہے۔ وہ کسی حال میں بھی اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ ان کے پاس شعر کا ایک معیار ہے۔ اس معیار سے کم پر وہ کبھی سمجھوتا نہیں کرتے۔ اسی لیے منور ہاشمی کے ہاں شاعرانہ تعلّی بھی عام ہے:

اس کا دل گوش برآواز رہے یا نہ رہے
درد رہتا ہے ہمیشہ سے غزل خواں میرا

دانش کہاں کی اور کہاں کا شعور شعر
میں بے حسوں کو آدمی بھی مانتا نہیں
میں اپنے جیسا کوئی اور دیکھتا ہی نہیں
میں کوئی آئینہ دیکھوں، یہ حوصلہ ہی نہیں

بالخصوص مقطع میں اس سے وہ اکثر کام لیتے ہیں:

آدمی کم گو ہے اور گھر سے نکلتا بھی نہیں
شہر میں پھر بھی منوّر کس قدر مشہور ہے

منور ہاشمی نے مومن کی طرح مقطع میں اپنے تخلص کا بامعنی استعمال کثرت سے کیا ہے:

گر حرف غلط ہے تو منور کو مٹادو
لیکن یہ اُجالا جو اسی نام سے آیا

شہر کی گلیاں منور روشنی سے بھر گئیں
آج شب ماہتاب پھر بالائے بام آیا کوئی

منور ہاشمی نے بہت سی غزلیں معروف زمینوں میں کہی ہیں جن میں عصرِ حاضر کے شعرائے کرام سے لے کر میر و غالب تک شامل ہیں۔ غالب کی زمین میں کامیاب غزل کہنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے مگر منور ہاشمی نے بھرپور اعتماد کے ساتھ غالب کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں:

اپنے کوچے سے چلے جانے پہ مجبور نہ کر
کس سے پوچھے گا کوئی تیرا پتا میرے بعد

اے زمانے تو مانگتا کیا ہے
میرے دامن میں اب رہا کیا ہے

یہ زمیں میری ہے جس میں مَیں نے کہہ دی ہے غزل
فصل جو بوتا ہے وہ مختار ہے جاگیر کا

اقبال کی زمین میں اور اپنے عہد کے شعرا کی زمینوں میں بھی انھوں نے غزلیں کہی ہیں:

شکستہ شعر مرے ہیں زمینِ مرشد میں
خودی کا رنگ نمایاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

تو بچھڑ جائے گا اک دن یہ کبھی سوچا نہ تھا
لوگ کہتے تھے مگر مجھ کو یقیں آتا نہ تھا

لیکن جہاں کہیں بھی انھوں نے کسی دوسرے شاعر کی زمین استعمال کی ہے، وہاں ان کا لہجہ اپنا، اسلوب اور اپنی ڈکشن پکار پکار کر اعلان کر رہی ہے کہ میں منور ہاشمی ہوں۔ یہ غزل میری غزل ہے اور میں ہی اس عہد میں غزل کی آبرو ہوں۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کی اردو غزل کا فکری پہلو

ڈاکٹر تحسین بی بی

ڈاکٹر منور ہاشمی جدید اردو غزل کا ایک درخشاں ستارہ ہیں۔ منور ہاشمی نے اردو کی تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ حمد، نعت، غزل، نظم، رباعیات وقطعات اور اقبال شناسی وغیرہ مگر ان کی پسندیدہ ترین صنف غزل ہے۔ منور ہاشمی کی غزل کا اگر جائزہ لیا جائے تو انہوں نے روایت سے مکمل بغاوت بھی نہیں کی اور جدت طرازی کے سمندر میں بھی غوطہ زن ہوئے ہیں۔ آپ کی شاعری پر عصری وسماجی اور رومانوی خیالات وافکار حاوی نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی غزل کے موضوعات میں تنوع بھی موجود ہے۔ غم جاناں سے شاعری کا دل نہیں بہلاتے بلکہ غم دوراں، انسانی رویوں کی ناہمواریاں، دردِ دل اور دردِ انسانیت بھی آپ کے ہاں جگہ پاتے ہیں۔ منور ہاشمی نے اپنی غزل میں زندگی کے تلخ حقائق، اقدار کی شکست وریخت، زندگی کی بے معنویت اور سماجی وسیاسی جبر واستحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ آپ سادہ انداز میں اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ تغزل کی موجودگی نے آپ کے کلام کو رنگا رنگی اور چاشنی بخشی ہے۔ آپ نے نئی تراکیب اور نئے تجربات سے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ آپ نے غزل خود ساختہ نہیں کہی بلکہ یہ آپ کے دردمند دل کی خوب صورت آواز ہے جو ادبی حلقوں میں داد وتحسین کی مستحق ٹھہری۔ بقول ڈاکٹر سید قاسم جلال:

> ''غم ذات ہو، غم جاناں ہو یا غم دوراں، جو لوگ مصائب حیات کے وار سہہ کر جینے کا ڈھنگ سیکھ لیتے ہیں، وہی خوشیوں کے اصل حق دار ہوتے ہیں کامرانیوں کی منزلیں انہی لوگوں کے انتظار میں ہوتی ہیں منور ہاشمی رجائی اندازِ فکر کے حامل ہیں'' (۱)

منور ہاشمی غزل کے میدان کے شہسوار ہیں اور اس کے مزاج سے بخوبی آگاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دیگر اصناف شاعری کی نسبت غزل پر خصوصی توجہ دی ہے اور اُردو میں غزل گو شاعر کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر احسن جمال اپنے ایک مضمون بعنوان ''شاعر، محقق اور نقاد پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی'' میں لکھتے ہیں:

> '' منور ہاشمی کو آج کی اُردو غزل کا بے تاج بادشاہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ '' (۲)

غزل کا کینوس خاصا وسیع ہے اور اس میں ہر طرح کے موضوعات سما سکتے ہیں۔ اس حوالے سے منور ہاشمی کی غزل کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی غزلیات میں یکسانیت نہیں بلکہ موضوعات کا خاص تنوع اور جدت وندرت پن کا حسین امتزاج ہے۔

کہیں چھوڑ کر نہ جاؤ مجھے راستے بدل کر
مجھے دو فریب بے شک مرے ساتھ ساتھ چل کے
میں پلٹ پلٹ کے دیکھوں کہ صدا ہے کوئی پیچھے
کبھی ہر قدم پہ رک کے کبھی تیز تیز چل کے (۳)

منور ہاشمی ایک فطری اور جبلی شاعر ہیں۔لکھنا ان کے خون میں شامل ہے۔ان کی شاعری میں منفرد لب و لہجے کے ساتھ رومانیت اور ظالم سامراج کی ناانصافیوں کا گہرا شعور ملتا ہے۔منور ہاشمی محبت،خوابوں خواہشوں،اور سچائیوں کی آمیزش کے ساتھ اپنے فن کو ذہن کی ایسی روشنی سے مرتب کرتے ہیں کہ زندگی کے معمولی سے معمولی مظہر تک کو محسوس کرنے کا در یہ ملتا ہے۔ندرت خیالی وجدت طرازی کے سبب بلاشبہ ان کی غزل اردو ادب میں یکتا و یگانہ ٹھہرتی ہے۔بقول ڈاکٹر احسن جمال:

گزشتہ ربع صدی میں جن شاعروں نے اردو غزل کو حقیقی معنوں میں آبرو بخشی ان میں منور ہاشمی کا نام بہت نمایاں ہے۔وہ پاکستانی شعرا کی صفِ اول کے شاعر میں۔ (۴)

منور ہاشمی کی شاعری کے جتنے بھی موضوعات ہیں وہ تخلیقی نہیں بلکہ حقیقی اور جیتی جاگتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔وہ غزل اور نظم دونوں میں اپنے جذبات کا اظہار کرنے پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔منور ہاشمی کی شاعری کا ایک ایک لفظ عام انسانی جذبات واحساسات کی عکاسی کرتا ہے انہوں نے زندگی کے تلخ حقائق اور تجربات کو ہمارے سامنے خوبصورت پیرائے میں پیش کیا ہے۔

ہر ایک شخص منور تمہاری بستی میں
صلیب ذات پہ لٹکا دکھائی دیتا ہے(۵)

منور ہاشمی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل کا روایتی موضوع حسن و عشق ہے جو کہ غزل کو جمالیاتی حسن سے آراستہ کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ غزل گو شعرا نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے دیگر شعرا کی طرح منور ہاشمی نے بھی حسن وعشق کے حوالے سے اپنے تجربات اور مشاہدات کو شخصیت کے حسین رنگوں میں یوں ڈھال کر پیش کیا ہے کہ وہ اپنے عہد کے دیگر شعرا سے منفرد دکھائی دیتے ہیں۔منور ہاشمی کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ آپ کے ہاں حسن و عشق کے تصورات اگرچہ وہی ہیں جو اُردو اور فارسی شاعری میں عرصہ دراز سے چلے آرہے ہیں لیکن آپ کی خوبی یہ ہے کہ آپ نے اپنی فنکارانہ مہارت اور جدتِ افکار کے ذریعے ان میں نئی روح پھونک دی ہے۔منور ہاشمی کی غزل کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

ہم ترے شہر میں پھرتے ہیں مگر ایسے ہی
ہم پہ پڑ جائے کبھی تیری نظر، ایسے ہی
جانے منزل تھی کہاں اور کہاں جانا تھا
عمر بھر کرتے رہے ہم تو سفر ایسے ہی (۶)

منور ہاشمی ایک مکمل رومانی شاعر ہے ان کی شاعری میں رومانیت کے تمام عناصر پائے جاتے ہیں جس میں

بغاوت، ماضی پرستی، خیالی بہشت شامل ہے، منور ہاشمی کی رومانیت میں سطحی پن نہیں بلکہ ان کے نزدیک عشق اور محبت کا تذکرہ پاکیزگی کے روپ میں ملتا ہے۔ منور ہاشمی کی شاعری میں رومانوی خیالات وافکار بھی بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حسن پرستی آپ کی شخصیت کا ایک جزو ہے اچھی اور خوب صورت اشیاہر انسان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہیں۔ آج کل لوگوں نے حسن کے معیارات بنالیے ہیں۔ ہر کوئی اپنے محبوب کی مختلف صورتیں اور عادات خود تراشنے لگ گیا ہے۔ مگر منور ہاشمی دنیا وی اعتراضات اور باتوں کو چھوڑ کر حسن کی تعریف کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

ہے منورؔ تمہارے ہونٹوں میں
اک پری رُخ کے خال کی خوشبو(۷)

حسن کے حوالے سے ہی ایک اور جگہ پر وہ لکھتے ہیں:

حسن کی قدر ہے ہمیں معلوم
شاعروں میں شمار ہیں ہم لوگ (۸)

آپ نے محبوب کے حسن وسیرت کی جو عکاسی پیش کی ہے وہ ایک حقیقی زندگی کی مثال ہے اس میں جذبوں کی کار فرمائی تو ضرور ملتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس جذبہ میں جذباتی پن کی بجائے ایک اعتدال اور حقیقت کا عکس ضرور نظر آتا ہے۔ اُردو ادب کی تاریخ میں مختلف شعرانے محبوب کا سراپا بیان کیا ہے ان میں ولی اور میر کی شاعری کسی سے پوشیدہ نہیں ہے ۔منور ہاشمی کے ہاں شاعری میں بھی محبوب کے خدوخال وسراپا نگاری کی جھلک ملتی ہے اس حوالے سے مثال ملاحظہ کریں:

وہاں ضرور اسی گل بدن کی خوشبو ہے
جہاں نسیمِ سحر آتی جاتی رہتی ہے(۹)
میں تیرے حسن کی تعریف پر ہوا مامور
تجھے بنایا گیا میری شاعری کے لئے (۱۰)

منور ہاشمی نے روایت کی پاسداری کا واضح ثبوت اپنی غزل میں دیا ہے۔ اُن کے ہاں روایتی مضامین اپنی اصل شکل میں گردش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ منور ہاشمی کی غزل ان فکری تجربات اور مشاہدات کا بیان ہے جن سے انہیں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے دوران گزرنا پڑا۔ منور ہاشمی کی شاعری میں انفرادی اور اجتماعی کرب کے دکھ بھی ملتے ہیں۔ وہ مقدار سے زیادہ معیار کے قائل ہیں۔

میں سر کہاں چھپاؤں گا اس تیز دھوپ میں
وہ موم کا مکان تو کب کا پگھل گیا ہے (۱۱)

منور ہاشمی کی شاعری پر صرف اور صرف رومانوی خیالات وافکار کی مہر نہیں ثبت کی جاسکتی ہے۔ آپ ایک حساس

اور درد مند شاعر ہیں۔ محبوب کی خوب صورتی اور دلکشی آپ کو متاثر تو ضرور کرتی ہے مگر صرف یہی آپ کی شاعری کی معراج نہیں ہے۔ زندگی میں دکھوں، دردوں اور تکالیف کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے خیالات و افکار کے اندر جدت اور تنوع پیدا کرنا چند ہی شعرا کا حسن ہے۔ منور ہاشمی نے عصر حاضر کے حالات و مسائل اور ناانصافیوں کا پرچار کیا ہے وہ ان حالات کا اصل ذمہ دار عوام کو ہی گردانتے ہیں کہ وہ کس طرح سے ایک دوسرے کے لیے مشکلات کا سبب بنتے ہیں۔ اور لوگ ان ناانصافیوں کا ازالہ کرنے کے بجائے تماشائی کا روپ دھار لیتے ہیں وہ ان حالات کی عکاسی کچھ یوں کرتے ہیں:

جنگل میں کرتے ہیں چھوٹے چھوٹے پودے شور

جب سے سارے قد آور اشجار ہوئے خاموش (۱۲)

منور ہاشمی نے اپنی غزلوں میں انسان کی عظمت اور تحفظ انسان کے لیے آواز بلند کرتے ہوئے معاشرے میں پھیلی نفرت کی دیوار توڑنے، مذہبی تعصبات، معاشرے میں پلنے والی نفرت، ناہمواری، عدم توازن اور عدم مساوات کا خاتمہ کر کے معاشرے میں مثبت اور ہم آہنگی کی صورت پیدا کی ہے۔ اور اپنی شاعری کے ذریعے انقلاب لانے کی کامیاب کوشش کی:

یوں منور آئے گا اب انقلاب زندگی

آنکھ میرے عہد کی حیران ہی رہ جائے گی (۱۳)

منور ہاشمی کی شاعری واقعی قدیم و جدید شاعری کا حسین امتزاج ہے۔ انہوں نے روایت سے بغاوت نہیں کی بلکہ اُسے سامنے رکھتے ہوئے اُس میں جدید فکر و آہنگ کا اضافہ کیا اسی لیے ان کی غزل قدیم و جدید کی خوبصورت رعنائی اور ندرت کی علمبردار ہے۔ منور ہاشمی نے غزل میں نہ صرف روایت کو برقرار رکھا ہے بلکہ ہیئت کے نئے تجربات بھی کیے ہیں۔ ان کی شاعری میں مرزا اسد اللہ غالبؔ کا انداز اور ان کی شعری زمین نمایاں نظر آتی ہے انہوں نے غالبؔ کی شعری زمین پر بہت خوبصورت غزلیں پیش کی ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ایک شعر میں یوں کرتے ہیں:

میرا اندازِ سخن اور زمینِ غالبؔ

ایک بس عجز ہنر اس میں ہے پنہاں میرا (۱۴)

آپ بنیادی طور پر غزل ہی کے میدان کے شہوار ہیں۔ غزل کے مزاج اور لوازمات سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ کے ہاں غزل کی وہی علامتیں ہیں جو صدیوں سے اردو اور فارسی شاعری میں چلے آ رہی ہیں ان کو خوب صورت انداز سے اپنی شاعری میں بیان کیا۔ مگر آپ کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے غزل میں جدت اور ندرت پیدا کر دی ہے۔ دور جدید کے تقاضوں کے مطابق غزل کو ہم آہنگ کرنا آپ ہی کا وصف ہے۔ جیسے فرماتے ہیں:

لے جائے اگر گردشِ حالات کہیں اور
بس جائے گا اک شہرِ خیالات کہیں اور (۱۵)

منور ہاشمی ایک کہنہ مشق غزل گو شاعر ہیں۔ان کی غزلوں میں لطافت، پاکیزگی، سبک پروری اور ندرت خاص طور پر قاری کے ذوقِ سلیم کو متاثر کرتی ہے۔وہ غزل کے مزاج کو تغزل کی فضا میں رکھتے ہیں۔ان کی غزلوں میں سلاست و روانی اور بے ساختگی ابھر کر سامنے آتی ہے۔بقول ڈاکٹر احسن جمال:

ان کی شاعری میں سلاست، روانی اور بے ساختگی بدرجہ اتم موجود ہے۔گویا میر تقی میر نے غزل کی جو تعریف کی تھی منور ہاشمی کی غزل اس پر پوری اترتی ہے۔ (۱۶)

منور ہاشمی نے اپنی غزلوں میں فکری جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ فنی محاسن بالخصوص تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔منور ہاشمی کی غزلوں میں عشق کی سرمستی کے ساتھ مظاہر فطرت کی بوقلمونی بھی ہے۔

منور ہاشمی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ نے اپنی شاعری اور شخصیت سے لوگوں کو متاثر کیا ہے۔منور ہاشمی کی شاعری ان کی شخصیت کی مکمل عکاسی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس میں کسی قسم کا ابہام، الجھاؤ اور پیچیدگی کا عنصر نظر نہیں آتا۔ایک سیدھی سادی شخصیت ہی ان کی پہچان ہے۔وہ فرماتے ہیں:

مرے نام سے ہیں روشن سبھی راستے وفا کے
مرا نام ہے منور مرا کام روشنی ہے (۱۷)

منور ہاشمی کے کلام میں خیال و جذبے کا قالب اور شعر آپس میں پیوست ہیں، شاعر کو یہ اعزاز اسی وقت نصیب ہوتا ہے جب اس کا جذبہ اور اس کا فن دونوں یکساں ہوں۔یہی خلوص، گداز پن اور سچائی منور ہاشمی کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں۔بقول مناظر عاشق ہرگانوی:

"منور ہاشمی کی غزلوں کی چمک، جذبہ، قوت حرارت اور پیغام حیات میں مضمر ہے آشوب آگہی اور روح عصر کی فکری توجیہہ سے مرصع ان کی غزلیں نئے جہان اور زندگی کی نئی تعبیر کا حوالہ ہیں۔" (۱۸)

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ منور ہاشمی کی شاعری احساسات کی شاعری ہے۔یہ احساس ان کے ہاں نظم اور غزل دونوں میں نمایاں ہے۔ان کی شاعری ان کے شعری سفر کی روداد سناتی ہے۔منور ہاشمی کی شاعری رومانی، دردمند شاعر کا فنی سفر ہے۔ان کی شاعری میں ان کے جذبات و افکار اور موضوعات کے تنوع کی کثرت کے ساتھ لوازمات شعر اور دیگر محاسن بھی بدرجہ اتم موجود ہیں ایک تخلیق کار الفاظ کو تراش خراش کر خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے۔منور ہاشمی کی شاعری کا جہاں فنی حوالہ اہم ہے وہاں اس کا فکری رخ اپنی مثال آپ ہے۔منور ہاشمی کی ساری شاعری اپنی زمین سے منسلک ہے۔رومانیت، دردمندی، حب الوطنی، معاشرہ اور اس کے مسائل ان کی شاعری کی پہچان ہے۔اور ان کی شاعری ایک مفکر

،دانشور اور عوام کے دکھوں پر کڑھنے والے بے بس شاعر کی آواز ہے۔ منور ہاشمی نے اپنی شاعری بالخصوص غزل کے ذریعے دنیائے ادب میں اپنی شہرت و مقبولیت کا لوہا منوایا۔

میں ہاشمی نہیں مروں گا مر کے بھی یہ دیکھنا
میرے دوام کا سبب میرا کلام ہو گیا (۱۹)

حوالہ جات

۱۔ سید قاسم جلال ، ڈاکٹر، ''ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزل کی فکری و فنی جہات'' مشمولہ ''پاکستان کے چند اہم غزل گو'' ، ماسٹر پبلشرز لاہور، ۲۰۱۷ء،ص ۱۸۳

۲۔ ڈاکٹر احسن جمال، شاعر، محقق اور نقاد پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی، مشمولہ فیض اقبال، از پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی، تیسرا رخ پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص: ۰۵

۳۔ منور ہاشمی، بے ساختہ، اکبراﷲ آبادی اکیڈمی، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۱۸

۴۔ احسن جمال، ڈاکٹر، زندہ رہنے والی غزل کا شاعر، مشمولہ ''نیند پوری نہ ہوئی'' نرالی دنیا پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۰۵ء، ص: ۰۹

۵۔ منور ہاشمی، سوچ کا صحرا، مکتبہ میری لائبریری لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۷۸

۶۔ قمر الطاف، مرتب، غزل اے غزل (کلیاتِ غزل) از منور ہاشمی، دنیائے اُردو پبلی کیشنز، اسلام آباد، فروری ۲۰۱۶ء

۷۔ منور ہاشمی، ''نیند پوری نہ ہوئی'' ، نرالی دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء، ص: ۱۰۰

۸۔ ایضاً، ص: ۸۶

۹۔ منور ہاشمی، کلیاتِ غزل، ایضاً، ص: ۱۱۸

۱۰۔ منور ہاشمی، بے ساختہ، زیرو پوائنٹ پبلی کیشنز، طبع چہارم، راولپنڈی، ۲۰۰۰ء، ص: ۵۳

۱۱۔ منور ہاشمی، سوچ کا صحرا، مکتبہ لائبریری، لاہور ۱۹۸۲ء، ص: ۳۱

۱۲۔ منور ہاشمی، ڈاکٹر، کربِ آگہی، وطن پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۱۹۸۵ء، ص: ۰۹

۱۳۔ منور ہاشمی، سوچ کا صحرا، ایضاً، ص: ۴۰

۱۴۔ منور ہاشمی، نیند پوری نہ ہوئی، ایضاً، ص: ۴۱

۱۵۔ منور ہاشمی، نیند پوری نہ ہوئی، ایضاً، ص: ۱۰۵

۱۶۔ احسن جمال، ڈاکٹر، زندہ رہنے والی غزل کا شاعر، مشمولہ ''نیند پوری نہ ہوئی'' ، ایضاً، ص ۰۹

۱۷۔ منور ہاشمی، بے ساختہ، ایضاً، ص: ۹۵

۱۸۔ مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر، غزل کا جہانِ نو، مشمولہ ''نیند پوری نہ ہوئی'' ، ایضاً، ص ۱۴۔۱۵

۱۹۔ منور ہاشمی، نیند پوری نہ ہوئی، ایضاً، ص: ۸۰

میر سے منور تک

ڈاکٹر کنول بتول

غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جسے جنم تو میرؔ نے دیا اور ساتھ میں غم کی چادر بھی اوڑھا دی۔ غزل غالبؔ سے ہاتھ ملا کر جب اقبال کے پاس آتی ہے تو معنویت کا لباس پہن لیتی ہے۔ پھر جب ناصر کاظمی اس کو اپنے ہاں مدعو کرتا ہے تو ایک نئے آہنگ اور ترنم میں اُس کے ساتھ اُداسی اور یادِ رفتگاں کے الفاظ زیادہ نظر آنے لگتے ہیں۔ ناصر کاظمی کا یہ دعویٰ:

کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے ناصرؔ
یہ قافیہ پیمائی ذرا کر کے تو دیکھو

اب تک تو درست تھا لیکن موجودہ دور میں یہ دعویٰ ختم ہو گیا کیوں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جن کو شہرت کا کوئی لالچ نہیں ہوتا اور وہ وقت کے دھارے پر اپنے فن کو چھپائے بہتے چلے جاتے ہیں لیکن وقت اتنا بے رحم نہیں ہے، وہ ان گوہرِ نایاب کو منظرِ عام پر ضرور لاتا ہے اور اعلیٰ ذوق رکھنے والوں کو ان چراغوں سے ضو کرتا ہے۔ انھی روشن چراغوں میں سے ایک اہم نام ڈاکٹر سید منور ہاشمی کا بھی ہے۔ ایک ایسی آواز جو کئی سال تک مکہ کی وادیوں میں گونجتی رہی، جس نے غزل کے پیروں میں ایک نئی جھانجھر ڈالی اور اس کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا جو روایت سے ہٹ کر اپنی روایت خود بناتا ہے۔ لفظوں کے کھلاڑی ڈاکٹر منور ہاشمی، کا شمار ان چند بڑے شاعروں میں ہوتا ہے جو بہت کم وقت میں ایسی منزل تک جا پہنچتے ہیں جہاں شاید ہی کوئی پہنچ پایا ہو۔ ڈاکٹر صاحب ایک عرصے تک جدہ (سعودی عرب) میں مقیم رہے اور وہاں علم و آگہی کی شمعیں روشن کرتے رہے۔ وہاں ہاشمی صاحب ''عالمی اُردو مرکز جدہ'' میں صدر کی حیثیت سے تعینات ہوئے اور پھر ''دنیائے اُردو'' اور ''القلم'' جیسے جریدے جو جدہ سے شائع ہوتے تھے، اُس کے مدیرِ اعلیٰ بھی رہے۔ انھوں نے نہ صرف غزل بلکہ دوسری اصنافِ سخن میں بھی نام کمایا لیکن اُن کا اہم کارنامہ ان کے دو غزلوں کے مجموعے ''بے ساختہ'' اور ''نیند پوری نہ ہوئی'' بہت اہم ہیں۔ منور ہاشمی کو موجودہ دور کے شاعروں میں سے صفِ اول کی حیثیت حاصل ہے۔

منور ہاشمی کا شعری مجموعہ ''بے ساختہ'' ان کے دل کے تہہ خانے میں چھپے ان کے جذبات کو اشعار کی صورت میں عیاں کرتا ہے۔ ان کی شاعری کا ہر ہر مصرعہ اپنی مثال آپ ہے اور اسی جذبات کے چھلکتے ہوئے رنگوں نے ان کو ایک منفرد حیثیت دے دی ہے۔ ان کی شاعری نہ صرف عشقِ مجازی کے رنگ خوب صورتی سے بیان کرتی ہے بلکہ وہیں جس خوب صورتی سے انھوں نے وطن سے اپنی محبت کو برملا کر دیا کہ ان کی غزلیں قاری کے لیے بہت دلکشی کا باعث بنتی ہیں۔ جس طرح بارش کے بے شمار قطروں میں دھنک میں سموئے ہوئے قطرے سورج کی روشنی پڑنے سے پورے آسمان پر اپنی خوب صورتی کی تعریف خود کرتے نظر آتے ہیں اور دھنک میں موجود خوش نما رنگ دیکھنے والوں کے دلوں کو چھو جاتے ہیں

اور ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ رنگ میری ذات کے لیے ہی بنائے گئے ہیں۔ بالکل اُسی طرح ان کی شاعری نے خود کو ایک دھنک کی شکل میں ڈھال لیا ہے جو اپنی خوب صورتی کی تعریف خود کرتی ہے اور ہر پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کہیں نہ کہیں میرے جذبات کے مترادف رنگ ضرور ہے اور اپنے احساسات اور جذبات کے مترادف بات ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے اور وہ اس شاعری کو پڑھنے پر مجبور ہو کر رہ جاتا ہے۔ منور ہاشمی اتنے عظیم شاعر کی صورت میں ابھرے ہیں کہ ان کو نہ صرف کلاسیکی اشعار پر بلکہ عصری شعور پر بھی عبور حاصل ہے۔ منور ہاشمی کی غزلیات پڑھ کر ہر اہلِ نظر اور باذوق شخصیت کے مالک انسان کے لبوں سے بے ساختہ موتیوں کی مانند تعریف بکھر جاتی ہے اور بے ذوق لوگوں کے لیے ان کی بات کی گہرائی تک رسائی حاصل کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

نہیں پہچانتے کچھ لوگ دنیا میں تو کیا ہے
مرے فن کو سبھی اہلِ نظر پہچانتے ہیں

منور ہاشمی کے کلام میں شعریت اور خوش بیانی کا حسین امتزاج موجود ہے جو کہ غزل کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام ''نیند پوری نہ ہوئی'' نہ صرف عشقِ مجازی بلکہ عشقِ حقیقی اور نعتیہ کلام میں بھی اپنی قابلیت کو عیاں کر دیا ہے اور ان کی حیثیت اُردو ادب میں ایک پائے کی سی بن گئی ہے۔ ان کی ہر غزل اپنا تعارف کچھ اس طرح کراتی ہے جیسا کہ ان کے دل سے ان کے جذبات کی روانی لفظوں کی صورت خود بخود ہوتی چلی گئی ہو۔ ان کی ہر ایک غزل اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہے۔ میں ان کی غزل کی خوب صورتی کی اور کیا مثال دوں کہ اگر کوئی ان کی غزلیات رات کے کسی پُرسکون پہر میں پڑھے تو ہر ایک شعر کسی کہکشاں کے جھرمٹ میں چمکتا ہوا تارہ ہوگا اور اس تارے کی دلفریب روشنی آنکھوں کو کھولو تو دل موہ لیتی ہے اور آنکھیں بند کر دو تو سکون اور دل کو ٹھنڈک بخشتی ہے۔

غزل اپنے منفرد ہونے کی بنا پر ان اشخاص کو بھی منفرد بنا دیتی ہے جو کہ اس کو حسن بخشتے ہیں۔ کیوں کہ غزل میں موجود عشقِ حقیقی، عشقِ مجازی، ہواؤں کا رقص، محبوب سے وصل کی خواہش اور ہجر کے درد کی لذت کو وہی لوگ خوب صورتی سے بیان کرتے ہیں جن کی شخصیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جیسے وہ بنے ہی غزل کے لیے اور غزل ان کے لیے بنی ہو۔ منور ہاشمی کا شمار بھی ان چند لوگوں میں ہوتا ہے جو بھیڑ میں موجود ہو کر بھی اپنی انفرادیت اپنی صنف کے بیان کی خوب صورتی سے واضح کر دیتے ہیں۔

ان کو نہ صرف غزل کے میدان میں بلکہ نثر کے میدان میں بھی ایک شمع کی سی اہمیت حاصل ہے جو کہ رات کی تاریکی میں اپنی خوب صورت لو اور روشنی سے پروانوں کو اپنی طرف ڈھال لیتی ہے۔ حالانکہ ان کو بہ نسبت نثر کے، غزل کہنا زیادہ پسند ہے مگر پھر بھی آپ کو ایک نثری کتاب پر ایشین ادبی ایوارڈ بھی مل چکا ہے اور آپ کو اہلِ علم و ادب کی طرف سے ''شیخ سعدی'' بھی قرار دیا گیا۔

منور ہاشمی کی غزل سے اتنی چاہت اور لگاؤ ہے کہ ان کے مطابق ان کو غزل کہنے میں تسکین ملتی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے قدرت نے ان کی ذات میں ہی یہ وصف شامل کر دیا تھا اور ان کی روح، بدن اور دل میں غزل موتیوں کی مالا کی صورت پرو دی گئی ہو اور اس مالا کا ہر ایک موتی جب ان کے لبوں سے بیان ہوتا ہے تو وہ اپنی چمک میں ایک قدرتی اثر رکھتا ہے۔ ان کی غزلیات نہ صرف ان کے شائقین بلکہ رومانی مزاج کے حامل افراد کو سکون فراہم کرتی ہیں جیسا کہ صحرا میں موجود پانی کا قطرہ کسی کو زندگی بخش دیتا ہے، بالکل اسی طرح ان کی غزلیات جب کسی شخص کے جذبات کے مترادف بات کرتی ہیں یا کسی کے احساسات کی عکاسی کرتی ہیں تو اس کے خیالات کو حیات بخش دیتی ہیں۔

منور ہاشمی کے مطابق نثری نظم کا تجربہ ان لوگوں نے کیا جو غزل میں ناکام ہوئے اور یہ بات کسی حد تک بالکل درست ہے کیوں کہ نثری نظم میں جہاں قافیہ اور ردیف کی کوئی پابندی نہیں ہوتی، جہاں الفاظ کے بہاؤ کا کوئی تسلسل نہیں بخشا جاتا، اس میں وہ دلچسپی اور کشش بھی پیدا نہیں ہوتی جو غزل کی صنف میں پائی جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ منور ہاشمی کی شخصیت کے معنی ان کی غزل سے واضح ہوتے ہیں کیوں کہ انھوں نے جس منفرد انداز میں اپنی آواز کا جادو چلایا اور اپنی غزل کو ایک منفرد مقام بخشا، وہ اس بات کی ضمانت ہے کہ ان کی اس صنف میں کچھ نہ کچھ ایسا جادوئی اثر ضرور تھا جو قاری کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور ان کا غزل سے جدا روح اور بدن کا رشتہ ان کی اپنی ایک غزل سے نمایاں ہے جس میں وہ اپنے خوب صورت الفاظ سے غزل سے اٹھکیلیاں کرتے نظر آتے ہیں:

اک دوسرے کے واسطے ہیں دونوں لازمی
میں تیرا جسم تو ہے مری جان اے غزل!

اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے اپنی غزل میں ایسی تازگی، خوش بیانی اور شگفتگی پیدا کر دی ہے کہ ان کا نام اُردو ادب میں سنہرے حروف میں لکھا جا چکا ہے اور ان حروف کو مٹانا کسی کے لیے اتنا آسان نہیں بلکہ شاید اس کو مٹانے کے لیے اگر کوئی اور منور ہاشمی بھی جنم لے تو غزل میں ان کا مقام نہ اپنی اہمیت کھو سکتا ہے اور نہ کھوئے گا۔

ڈاکٹر منور ہاشمی نے غزل میں اپنی انفرادیت ثابت کر دی ہے۔ ایک معاصر قومی روزنامے نے آپ کو عہدِ رواں کا اہم شاعر قرار دیا ہے۔ آپ کی شاعری کی کتابیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قارئین کو نئے موضوعات سے متعارف کرایا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاں ہمیں فکری وسعت نظر آتی ہے۔ اُن کے ہاں جدت اور وسیع معنویت پائی جاتی ہے۔

ایک میگزین کو انٹرویو دیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے نہایت خوب صورت بات کی ہے کہ ''غزل مجھے راس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غزل مجھ سے مایوس ہے اور میں غزل سے۔ ویسے بھی غزل کے سامنے تمام اصناف ہیچ ہیں۔ یہ سب پر حاوی ہے۔ اس میں موضوعات اور مضامین کا تنوع اس دعویٰ کا ثبوت ہے کہ غزل میں جتنی گنجائش ہے، کسی دوسری صنف میں نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شعر میں ایک الگ الگ مضمون سمویا جا سکتا ہے۔''

ڈاکٹر منور ہاشمی کا نام اُن عظیم لوگوں میں شمار ہوتا ہے جو صرف ماضی میں زندہ نہیں رہتے بلکہ مستقبل پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ایک موہوم سی اُمید انھیں ہر وقت گھیرے رکھتی ہے۔آپ کے ہاں وقت کی بہت اہمیت ہے۔ ماہ و سال اور ہر گزرتا دن اُن کے ہاں اہم مقام رکھتا ہے:

تمھارے قرب کے لمحات پر لگا کے اُڑے
وہ دن گیا، وہ مہینہ گیا، وہ سال گیا

ہاشمی صاحب غزل لکھنے کے تمام رموز و اوقاف سے بحسن و خوبی واقف ہیں۔خوب صورت تشبیہات کا استعمال اُن کی شاعری کو چار چاند لگا دیتا ہے اور ان کی غزلوں میں ایک ایسا حسن اور دلکشی اور آہنگ پایا جاتا ہے جو ان کو موجودہ دور کے شاعروں میں ممتاز مقام دیتا ہے۔آپ کے ہاں لفظوں کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے۔لفظوں کا ایسا جال پھیلاتے ہیں کہ قاری اُس کو پڑھتے ہوئے بڑی دیر تک پھڑ پھڑ اتا رہتا ہے۔

''بے ساختہ'' کی بہت سی غزلیں فطرت کی عکاسی کرتی ہیں۔دریا، بارش، پیڑ، پھول، پہاڑ، زندگی وغیرہ جیسے الفاظ کثرت سے آپ کے ہاں نظر آتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کو بات بیان کرنے کا حسن آتا ہے۔ایسی جرأت اور بے باکی سے بات کرتے ہیں کہ سراسیمگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔کلمۂ حق کہنے کی ہمت اُن کے اندر موجود ہے،ان کی غزلوں میں نرم وملائم بحریں استعمال ہوئی ہیں،موضوعات میں تنوع اور جدت کے ساتھ وسعت پائی جاتی ہے۔اشعار میں ایک سُر کی کیفیت اور ترنم پایا جاتا ہے:

یہی میری زندگی ہے یہی میری شاعری ہے
مجھے درد سے ہے الفت مری غم سے دوستی ہے

حقیقت میں ان کی شاعری ان کے دل کی طرح حسین ہے۔انھوں نے غزل کو جو وقار بخشا ہے، وہ عام غزل گو شعرا کو میسر نہیں۔ان کی غزل جدید لہجے اور شدتِ احساس سے عبارت ہے۔ انھوں نے شعر کو معیار سے آشنا کیا ہے اور معیار کو شعر کی اساس قرار دیا ہے:

میرا ہر اک شعر ہے ممنونِ اخلاصِ نظر
کوئی فن پارہ مرا معیار سے گرتا نہیں

غزل کی پہچان: ڈاکٹر منور ہاشمی

شاعر علی شاعر

ڈاکٹر منور ہاشمی کے اشعار میں روانی اور سلاست بلا کی موجود ہے۔ ان میں کوئی شعر ایسا نہیں جو ثقیل بیان اور لکنتِ اظہار کا نقص رکھتا ہو۔ ان کا اکثر کلام سہلِ ممتنع کی عمدہ مثال ہے۔ ایسی شاعری ہر دل عزیز ہوتی ہے اور اُردو زبان و ادب سے تعلق رکھنے والا ایک بڑا طبقہ ایسی شاعری کو نہ صرف پسند کرتا ہے بلکہ ایسے شاعر کے گُن بھی گاتا ہے جو اس کا تخلیق کار ہو۔ ڈاکٹر منور ہاشمی کے اشعار فنی و عروضی خوبیوں سے بھی آراستہ ہیں اور ان میں ندرتِ خیال کی رعنائی بھی موجود ہے۔ ان کا کوئی شعر علامت کے حسن سے آراستہ ہے، کسی شعر میں بیان کی بے ساختگی ہے۔ کوئی شعر سوچ کی وسعت لیے ہوئے ہے اور کسی شعر میں تخیل کی بلند پروازی آسمانِ سخن کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کوئی شعر فکر وخیال کی آماج گاہ ہے تو کسی شعر میں موجوں کی سی روانی ہے اور ان کا اکثر کلام سلیس اور آسان فہم ہے۔ ایسا کلام سنتے ہی دل میں اُتر جانے کی خوبی سے آراستہ ہوتا ہے اور قارئینِ شعر وسخن کو از بر کرنے میں ذرا دقت نہیں ہوتی۔ ایسے اشعار ہی ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرتے ہیں۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کا کلام روزمرہ کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ کلام ان کو ممتاز شعرائے اُردو کی اوّل فہرست میں شامل کرتا ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کرتے ہیں:

اپنی سوچوں کے مطابق کچھ بھی کر سکتا نہیں
آدمی حالات کے ہاتھوں بہت مجبو رہے

اک اجنبی کو اپنا بنانے کے واسطے
ہم نے دیے ہیں سارے زمانے کے واسطے

ہر شخص ہوا جاتا ہے اب عشق سے تائب
سوچوں میں تغیر مرے انجام سے آیا

ڈاکٹر منور ہاشمی کا کلام ایجاز واختصار کی خوبیوں سے مزین ہے۔ وہ نہ تو لفاظی کے شوقین ہیں اور نہ طوالت سے بات کرنا پسند کرتے ہیں۔ وہ چند لفظوں میں زیادہ بات کہہ دینے کے ہنر سے واقف ہیں۔ یہ صنعتِ ایجاز واختصار جس شاعر کی شاعری میں رواج پاتی ہے اسے بڑی شاعری بنا دیتی ہے۔ وہ چھوٹی بحور میں بھی نہایت آسانی اور روانی سے بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کی تفسیر پیش کرتی ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تشریح کرتی ہے اور زندگی کے نشیب وفراز سے گزر کر تلخ وشیریں تجربات کا منظوم اظہار ان کی شاعری ہے۔ ان کے اشعار

زندگی کے صاف وشفاف آئینے ہیں جن میں زندگی کی رنگارنگی کے شعری چہرے پوری طرح عیاں ہوتے ہیں۔ان کے عکس بڑے صاف وشفاف ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعرِ موصوف نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اسے خوب برتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے عمیق مشاہدات اشعار کے قالب میں ڈھلتے چلے گئے ہیں اور زندگی کے مختلف روپ اشعار کے پیکر میں مجسم ہوگئے ہیں۔حیاتِ انسانی کے بے شمار چہرے اپنے تمام تر نکھار کے ساتھ ان کی غزل میں موجود ہیں، اسی سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لہو کا ایک بھی قطرہ ہے اپنے جسم میں جب تک
گلستاں میں گلوں کا رنگ پھیکا ہو نہیں سکتا

میرؔ سے لے کر منورؔ تک فقط رُسوائیاں
عشق رکھتا ہے عداوت کس قدر سادات سے

سہلِ ممتنع کے معروف شعرا میں ناصر کاظمی، ظفر اقبال، جون ایلیا اور انور شعور کا نام قابلِ ذکر ہے۔اس صف میں پانچویں نام ڈاکٹر منور ہاشمی کا شامل کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ان کے اشعار نہ صرف مختصر بحوروں میں آسان فہم اور سلیس ہیں بلکہ وہ چھوٹی بحر میں بڑی بات کہہ گئے ہیں۔میں نے اُردو شاعری میں متقدمین، متوسطین، متاخرین سے لے کر عہدِ حاضر کے معتبر وثقہ شعرا کے کلام میں سہلِ ممتنع کی نشانیاں دیکھی ہیں۔یہ نشانیاں ڈاکٹر منور ہاشمی کے کلام میں بھی موجود ہیں جو اُن کا اختصاص اور مرتبۂ شاعری متعین کرتی ہیں۔اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس اندازِ بیاں میں انفرادیت کے حدود کو چھور ہے ہیں۔سہلِ ممتنع صرف آسان شعر کہہ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ سہلِ ممتنع میں زبان کی شاعری کے تمام لوازمات موجود ہوں اور اگر سہلِ ممتنع کے کسی شعر کی نثر کی جائے تو انہی الفاظ میں نثر بھی ہو جائے۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سہلِ ممتنع کے چند اشعار پیش کیے جائیں۔

دل کے جذبے جوان رکھتی ہے
تیرے حسن و جمال کی خوشبو

وہ ایک شخص جو مجھے پہچانتا نہیں
میرے بغیر کوئی اسے جانتا نہیں

تمہارے بعد بھی دیکھوں کسی کو
مری آنکھوں میں اتنا دم نہیں ہے

ڈاکٹر منور ہاشمی کے اشعار بولتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، ان کے الفاظ گونگے نہیں ہیں، ان کی زبان وآواز

ہے۔ان کے اشعار جامد بھی نہیں ہیں متحرک ہیں، ان کے کلام میں لکنتِ اظہار کا جھول بھی نظر نہیں آتا۔ ان کی زبان صاف اور شستہ ہے۔لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ناقدینِ اُردو ادب کی نظر سے ایسے شعرا اوجھل رہتے ہیں۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آج کا ناقد عہدہ پرستی سے مرعوب ہو کر لکھ رہا ہے۔شخصیت پرست ہو گیا ہے، مالی منفعت کو مدِ نظر رکھتا ہے اور دوستیاں نبھا رہا ہے۔وہ حکومت کے صاحبِ اقتدار و اختیار کی چاپلوسی میں لگا ہوا ہے اور اس نے اپنے مفاد کو بھی پیشِ نظر رکھا ہوا ہے۔جس کی وجہ سے اسے ایسے شعرا نظر نہیں آ رہے جو سچا اور اچھا شعر لکھ رہے ہیں اور زبان کی آبیاری کر رہے ہیں اور اُردو ادب کے دامن کو وقیع سرمایۂ شاعری سے مالامال کر رہے ہیں۔ذرا ملاحظہ فرمائیں جو شاعر اس قسم کے اشعار لکھ سکتا ہے وہ بھلا ثقہ اور معتبر کیوں نہ ہوگا، اس کی آواز توانا کیوں نہ ہوگی:

ہم ساکنانِ شہرِ وفا سارے شہر میں
لے لے کے تیرا نام تجھے ڈھونڈتے رہے

ہم خانہ بدوشوں سے بڑھاؤ نہ رہ و رسم
دن اپنا کہیں اور ہے اور رات کہیں اور

ہم اس کی لذتوں سے ہیں سرشار پیشگی
جو زخم تو نے دل پہ لگایا نہیں ابھی

میں نے اکثر ایسے شعرائے اُردو کے فن و شخصیت پر تنقیدی مضامین لکھے ہیں جن کو ان کے جائز حق سے محروم کیا جا رہا ہے اور ان کی آواز کو ہمیشہ سے دبانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ڈاکٹر منور ہاشمی زبان کی شاعری خاص طور پر کر رہے ہیں پھر اس دور کے ناقدینِ اُردو ادب ان سے بے خبر کیوں ہیں۔ان کی معتبر اور توانا آواز کو سنی اَن سنی کیوں کر رہے ہیں۔ اُنہیں جان بوجھ کر نظر انداز کیوں کیا جا رہا ہے۔اگر ناقدینِ اُردو ادب یہ عذر پیش کریں کہ وہ زیادہ نام ور نہیں یا ان میں نام و نمود کی خواہش موجود نہیں، یہ عذر قابلِ قبول نہیں ہے۔ڈاکٹر منور ہاشمی کا نام اہلِ ادب کے دلوں پر لکھا ہوا ہے اور اب تک ان کی جس قدر شہرت ہوئی ہے ان کے پُر تاثیر کلام کی وجہ سے ہے۔وہ نصف صدی سے زیادہ عرصے سے سچا شعر کہہ رہے ہیں اور گیسوئے اُردو کو اپنے شانۂ تدبیر سے سنوارتے رہتے ہیں۔

وہ پاکستان کے کہنہ مشق اور پختہ کار شعرا کی صف میں ہیں اور ان سے شانے سے شانہ ملائے کھڑے ہیں۔شعری ادب کا دیانت دار مؤرخ انہیں کسی طور نظر انداز نہیں کر سکتا، کیوں کہ ان کا رنگِ شاعری انفرادیت کا حامل ہے۔یہی کارشیشہ گری ہے۔یہ کارشیشہ گری وہی شاعر کر سکتا ہے جس میں قادر الکلامی کی خوبی موجود ہو، جو کہنہ مشق اور پختہ کار شاعر ہو۔فکر و خیال کو مجسم کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔ایجاز و اختصار کے لیے مناسب الفاظ و لفظیات کا انتخاب کر سکتا ہو۔بڑے بڑے

خیالات کو سمیٹ کر ایک ایک شعر میں ڈھال دینا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے اور یہ تمام صفات شاعرانہ ڈاکٹر منور ہاشمی میں موجود ہیں۔ اس ضمن میں مزید چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ایسا نہ ہو کہ روشنی بینائی چھین لے
مانوس ہو چکے ہیں بہت تیرگی سے ہم

میں بھی پابندِ اَنا تھا وہ بھی مجبورِ خودی
میں بھی پیاسا رہ گیا اور وہ بھی پیاسا رہ گیا

کون دہلیزوں پہ اپنا سر پٹختا رہ گیا
تم ذرا بامِ تکبر سے اُتر کر دیکھتے

ڈاکٹر منور ہاشمی کی شاعری پڑھنے کے بعد یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ کل کو جزو میں لپیٹ دینے کے فن سے بہ خوبی واقف ہیں۔ ان کے اشعار کی سب سے بڑی خوبی وہ موسیقیت اور غنائیت ہے جو اُن کے اشعار کا حسن ہے، وہ نغمگی کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوتی ہے۔ ایسی نغمگی میں شعریت کا حسن اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ ان کے اشعار شعری بُنت کی سادگی و روانی اور حسنِ بیاں میں کسی سے کم زور نہیں ہیں۔ ان کی راہ سخن جدید نہیں تو نیم جدید ضرور ہے۔ اُنہوں نے خیالات کو جس طرح جدید انداز سے سجا کر پیش کیا ہے یہ اندازِ سخن بہت کم شعرا کو نصیب ہوتا ہے۔ شاعرِ موصوف بہت آسان لفظوں میں اپنے مافی الضمیر کو اشعار کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ ان کی ایسی ہنرمند شاعری کا اعتراف نہ کرنا بخل ہے۔ ان کی اکثر غزلیں ترنم آفرین ہیں، جن کو گنگنانے سے ایک عجب سرور ملتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ منور صاحب سُر و ساز اور راگ و دھن سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں کو بہ آسانی گایا جاسکتا ہے۔ ان کے شعری اوصاف مترنم، شعریت، غنائیت، رواں دواں، روانی و سلاست اور فصاحت و بلاغت کو دیکھتے ہوئے ان کی عظمتِ شاعرانہ کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ آخر میں چند شعر پیش کر کے اپنا مقدمہ ختم کرتا ہوں:

میرے خلوص کو نہ کوئی اور نام دے
میں جس کا اہل ہوں مجھے تو وہ مقام دے

لوٹ آنا ترا مشکل ہے یہ ہوتی جو خبر
میں کبھی خود سے تجھے دور نہ جانے دیتا

منور ہاشمی غزل کے ہمہ جہت شاعر

ڈاکٹر شمائلہ مہرین

مرے وجود کی تفہیم ہو رہی ہے ابھی
جو آنے والے ہیں سارے میرے زمانے ہیں

پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی اردو کے نامور ماہر اقبالیات شاعر اور فلسفی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔آپ ایک مدلل شخصیت کے مالک انسان ہیں۔آپ موجودہ دور میں مفکر، دانشور اور بین الاقوامی سطح پر اقبال شناسی کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی ان قابل احترام شعرا میں شامل ہیں۔جن کا کلام شائستگی ونفاست کیف واثر اور فنی اعتبار سے ایک معیاری چیز ہے اگر چہ ان کا سرمایہ شعری بہت مختصر اور منتخب ہے۔آپ خوبصورت احساسات وجذبات کی حامل شخصیت ہیں۔بغیر رُکے، نا امید ہوئے بغیر ،تنقید کی پروا کیے بغیر اور بغیر کسی صلے چہرے پر مسکان سجائے دل میں محبت کے جذبات لیے بنجر زمین کو زرخیز بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔اپنے پیشے کو جنون سمجھنے والے استاد منور ہاشمی جیسی شخصیت کے لیے قلم اٹھانا بہت مشکل کام ہے اس جیسے شفیق استاد کے لیے مناسب الفاظ کے انتخاب کرنا میرے لیے ایک کٹھن مرحلہ ہے۔

منور ہاشمی جتنے اچھے انسان ہیں اتنے اچھے شاعر بھی ہیں جو خلوص ان کی شخصیت میں نظر آتا ہے وہی ان کے فن میں جھلکتا ہے۔احساس وتاثر کی جو شدت ان کی غزلوں میں ملتی ہے۔وہی ان کی زندگی میں ملتی ہے۔ان کی شاعری ترقی پسندانہ فکر جدید کی عکاسی کرتی ہے۔ان کے ترقی پسندانہ نظریات انسانی ہمدردی کے علمبردار ہیں ان کے ہاں ادب اور معاشرے کے گہرے مطالعے کا عکس نظر آتا ہے۔منور ہاشمی رجحان ساز اسلوب اور کثیر الجہات شعری شخصیت ہونے کے سبب اردو شاعری میں منفرد اہمیت کے حامل ہیں۔

ان کے ہاں ذاتی تجربات کی عکاسی بھی شاعری میں جابجا نظر آتی ہے۔ان کی غزلوں میں منفرد شخصیت کے تجربات اور محسوسات کا اظہار ملتا ہے۔وہ نہ صرف زندگی پر تنقید کرتے ہوئے اس کو ایک مثالی اور امکانی دنیا کے تصور کے مطابق ڈھالنے کی دعوت دیتے ہیں بلکہ حیات وکائنات کی ایک خاص زاویے سے تصویر کشی بھی کرتے ہیں۔

اب صورتِ حالات نہاں ہے نہ عیاں ہے
یہ کون سی منزل ہے پڑاؤ یہ کہاں ہے
منسوب تھی جس سے مری قسمت کی بلندی
میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں ستارہ وہ کہاں ہے(۱)

ڈاکٹر منور ہاشمی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے تجربات کو اس طریقے سے ترتیب دیتے ہیں۔ کہ اس میں زندگی کے مختلف محرکات واضح ہوتے چلے جاتے ہیں وہ موجودہ دور کے سماجی مسائل اور اخلاقی آداب کو پرکھتے ہیں اور انھیں رومانی پیرائیہ میں بیان کرتے جاتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی جمالیاتی انداز فکر ہے۔ جس سے انسانی درد، عصری آگہی اور سیاسی شعور کے عنصر نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے:

اک خوف مجھے صبح کے ہنگام سے آیا
مہماں نہ چلا جائے جو کل شام سے آیا

میرے لیے سرمایۂ توقیر رہے گا
اک سنگِ ملامت جو ترے بام سے آیا(۲)

منور ہاشمی کے ہاں زندگی کی چیرہ دستیوں اور بے ثباتی کا اظہار بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ جہاں آپ کے ہاں ذاتی اور جذباتی کشمکش ہے وہیں زمانے کا کرب اور سماجی تقاضے بھی ان کی نظموں کا خاصہ ہیں۔ حیات کی چھپی ہوئی تلخیوں کی آمیزش زندگی کی دشواریوں بھری اور مشاہدے کی گہرائی پوری صداقت کے ساتھ نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کی شاعری کا اصل رنگ ان کا پیرائیہ اظہار ہے۔ جس میں تغزل کا رنگ آہنگ نشین ہوتا ہے یہی طرزِ عمل ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہے تغیرات کی قدرت اور تشبیہوں کی جدت ان کے اہم اجزاء ہیں۔ جن غزلوں میں یہ اجزا باہم اکٹھے ہو جاتے ہیں واقعتہً بے مثال ہیں۔ بیان کی شگفتگی ایسے اجزاء میں درجہ کمال پر نظر آتی ہے کہ پڑھنے والا کچھ دیر کے لیے کھو سا جاتا ہے:

ہر سمت اک سکوت ہے ویران ہے فضا
دنیا کو گنگ کر گئی اہلِ سخن کی موت
مثلِ کلاہِ کوہِ ہمالہ مری انا
جس کو فنا نہ کر سکی میرے بدن کی موت(۳)

ڈاکٹر منور ہاشمی کی شاعری کی روحِ رواں اور بنیادی خصوصیت موسیقیت ہے جو قاری کے دل اور روح کو مسرتوں

کے پھولوں سے بھر دیتا ہے اور قاری لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی شاعری میں دلکشی اور جاذبیت جیسے عناصر اجاگر ہوتے ہیں۔ شعر میں ایسے الفاظ موقع محل کے مطابق استعمال کرتے ہیں کہ ان کے یہ الفاظ لڑی میں پروئے ہوئے موتیوں کی مانند محسوس ہوتے ہیں۔ جس میں کشش اور جاذبیت دونوں موجود ہوتیں ہیں۔

دل کملا ہے گزرے وقت کا ہر سندیسہ یاد کرے
بیت گیا جو پیار میں تیرے لمحہ لمحہ یاد کرے
تیری دید کو ترسیں میرے آنگن کے مرجھائے پھول
پیلی پڑتی بیلیں، رنگ بدلتا سبزہ یاد کرے (۴)

منور ہاشمی کی تمام شاعری ایک ایسی وجد انگیز غنائیت سے معمور ہے کہ جس کے سُر سنگیت شاعر کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں جنم لیتے ہیں اور خون جگر سے پرورش پا کر قاری کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی ان کا سب سے بڑا کمال ہے:

یہ حوصلہ ہے ترا تو ہے آج بھی زندہ
بچھڑ کے تجھ سے مگر میں تو مر گیا جاناں (۵)

ڈاکٹر منور ہاشمی کے ہاں رومانویت کا پہلو بھی نظر آتا ہے ان کے ہاں حسن، عشق، محبت، الفت کی نشاط انگیز میٹھی میٹھی جادو بیانی، سحر طرازی اور خارجیت کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ رومانویت صرف حسن و عشق کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کی ایک کیفیت کا نام ہے جس میں جذباتی کیفیت کا رنگ اس قدر شوخ اور گہرا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے قلبی کیفیات کا رنگ قدرے پھیکا پڑ جاتا ہے۔ رومانویت روح اور دل کی ایسی کیفیت کا نام ہے۔ جس کی بنیاد پر روح کا افق وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے پھر اس افق پر ہزاروں مہر ماہ درخشاں دکھائی دیتے ہیں جس کی چمک سے کائنات کا ذرہ ذرہ جگمگا اٹھتا ہے اور رومانوی شاعری اور قاری اس روشنی میں ایک دلفریب خوشی اور ذہنی سکون محسوس کرتا ہے۔

یہی میری زندگی ہے یہی میری شاعری ہے
مجھے درد سے ہے الفت مری غم سے دوستی ہے
میں جہاں جہاں سے گزرا بڑے امتحاں سے گزرا
مجھے زندگی سے بڑھ کر تری جستجو رہی ہے (۶)
کیا ہے ترک تعلق کا فیصلہ تو نے
یہ زہر میں نے پیا ہے تری خوشی کے لیے

میں اپنا زخم چھپاتا ہوں، مسکراتا ہوں
کبھی خود اپنے لیے اور کبھی کسی کے لیے(۷)

شاعری انسان کا وہ جذبہ ہے جو اندرونی اضطراب اور بے چینی کی کیفیت سے جنم دیتا ہے۔ یہ وہ جذبہ اور جنون ہموج طلاطم اور جوار بھاٹا ہے جس نے انسانی زندگی کی حقیقت کو واضح کیا۔ شاعری نہ صرف الفاظ کا مجموعہ ہے بلکہ وہ احساسات کا مجموعہ ہے جو شعر کی زبان بن کر احساس پر چھا جاتا ہے۔

اور اگر شعر میں احساس کی قوت نہ ہو تو وہ پیغام بن سکتا ہے نہ ہی بیدار کر سکتا ہے۔ شاعر کا کام ہی حق پر قائم رہنا، سچ بولنا، بیدار کرنا، آگاہ کرنا ہے۔ ڈاکٹر منور ہاشمی کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ان کی شاعری مردہ دلوں میں توانائی پیدا کرتی ہے اور قاری کو دنیا کی حقیقت سے آگاہ کرتی ہے۔

کیسے کیسے راستے ہم نے تلاشے دشت میں
زندگی کے نت نئے منظر تراشے دشت میں
کیسی کیسی بستیوں سے آ گئے ہیں کون لوگ
اپنے کاندھوں پر اٹھائے اپنے لاشے دشت میں(۸)

ڈاکٹر منور ہاشمی کا اسلوب بہت سیدھا سادہ اور دل میں اتر جانے والا ہے۔ ان کے ہاں شائستگی، برجستگی اور بے ساختگی ایسی خصوصیات ہیں۔ جس کی نظیر اس دور کے دوسرے شعرا کے ہاں نہیں ملتی۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی رنگ کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ ان کی غزل کا سب سے بڑا وصف تغزل ہے۔ جس کے معنی یہ ہے کہ غزل میں جن جذبات کا اظہار کیا جائے وہ فطری ہوں۔ ان کو بیان کرنے میں شاعر ایک خاص تہذیب اور نظم وضبط کو ملحوظ خاطر رکھے۔

منور ہاشمی کی غزلوں میں اسلوب سخن اور پیرائیہ اظہار کا ایک جہان تو ایک نئی فضا اور تخیل و تفکر کی نئی وسعتیں ملتی ہیں۔ ان کا سوچتا ہوا لہجہ ان کے پاس ہونے والے واقعات کی اندرونی گہرائیوں سے ابھرتا ہے،،(۹)

سوچتا ہوں وہ میری زیست میں آیا کیسے
دل کا در بند تھا اس شخص نے کھولا کیسے
لوگ کہتے ہیں مرا نام تھا لب پر اس کے
میں ہوں حیران کہ یہ مرحلہ آیا کیسے (۱۰)

☆☆☆

درد و الم ، جفا و ستم ، بے قراریاں
ہم پر جمال یار کے احسان ہیں بہت

لوگوں کو راس آ گئی کوتاہ قامتی
ہم اپنے طولِ قد سے پریشان ہیں بہت (۱۱)

آپ کی غزلوں میں جہاں سادگی، متانت اور شائستگی کی کیفیت کارفرما نظر آتی ہے وہیں آپ کے اشعار میں ہلکی سی کسک، حسرت، تشنگی، بے اطمینانی کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ان کے ہاں ایک ایسے انسان کی حیرت وحسرت کی کیفیت ملتی ہے جس کے دل کا غنچہ کھلتے کھلتے رہ گیا ہو۔ ان کے ہاں دنیا کی بے ثباتی اور فانی ہونے کے حوالے سے بھی بے اطمینانی کا اظہار ملتا ہے آپ نے اپنے اردگرد جو دیکھا اور محسوس کیا اس کو نہایت سلیقے سے اپنے اشعار میں ڈھال دیا۔

شاید میری کٹیا کا پتا تجھ کو بتائے
چھوڑ آیا ہوں نقشِ کفِ پا تیری گلی میں
در کتنے ہی کھلتے رہے اک در کے علاوہ
اک درد بھری سن کے صدا تیری گلی میں
یہ دائرہ قسمت کا ہے یا تیری گلی ہے
اک عمر چلا پھر بھی رہا تیری گلی میں (۱۲)

منور ہاشمی کا یہ رنگ خواجہ میر درد اور میر تقی میر سے ملتا ہے۔ جس طرح ان کے ہاں حقیقت کا رنگ، درد کی چاشنی ،اور سوز و گداز ہر جگہ نظر آتا ہے منور ہاشمی کے ہاں بھی میر و درد جیسا رنگ و آہنگ نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں شوخیِ تحریر، دروں بینی، تفکر اور شدتِ احساس کی جھلکیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں جو کہ عشق میں ناکامی نہیں بلکہ سماجی اور معاشرتی محرومیاں ہیں

شہر نے اس کے لیے دار سجا رکھی تھی
جس نے تحریک محبت کی چلا رکھی تھی
دوستوں نے سرِ بازار اچھالا اس کو
بات جو میں نے ابھی خود سے چھپا رکھی تھی
اک ترے درد کی دولت کو سنبھالے رکھا
اور سینے میں بھلا چیز ہی کیا رکھی تھی (۱۳)

ڈاکٹر منور ہاشمی ہمہ جہت، ہشت پہلو، رنگا رنگ اور پروقار شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے کمالات کے کسی ایک گوشے کا بھی اس طرح سے تعارف نہیں کرایا جاسکتا۔ ان کی شاعری بے پناہ خصوصیات کی حامل ہے۔ اس میں زمانے کے درد کی چاشنی، دنیا کی بے ثباتی، تصوف، سوز و آہنگ، سلاست و روانی، رنگینیِ الفاظ اور شوخ و چنچل لہجہ آپ کی غزل کا خاصہ

ہیں۔ آپ نے اپنی غزل کی بنیاد خلوص اور محبت پر رکھی ہے۔ان کی غزلوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سپردگی و محویت، سنبھلی ہوئی کیفیت، پرخلوص لہجہ، غم کو برداشت کرنے کی صلاحیت ان کے اشعار میں بے پناہ اثر اور تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ جو ان کی عشقیہ شاعری کو اس مقام تک لے جاتی ہے۔ جو کلاسیکی شعرا کا خاصہ رہی ہے۔ ان کا پر تاثیر لہجہ اور پاکیزہ خیالات ایسی چیزیں ہیں جو ہمیشہ دل کو بھاتی رہیں گی۔ پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی ایک اچھے انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم شاعر بھی ہیں۔

حواشی

۱: منور ہاشمی، ڈاکٹر پروفیسر، غزل اے غزل، کلیات، قمر الطاف، مرتب، دنیائے اردو پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۶، ص ۲۷؛

۲: ایضاً، ص، ۳۳؛

۳: ایضاً، ص، ۲۲۲

۴: ایضاً، ص، ۲۲۳

۵: ایضاً، ص، ۱۹۷

۶: ایضاً، ص، ۱۷۶

۷: ایضاً، ص، ۱۵۴

۸: ایضاً، ص ۱۱۵

۹: مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر، غزل کا جہان نو، بحوالہ غزل اے غزل، کلیات، ص، (۱۴)؛

۱۰: ایضاً، ص ۱۱۱

۱۱: ایضاً، ص ۱۱۲

۱۲: ایضاً، ص ۸۰

۱۳: ایضاً، ص ۸۰

روشنیاتِ ہاشمی

پروفیسر ثمینہ گل

روشنی اندھیرے کی پہچان کراتی ہے۔ جہاں جہاں اندھیرے ہوں وہاں روشنی ہی اپنے وجود سے اندھیرے کو مغلوب کر دیتی ہے۔ غم کی سیاہ رات ہو یا شعور کی تاریک آنکھ دونوں صورتوں میں روشنی زندگی کو بصیرت اور بصارت عطا کرتی ہے۔ شکستہ زندگی میں امید کی ایک کرن تاریکی میں بھٹکے ہوؤں کو راستے دکھاتی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کی ایسی منور شخصیت اپنے اردگرد کے لوگوں کی زندگیاں منور کر رہی ہے۔

پروفیسر منور ہاشمی جو سابقہ صدر شعبہ اُردو وفاقی یونی ورسٹی اسلام آباد خدمات انجام دیتے رہے، اس وقت نادرن یونی ورسٹی نوشہرہ میں بطور ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز فرائض ادا کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر منور ہاشمی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں اعلیٰ مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ منتظم بھی ہیں انھوں نے ڈائریکٹر ریسرچ ایسٹرن ٹی وی، صدر عالمی اُردو مرکز اور گروپ ایڈیٹر پاکستان گروپ آف نیوز پیپرز کو انتظامی صلاحیتوں کی روشنیاں عطا کیں۔ وہ ایک مدرس، منتظم، مدبر، مفکر، دانشور اور ماہر اقبالیات ہیں۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کی بصیرت و بصارت کی روشنی جامد نہیں ان کی شخصیات کی کرنیں نئی راہوں کی سمتیں دکھاتی ہیں۔ جب وہ ''سوچ کے صحرا'' میں ''کربِ آگہی'' سے گزرتے ہیں تو ''بے ساختہ'' کہہ اُٹھتے ہیں ''لوح بھی تو قلم بھی تو'' ۔ ڈاکٹر منور ہاشمی کی نعت عقیدت ومحبت سے آگے کا سفر طے کرتی ہے وہ اپنی ذات میں ذاتِ رسول ہاشمی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی رحمتِ خاص اور نعمتِ خاص کو پاتے ہیں کیونکہ ڈاکٹر منور ہاشمی کی ذات قریش کے ہاشمی قبیلے سے جڑی ہوئی ہے۔ تبھی تو منور ہاشمی شکر بجالاتے ہوئے یہ کہہ دیتے ہیں۔ ''یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے'' یہاں انھوں نے اپنی محبت اور عشق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پھول اُگائے جس کی خوشبو سے اہل علم وادب کے اذہان معطر ہوئے۔

اُردو ادب میں صنفِ شاعری قدیم روایت ہے۔ شاعری میں نظم کو اولیت حاصل ہے تاہم غزل نے نظم کے پہلو سے جنم لیا اور جلد ہی اپنی انفرادی حیثیت کو منوالیا۔ شاعری زندگی کے چھپے ہوئے بھید کھولتی کائنات میں پوشیدہ راز بتاتی ہوئی زندگی کو ہموار کرتی چلی جاتی ہے۔ نظم کی طرح غزل بھی زندگی کے نئے راستے تلاشتی ہے۔ صنفِ غزل میں ڈاکٹر منور ہاشمی کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ ان کے شعری مجموعوں کی کلیات ''غزل اے غزل'' جس کو قمر الطاف نے بڑی محنت اور محبت سے ترتیب دیا ہے جو لائق تحسین ہے۔

منور ہاشمی کی غزل کے جدید استعارے نئے معانی کے ساتھ ابھرتے ہیں ان کا اظہار یہ نئی سوچ اور نئی فکر کے پیکر تراشتا ہے ان کا تخیل تجربات ومشاہدات کی بھٹی میں پک کر نمو پاتا ہے۔ جس سے ان کی غزل کا کینوس مزید وسیع ہو جاتا ہے

جہاں وہ زندگی کو کئی رنگوں کے بیچ دیکھتے ہیں ان کے خیال میں دلوں کا درد ہی زندگی کی علامت ہے وہ درد وغم کو شکستگی اور مایوسی کے بجائے جینے اور حوصلے کا سب سے بڑا سرمایا سمجھتے ہیں۔

شان و شوکت شب ہجراں کی نہ کم ہوجائے
ہم نے اشکوں سے کیے رکھا چراغاں ہر دم

درد سے رشتہ جوڑنے والے ڈاکٹر منور ہاشمی شہر دل کی خشک زمین میں جب چلتے ہیں تو بہت سے نامکمل خوابوں کے جزیروں میں پہنچ جاتے ہیں۔ کیونکہ خواب مکمل کرنے کے لیے انھیں نیند پوری کرنی پڑتی ہے جو تا عمر ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہے وہ ادھوری نیند کے ادھورے سپنے مکمل نہیں کرتے بلکہ یہ کہہ کر زندگی سے شکوہ کرتے ہیں۔

ایک ہی مسئلہ تاعمر مراحل نہ ہوا
نیند پوری نہ ہوئی خواب مکمل نہ ہوا

ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزل نے زندگی کی خارجی اور داخلی شہادتوں کو کمال ہنرمندی سے بیان کیا ہے وہ قلبی واردات کو ایسے لفظوں کا جامہ دیتے ہیں۔ جہاں معانی اپنے اندر گہرائی اور گیرائی کے در وا کر لیتے ہیں۔ ان کی غزل وقت کے بدلتے ہوئے تقاضے پورا کرتی ہر عہد میں انفرادیت منوالیتی ہے۔ وہ مشکل حالات میں گوشۂ تنہائی ڈھونڈتے ہیں۔

غبارِ غم کو دھونا چاہتا ہوں
میں تھوڑی دیر رونا چاہتا ہوں

منور ہاشمی کا اسلوب سادہ مگر معنیاتی نظم میں گندھا ہوا ہے وہ بنیادی طور پر فطرت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔

ہم کو تو موسموں نے تحائف دیئے یہی
اندر بلا کا حبس ہے باہر کڑی ہے دھوپ
تاریکیوں پہ اس کا بھی کچھ بس نہیں چلا
چہرہ چھپا کے رات بھر روتی رہی ہے دھوپ
میں جس طرف بھی جاؤں مرے ساتھ ساتھ ہے
میرے لیے تو اب مرا سایہ بنی ہے دھوپ

منور ہاشمی ہوا، بادل بارش، سورج، چاند ستارے اور دیگر مظاہر فطرت کو علامتی انداز میں بیان کرتے ہیں ان کی نظر میں مظاہرِ فطرت زندگی جینے والے جیتے جاگتے کردار ہیں ان سے وہ باتیں کرتے ہوئے بے صدا صدؤں کو اپنے لفظوں کے گھنگرو پہنا دیتے ہیں انھی بے صدا آوازوں سے وہ اپنے اندر کے سارے موسم جگا کر احساسات کی چوکھٹ پہ غزلوں کے پھول کھلا کر من آنگن کی کیاری مہکائے رکھتے ہیں۔ پھر ایسے میں کبھی دھوپ رازداں بن جاتی ہے تو کبھی چاند۔

چاند کی رعنائیوں میں راز یہ مستور ہے
خوب صورت ہے وہی جو دسترس سے دور ہے

ڈاکٹر منور ہاشمی کی جمالیاتی حس بہت تیز ہے وہ کائنات اور تخلیق کائنات کی کاریگری کو اپنے جمالیاتی مشاہدے سے اس طرح بیان کرتے ہیں۔

حسن کی تخلیق میں مصروف ہیں رب جہاں
اور شاعر حسن کی تعریف پر مامور ہے

منور ہاشمی کا فکری میلان اقبال کے ساتھ جڑا ہے وہ بھی خودی جنوں اور خرد کو متاع حیات جانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کا فلسفۂ زندگی سوچ اور فکر کے نئے راستے تراشتا ہے۔

اک طرف تیرا فریب آگہی اے زندگی
اک طرف اہل جنوں کی سرکشی اے زندگی

پھر زندگی اور موت کے درمیان خط تنسیخ کو اس انداز سے کھینچتے ہیں

موت خالی ہاتھ واپس ہو گئی در سے مرے
کام جو اس کا تھا وہ تو کر گئی اے زندگی

وہ زندگی کی چیرہ دستیوں کو کچلتے ہوئے تیز قدموں سے نئی منزل کی لگام تھامے آگے کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

میں بہت آگے بہت آگے نکل آیا مگر
تو بہت پیچھے بہت پیچھے رہی اے زندگی

اپنے عہد کو وقت کی رفتار کے ساتھ ملاتے ہوئے مداحوں کے علاوہ روشنیوں کے متلاشیوں کا ہجوم رکھتے ہیں وہ شجر سایہ بن کر دوسروں کی دھوپ کو اپنی تناور شاخوں میں سمیٹ لیتے ہیں۔وہ ہمہ وقت رہنمائی کے لیے موجود رہتے ہیں بالکل اپنے اس شعر کے مصداق:

جانے کس راہ سے آجائے وہ آنے والا
میں نے ہر سمت سے دیوار گرا رکھی ہے

شاعری ایک پیچیدہ عمل ہے اس کی تعمیر و تشکیل میں مختلف عناصر لطیف انداز میں ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں شاعر اپنے جمالیاتی احساس کو بروئے کار لاتے ہوئے بکھرے اور منتشر خیالوں کو اپنی قوت متخیلہ سے یکجا کرتے ہیں منور ہاشمی اپنی غزل میں ظاہری خدوخال کو اندرونی احساس کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ نئے اور انوکھے خیالات زبان و بیاں کے ساتھ ان کی شاعری میں جدید او رقدیم خیالات کا امتزاج ملتا ہے اُردو ادب کے وسیع مطالعے کی بنا پر وہ اُردو زبان و ادب کی روایت سے بخوبی واقف ہیں انھوں نے غزلوں میں تشبیہات، استعارات اور علائم و رموز کو بڑی چابک دستی سے استعمال کیا۔

ڈاکٹر منور ہاشمی: دنیائے ادب کا ایک دمکتا ستارہ

ڈاکٹر صنم شاکر

ڈاکٹر منور ہاشمی کا نام علمی و ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ اردو زبان و ادب کے ایک استاد، شاعر، محقق، کالم نگار اور صحافی کی حیثیت سے اُن کی اہمیت مسلمہ ہے۔ وہ بچپن ہی سے شعر و ادب کے ساتھ خصوصی شغف رکھتے ہیں۔ اوائلِ عمری میں ہی شعر و سخن کے ساتھ آپ کی وابستگی گھریلو ماحول کی مرہونِ منت ہے۔ علمی و ادبی محفلوں اور مشاعروں میں منور ہاشمی کی شرکت محفلوں کو پُر وقار بنا دیتی ہے۔ اپنے دھیمے مزاج، عاجزانہ طبیعت اور مشفقانہ رویے کی بنا پر ہر حلقے میں یکساں قدر و منزلت رکھتے ہیں۔

اُن کی شاعری کے مطالعے سے کئی جہتیں سامنے آتی ہیں۔ دراصل شاعری انسانی سوچ، مشاہدے، احساسات اور جذبوں کی ترجمان ہوتی ہے۔ یہ سوچ، مشاہدات، احساسات و جذبات جب الفاظ کا روپ دھارتے ہیں تو ان سے دوسرے نہ صرف لطف اُٹھاتے ہیں بلکہ اپنے دلوں کی آواز سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر منور ہاشمی نے غزل کے تقاضوں کو نیا رنگ دینے کی سعی کی اور اسے منفرد معنویت اور رمزیت سے روشناس کروایا۔ اُن کی غزلیں تغزل سے بھرپور ہیں۔ اُن کی غزل میں روائتی انداز کے ساتھ ساتھ جدتِ خیالی بھی پائی جاتی ہے۔ غمِ دوراں کی جھلک جا بجا اُن کی شاعری میں موجود ہے۔ اسی بنا پر انھوں نے روایت کو جدیدیت کے ساتھ ملا کر اپنی غزل کو انفرادیت بخشی۔

منور ہاشمی کی شاعری میں موضوعاتی تنوع اور فلسفیانہ فکر بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اُن کی شاعری میں اک نئے عہد کا اسلوب ابتدا ہی سے موجود رہا۔ انھوں نے عصری تقاضوں کو پہچانا اور اپنے شعری رویے کو اس سے ہم آہنگ رکھا۔ ان کی شاعری ذاتی زندگی کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے۔ منور ہاشمی نے اپنی غزل میں صوفیانہ مضامین اور جن تراکیب و لفظیات کو استعمال کیا ہے اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا مشاہدہ و تجربہ کافی وسیع ہے۔ اُن کی شاعرانہ طبیعت اور صوفیانہ فطرت اشعار میں یکجا ہوگئی ہے۔

دل اس کے رنگ و نور کے حلقے میں ہے اسیر
منظر جو میرے سامنے آیا نہیں ابھی

بلاشبہ انھوں نے اپنے کلام کے صوفیانہ مضامین کو وسیع مطالعہ اور عبادت و ریاضت سے خوب صورت لڑی میں پرو کر پیش کیا ہے۔ شاعر کو کائنات کی ہر شے وجد کی حالت میں نظر آتی ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں اللہ والوں کی اس کیفیت میں وہ جو بول دیتے ہیں وہ اللہ کے حضور مقبولیت کے درجے سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے غزل میں ہر قسم کے مضامین کو اپنایا۔ اُن کے کلام میں احساس کی نازک کیفیتیں ہیں اور ایک خاص قسم کی نغمگی و شیرینی پائی جاتی ہے۔

چونکہ شاعری انسانی جذبات و احساسات اور خیالات کے اظہار کا نام ہے اور یہی جذبات، احساسات اور خیالات انسان کی زندگی کے مختلف واقعات اور لمحات سے جڑے ہوتے ہیں۔ یہی یادیں انسان کا سرمایہ ہوتی ہیں۔

مجھے تو وقت نے گھاو ہی بخشے
کوئی لمحہ مرا مرہم نہیں ہے

وہ ایک لمحہ جو حاصل تھا زندگانی کا
وہ ایک لمحہ ترے واسطے بچایا تھا

شاعر نے عمدگی کے ساتھ اس شعر میں وقت اور لمحہ کا ذکر کیا۔ وہ ایک لمحہ جو کسی کے لیے بچا رکھا تھا وہ بھی وقت کے تیز بہاو میں بہہ گیا۔ شاعر حساس ہوتے ہیں۔ آج کا انسان اتنا مصروف ہے کہ اس کے پاس کسی کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا آج کے انسان کے پاس اپنے لیے بھی وقت نہیں ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وقت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ انسان کو اپنے اندر سمو دے گا اور پھر اس کا نشان بھی نہ رہے گا۔ محبت الوہی جذبہ ہے۔ اُن کی غزل حسن و جمال اور رومان سے بھرپور ہے۔ محبت کا موضوع اُن کے ہاں انفرادیت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔

عشق و جنوں کے باب میں مجھ کو کمال دے
اس کو خدا کچھ اور بھی حسن و جمال دے

وہ راہ میں ملا تو مجھے اس طرح لگا
خوشبو کا ایک قافلہ جیسے گزر گیا

اس شعر میں شاعر نے اپنے محبوب کے وصل کے لمحے کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا کہ وہ راستے میں چلتے ہوئے کہیں نظر آ گیا تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے خوشبووں کا ایک قافلہ اسی راستے سے گزرا ہو۔ یہ جذبات و احساسات ایک عاشق کے ہی ہو سکتے ہیں۔ منور ہاشمی کے ہاں محبوب کا تصور کوئی ماورائی اور تخیلاتی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بے قراری تڑپ اور اضطرابی کیفیات پائی جاتی ہیں۔

چاند کی رعنائیوں میں راز یہ مستور ہے
خوب صورت ہے وہی جو دسترس سے دور ہے
مجھ کو ہے منظور جبر ہجر بھی اس کے لیے
مجھ سے رہ کر دور بھی کوئی اگر مسرور ہے

ان اشعار میں شاعر ایک روایتی عاشق کی طرح محبوب کی خوشنودی کے لیے دنیا کا ہر ظلم و ستم اور دکھ برداشت

کرنے کے لیے تیار ہے۔ محبوب کے لیے ہجر کا درد سہنے کی سکت بھی رکھتا ہے۔ حساس طبیعت کے انسان پر غم وخوشی کی کیفیات کا اثر دوسروں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ معاشرے کا ظلم وستم اور غیر انسانی رویے یاسیت کو جنم دیتے ہیں۔ منور ہاشمی کی شاعری میں بھی جو قنوطیت اور یاسیت نظر آتی ہے وہ اسی معاشرے میں بسنے والے افراد کے غیر مساویانہ رویے کی دین ہیں۔ اسی بنا پر ایک خاموش احتجاجی صورت بھی ان کی شاعری میں جھلکتی ہے۔

دشت انا میں ہر طرف احساس کی ہے دھوپ
ہر پیکرِ خیال کو جھلسا رہی ہے دھوپ

ایسی حالت میرے شہر پہ طاری ہے
عید کے دن بھی بچے روتے پھرتے ہیں

ان اشعار کے بغور مطالعے سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ شاعر اپنے اردگرد کے ماحول پر کس قدر عمیق نگاہ رکھتے ہیں۔ آج کل کے سماج میں ناانصافیوں اور بدعنوانیوں کے ساتھ ان گنت کردار موجود ہیں۔ شاعر نے ان کرداروں سے متعلق اپنے جذبات و احساسات کا اظہار جا بجا اپنی شاعری میں کیا۔

اسی یقین پر ہر ظلم سہتے رہتے ہیں
کہ شاخِ صبر پہ اک دن ثمر بھی آئے گا

منور ہاشمی کے کلام میں گہرا مشاہدہ، قوتِ تخلیق، سماجی شعور، تہذیبی رکھ رکھاؤ اور تاریخی شعور کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ منور ہاشمی کی شاعری میں جہاں فکری حوالوں سے بہت سے موضوعات ملتے ہیں۔ وہیں پر ان کے کلام میں حمدیہ رنگ سے مزین اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔

باقی آثار ہیں بس قہر خدا کے ہر سو
کوئی طوفاں ہے نہ کشتی نہ کنارہ باقی

قبل ازل بھی جس کی نمود، بعد ابد بھی جو موجود
ایک منور رب رحمان، کل من علیہا فان

اُن کے کلام میں رجائی رنگ بھی واضح دکھائی دیتا ہے:

ہزار خواہش دنیا ہزار خوفِ زیاں
مری انا کا قدم پھر بھی ڈگمگایا نہیں

عکسِ امروز میں فردا کے نشان دیکھتا ہوں
اپنے ایامِ ضعیفی کا میں خود آسرا ہوں

انسان کے اندر خودی، حمیت، غیرت ہوتو وہ خودانحصاری پر ہی توقف کرتا ہے۔اس انداز کو بھی شاعر نے منفرد انداز سے پیش کیا۔

دلوں میں درد کا طوفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خودی حیات کا عنواں نہیں تو کچھ بھی نہیں

شاعری ایک سماجی عمل ہے جو زبان اور تخلیق کے حوالے سے براہِ راست فرد اور معاشرے کو متاثر کرتی ہے۔ زندگی متنوع اور تہہ در تہہ ہے منور ہاشمی کی شاعری میں زندگی کے کئی رنگ موجود ہیں۔ان کی غزلوں میں مفکرانہ مضامین، فلسفیانہ بصیرت، شکوہ اور حسنِ بیان کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔اُن کی شاعری میں فکر و اسلوب کے ساتھ حساسیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔اُن کی غزلوں میں ان کی فکر کے کئی رُخ اور کئی زاویے ہیں۔منور ہاشمی کی شاعری میں روایت کا شعور اور نئے طرزِ احساس کا ایک ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جس نے انہیں ہم عصر لکھنے والوں میں ممتاز کیا۔غزل کے پیرائے میں نئے گل کھلائے اور زندگی کو اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ شعر میں سمو دیا۔سہل ممتنع میں کہی گئی ان کی غزلیں بے ساختگی اور برجستگی کے ساتھ معنویت، گہرائی و گیرائی لیے ہیں۔ڈاکٹر منور ہاشمی جز وقتی نہیں بلکہ کل وقتی شاعر ہیں۔شاعری ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے۔

ان کی شاعری کی اساس ماضی ہے جس پر حال کے خوب صورت لمحوں کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔اُن کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے پر واضح ہوتا ہے کہ سادگی، سلاست، ایجاز و اختصار، سوز و گداز اُن کے کلام کی نمایاں خوبیاں ہیں۔

منور ہاشمی کی شاعری: ایک مطالعہ

پروفیسر ابرار خٹک

اپنی آواز کی صورت میں رہوں گا زندہ
میرے پرچم کو اڑائے گی ہوا میرے بعد

اس شعر کے خالق منور ہاشمی ہم عصر شعرا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ان کے ہاں غزل کی کلاسیکی روایت کا تسلسل بھی ملتا ہے اور نئی شناخت کے الگ اور منفرد رنگ و زاویے بھی۔شعر اور شعریت کا شعور رکھتے ہیں اور دونوں کے امتزاج سے غزل کی حسین عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ان کے ہاں بے ساختگی ،مصوری اور مرصع سازی کا عنصر نمایاں ہے،شعر کے دروبست کا تجربہ ہی نہیں رکھتے بلکہ اس سمندر کے کہنہ مشق شناور بھی نظر آتے ہیں۔

سب کی آواز میں آواز ملا رکھی ہے
اپنی پہچان مگر سب سے جدا رکھی ہے
جانے کس راہ سے آجائے وہ آنے والا
میں نے ہر سمت سے دیوار گرا رکھی ہے
اس نے مجھ سے بھی تری ساری کہانی کہہ دی
جس نے تجھ کو مری ہر بات سنا رکھی ہے

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے منور ہاشمی کی شاعری کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ کافی حد تک صائب ہے:

"وہ بڑی سنجیدگی سے فکر کے نظام اور آرٹ کے اہرام تعمیر کرتے ہیں۔اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے سوچنے کے نئے ڈھنگ اور اظہار کے نئے سانچے تلاش کیے ہیں۔"

شاید میری کٹیا کا پتا مجھ کو بتا دے
چھوڑ آیا ہوں نقشِ کفِ پا تیری گلی میں
یہ دائرہ قسمت کا ہے یا تیری گلی ہے
اک عمر چلا پھر بھی رہا تیری گلی میں
پہاڑوں کو کبھی روتا ہوا دیکھا نہیں لیکن
سمندر کا نمک آمیز پانی سب نے دیکھا ہے

منور ہاشمی کی شاعری میں سہل ممتنع کی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں،جس میں گنجلک مضامین ، سطحی جذباتیت و

رومانویت کا عنصر نہیں، نہ ہی وہ الفاظ اور مضامین کی محض حاضری لگواتے ہیں۔ان کے اشعار میں مطالعے، مشاہدے اور تجربے کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ان کی شاعری جن سرچشموں سے سیراب ہوئی ان میں گہرے تخلیقی شعور اور زندگی کی اندرونی کیفیات کا گہرا عکس نمایاں ہے۔۔غزل نازک رستوں کا سفر ہے اس پر فکری وفنی لوازم کی عمارت تعمیر کرنا آسان کام نہیں تاہم منور ہاشمی ماہر تخلیق کار کی طرح اپنی انفرادیت منوا کر رہتے ہیں۔

منور ہاشمی کے اشعار میں کبھی کبھی غلام عباس کے افسانوں جیسا ٹھہراؤ ملتا ہے،انھیں ختم کرنے کی جلدی نہیں ہوتی اور بیانیے میں تجسس اور لطافت کا عنصر آخر تک برقرار رہتا ہے۔معنی آفرینی اور حضوری کا احساس ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔وہ اظہار کے لیے شعریت مجروح نہیں کرتے،اکثر اشعار کی مثال آئینے جیسی ہے جس میں زندگی کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔

اس نے جو کچھ بھی کہا میں نے وہ سمجھا ہی نہیں
میں اسے دیکھ رہا تھا اسے سنتا کیسے

فیض کی زمیں میں طبع آزمائی کی ایک خوبصورت جھلک شاعرانہ خصوصیات کی عکاسی کرتا ہے:

کبھی تیرگی سے معاملہ کبھی روشنی سے مکاشفہ
کبھی اک چراغ جلا دیا کبھی اک چراغ بجھا دیا
یہ غزل ہے فیض کے فیض سے، کسی لفظ میں کسی شعر میں
کوئی بات ہو کہ نہ ہو مگر اسے حالِ دل تو سنا دیا

منور ہاشمی کلاسک اساتذہ کی طرح تخلص کا خوبصورت اور برمحل استعمال کرتے ہیں،جس سے فکری ومعنوی رنگ نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔

غزل کی تہذیبی اقدار کا نگہبان: ڈاکٹر منور ہاشمی

جنید آزر

اردو ادب کا تخت و تاج ازل سے غزل کے نام لکھا جا چکا ہے۔ اپنے آغاز سے لحہ موجود تک حکمرانی کا یہ سلسلہ زمانے کے نشیب و فراز دیکھتا چلا آ رہا ہے۔ اس سفر میں غزل نے کیسے کیسے دور دیکھے، یہ نقوش ادبی تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔ غزل روایت کے شاندار اہراموں کے کشادہ ایوانوں سے لے کر تنگ و تاریک غلام گردشوں کے پُراسرار فضاؤں کے سارے بھیدوں کی راز دار ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ لحہ موجود میں جدیدیت کی فلک بوس عمارات کی بنیادوں کی مضبوطی کا سہرا اسی روایت کے سر ہے۔ غزل کی تخلیق شاعر کے اندروں سے ہوتی ہے اور اس کے مظاہر بیرون میں منظر کشا ہوتے ہیں۔ غزل کل بھی پوری قوت کے ساتھ معراج ادب پر استادہ تھی اور آج بھی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ دامن غزل کشادہ سے کشادہ تر ہوتا جا رہا ہے۔ نئے تجربات اور فکری امکانات کے در کبھی بند نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ عشاق غزل کی تعداد ہر دور میں بڑھتی ہی رہی۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کا شعری سفر 80 کی دہائی سے لحہ کو محیط ہے۔ 2005ء تک پانچ مجموعے اہل علم و دانش سے داد وصول پا چکے ہیں۔ اردو ادب کی دیگر اصناف میں بھی انہوں نے اپنی فکری و فنی مہارت کے نقوش ثبت کیے ہیں مگر غزل پر ان کی خصوصی توجہ رہی۔ انہوں کی غزل کی زرخیز و توانا روایت سے اپنی غزل کی آبیاری کی اور اسے جذباتی صداقت سے پروان چڑھایا۔ انہوں نے نہ صرف روایت کے تناظر میں غزل کے مزاج کو سمجھا بلکہ اسے اپنے مزاج سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اس میں جدید عصری رویوں کی آمیزش بھی کمال مہارت سے کی۔

اُن سے ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں پھر ملتے ہیں
زندہ رہنے کا عمل ہم سے مسلسل نہ ہوا

یہ اور بات تیرے رو برو نہیں گذرا
میں جس عذاب سے گذرا ہوں تو نہیں گذرا

ان کے ہاں روایت تقلید کا عمل نہیں بلکہ وہ اس شجر سایہ دار سے نئی شاخیں اور پھر ان شاخوں سے نئی کونپلیں پھوٹنے کے منظر نامے پر یقین رکھنے والے کارواں میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا لہجہ اعتماد اور رجائیت سے بھرا ہوا ہے۔

یہ اس کا شہر ہے، اس کی مہک بتاتی ہے
ذرا تلاش کرو اس کا گھر بھی آئے گا

ابھی گلیاں نہیں بھولیں مرے قدموں کی آہٹ
مجھے اس شہر کے دیوار و در پہچانتے ہیں

فطرت کی وسعت ہے کتنی کون کہاں تک دیکھے گا
آنکھیں مر جاتی ہیں لیکن منظر زندہ رہتے ہیں

ان کے موضوعات اردگرد کی پھیلی ہوئی زندگی سے اخذ وقبول کرتے ہیں اور ان کے اظہار میں ڈھل کر نئی معنویت کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ تازہ کاری اور ندرت ان کے ہاں مسلسل آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔ ان کا بیشتر وقت خیالِ تازہ کی کھوج میں گزرتا ہے:

میں جس کے واسطے ملبوسِ حرف بنتا ہوں
وہ اِک خیال ابھی ذہن میں بھی آیا نہیں

ذہن پر نازل ہوا ہے پھر کوئی تازہ خیال
طائرِ فردوس جیسے زیرِ دام آیا کوئی

لائیں کہیں سے تازہ خیالات روز روز
تازہ غزل کسی کو سنانے کے واسطے
ترے خیال نے بخشی جلا مرے فن کو
ہر ایک شعر تری یاد کا صحیفہ ہے

دل اس کے رنگ و نور کے حلقے میں ہے اسیر
منظر جو میرے سامنے آیا نہیں ابھی

ان کی غزل کا استعاراتی، تشبیہاتی، لفظیاتی، اشاراتی اور تلازماتی نظام اپنے اندر جمال و کمال کی حساسیت لیے ہوئے ہے۔ ان کی فکر، خیالی بالیدگی، اظہار و بیان کی تازہ کاری، احساس کی شدت اور جذبے کا وفور ان کی غزل پر مضبوط گرفت کے عکاس ہیں۔ ان کی غزل کا اکتسابی فیضان صدیوں کی اس روایت سے جڑا ہوا ہے، جس میں متانت بھی ہے، وقار بھی، نفاست بھی، اور سنجیدگی بھی۔

اک صدی کی حیات مرتی ہے
تب کہیں فکرِ نو ابھرتی ہے

اترے گا کوئی مہر سکوں جس کی جبیں پر
وہ صبح بھی اترے گی کبھی روئے زمیں پر

خیال کی وسعت اور اس کی بیکرانی تک رسائی ہر شاعر کی اپنی تخلیقی استطاعت پر منحصر ہے۔ خیال کی اڑان افلاک سے آگے کی دنیاؤں میں محوِ سفر رہتی ہے۔ منور ہاشمی کا مشاہدہ باریک بینی پر استوار ہے وہ زندگی کی تصویر کے دونوں رخ دیکھنے کے ساتھ ساتھ اسے اطراف سے دیکھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں زندگی کے نامعلوم اور نادیدہ مناظر بھی جھلکتے نظر آتے ہیں۔ اس زندگی کی بھیڑ چال میں سفر کرتے ہوئے بھی اپنے لیے الگ رستوں کا انتخاب کیا ہے۔ اس کا اظہار اس کے ہاں بڑی وضاحت سے نظر آتا ہے۔

دشت کے درمیاں کھڑا ہوں میں
کس کو آواز دے رہا ہوں میں
اپنے حالات سے نہیں واقف
ساری دنیا سے آشنا ہوں میں

جس پر اساس رکھتا میں اپنی حیات کی
لمحہ وہی گرفت میں آیا نہیں ابھی

نہ کوئی رخ نہ زاویہ ہماری سوچ کو ملا
ہماری سوچ گھر گئی ہے دائروں کے درمیاں

ان کی شخصیت کا قلندرانہ رنگ ان کی شاعری میں بھی موجزن ہے۔ دھیما لہجہ بات میں اثر پیدا کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزل صوفیانہ مزاج کی حامل ہے۔ ان کے ہاں بلند آہنگ روئیے نہیں دکھائی دیتے بلکہ ایک تہذیب اور شائستگی ہے جو غزل کی تاثیر کو گہرا کرتی محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے لفظیات کی شعبدہ بازی دکھائی اور نہ ہی خیال کو ابہام کی موجوں میں بہنے دیا۔ انہوں نے اپنی طبع کی جولانیوں کو منہ زور گھوڑے کی طرح دوڑانے کے بجائے اسے تہذیبی رؤیوں کے زیر اثر رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ شعرا کے ہجوم میں الگ دکھائی دیتے ہیں اور ان کا انفرادی طرزِ احساس اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ ان کے ہاں خیال کی رَو ہردم تازہ جزیروں میں سفر کرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ جزیرے سرسبز بھی ہیں، ثمر بار بھی اور روشن بھی۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کی شعری بصیرت

حمیرا جمیل

شاعری محض لفظوں کو سلیقے سے برتنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں نادیدہ جذبات واحساسات کی پیش کش بھی ہوتی ہے۔شاعر محض ایک نقال نہیں ہوتا کہ وہ مصور کی طرح چیزوں اور مناظر کو ہو بہو پیش کردے بلکہ وہ دیکھی ہوئی چیزوں میں اپنے جذبات واحساسات کو شامل کر کے اسے نئی معنویت عطا کرتا ہے۔گویا فقط فن شاعری ہی شاعری کا موجب نہیں، بلکہ وہ جذبات جو شاعر کو شعر کہنے پر مجبور کریں شاعری کا اہم ترین جزو ہیں،بہترین شاعری بہترین خیالات وافکار کی عکاسی کرتی ہے،باکمال شاعر حالات وواقعات کا عکاس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کی شاعری بھی عصر حاضر کے حالات و واقعات میں ڈھلے جذبات کی ترجمان ہے اور اُس معاشرے اور ماحول کی عکاس ہے جس سے براہ راست وہ نبرد آزما ہیں۔آپ کے اشعار ایسے ہی معانی کے حامل ہیں''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'' یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب شدید جذبات عظیم خیالات کے سائے میں پر تاثیر زبان کی مدد سے وجود میں آتے ہیں تو معتبر شاعری ظہور میں آتی ہے۔ڈاکٹر منور ہاشمی کے ادبی شہ پاروں کو فطری اور طبعی قوانین،انسانی سیرت وکردار کی عظمت کے اصولوں،حکمت ودانش سے بھرپور فلسفیانہ اور نفسیاتی حقیقتوں اور صداقتوں کے زیر اثر جانچیں تو یہ امر اظہر من الشمس ہو جاتا ہے کہ آپ کا شہ پارہ ایسی عظمت سے ہم کنار ہے جو ارفعیت (sublimity) سے مالا مال ہے۔کیوں کہ آپ کے نزدیک عظمتِ خیال،شدید اور قوی جذباتی تاثر اور پروقار زبان ارفعیت کے بنیادی منابع ہیں۔آپ اپنے جذبات کی پیش کش میں اتنی مہارت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ ذاتی جذبات کو آفاقی قدروں کے ساتھ ملا کر اُسے ارفع واعلیٰ بنا دیتے ہیں اور ایک عظیم شاعر کا کمال بھی یہی ہوتا ہے۔۔۔۔

مشکل زمینوں میں آسان غزل کہنا،آسان زمینوں میں مشکل غزل کا نمودار ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔یہ تو شاعر کے مزاج کا بانکپن ہے۔وہ حیران کرنا چاہتا ہے،چونکانے پر اکتفا کرتا ہے یا پھر سنجیدگی اور انہماک سے کائنات میں پھیلے ہوئے اسرار ورموز کی پراسراریت کو واضح کرتا ہوا،تجربوں،مشاہدوں کی شدت کے ساتھ حکمت ودانش کی سطح پر تخلیقی ماورائی لہروں کی دھنک کو شاعرانہ خوش سلیقگی کا حصہ بناتا ہے۔یہ اظہار فن کی کرشمہ سازی کا آئینہ ہے جس میں ابھرنے والے عکس کو تصویر کرنا آسان نہیں۔یہ آسانی میسر آجائے تو شاعری کا ایک نیا جہان وجود میں آتا ہے جہاں شاعر کی انفرادیت کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔۔۔۔۔ڈاکٹر منور ہاشمی ایک خوبصورت اور ذہین شاعر ہیں۔اُسے عکس کو تصویر کرنا آتا ہے۔یہی نہیں بلکہ اس نے آواز کی تصویر کشی کا ہنر بھی سیکھا ہے اور اب تو وہ وجدان کی چہرہ شناسی کے عمل سے گزر رہا ہے۔اس نے بہت سے نئے اور خوبصورت اشعار کے چراغ غزل کی منڈیروں پر رکھ دیئے ہیں جس سے ہماری شاعری کا

آنگن جگمگا رہا ہے۔ڈاکٹر منور ہاشمی کے اشعار پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت کے ساتھ عصری سچائیوں کو بھی شعری پیرائے میں بیان کرنے پر مکمل قدرت رکھتا ہے۔

سب دشمنوں کو دوست بنانے کے واسطے
لازم ہے سب منافقوں کو مسترد کریں

شہر کی تاراجیوں کا جشن ہے برپا کہاں
بانٹتا پھرتا ہے ہر کوئی بتاشے دشت میں

محبتوں میں بھی لازم ہے اعتدال کا رنگ
خلوص حد سے بڑھا جب تو لوگ ڈر بھی گئے

''سوچ کا صحرا'' ڈاکٹر منور ہاشمی کے تخلیقی عمل کا شاہکار ہے۔ان کی شاعری میں خوابوں کا لامتناہی سلسلہ موجود ہے اور یہ کیفیت اس کے غزلیہ کلام میں موجود ہے۔ڈاکٹر منور ہاشمی کے دوسرے شعری مجموعہ ''کرب آگہی'' میں بلند پروازی اور تخلیقی سچائی کا بھرپور عکس ملتا ہے۔ڈاکٹر منور ہاشمی کے ہاں ایک سلیقہ ٹھہراؤ اور جدت نمایاں ہے۔ان کے ہاں کسی بھی جذبے یا مشاہدے کو غور و فکر کی بھٹی میں اچھی طرح پکا کر موزوں وقت پر سپرد قرطاس کرنے کا عمل واضح دکھائی دیتا ہے۔ڈاکٹر منور ہاشمی کے ہاں ایک جذباتی وفور موجود ہے جو بلاشبہ شاعر کا زادِ سفر ہوا کرتا ہے، یہ منفرد اور دلکش بھی ہے اور ہماری تہذیب اور روایت سے مضبوطی سے جڑا ہوا بھی ہے۔ان کی شاعری میں نعرہ بازی کا نشان تک نہیں۔

''بے ساختہ'' کی شاعری سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ڈاکٹر منور ہاشمی نے اپنی روح کی سرگوشی کو سن لیا ہے۔اور وہ روح،جسم اور کائنات کے باہمی ربط کی کھوج میں مصروف ہوں۔''نیند پوری نہ ہوئی'' میں شاعر موصوف نے غزل کے فن اور ہیئت کے اصول و قوانین نہ صرف نبھائے ہیں بلکہ ان کی غزلوں میں بھرپور شعریت،ہم آہنگی اور بلند خیالی بھی موجود ہے۔شاعر کی جدت پسندی ہر شعر،ہر لفظ کے ساتھ ساتھ گویا چھلکتی ہے۔بقول افتخار عارف:

> ''غزل کہنے والوں کی بھیڑ میں کم چہرے ایسے ہیں جو پہچان میں آتے ہیں اور وہ تو بہت ہی کم ہیں جو اس کی گزراں منظر میں اپنے لیے کوئی مستقل جگہ بنا پاتے ہیں۔منور ہاشمی کی شاعری میں اس کی جذباتی زندگی کے ساتھ ساتھ عصری شعور کی جھلک قدم بہ قدم چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔۔۔۔''

''لوح بھی تو قلم بھی تو'' میں ڈاکٹر منور ہاشمی کا نعتیہ کلام شامل ہے جنہیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک سچے عاشق رسولؐ ہیں۔آپ کا شمار ان نعت گو شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے نعت کو بحسن و خوبی اصلاح حال کے لیے استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی خوش اخلاق، خوش باش، ملنسار، شفیق اور باکمال انسان ہیں۔ محنت، جفاکشی اور بلند حوصلگی آپ کی شخصیت کے نمایاں ترین پہلو ہیں۔ انتہائی دھیمے مزاج کے حامل ہیں۔ وہ دھیما مزاج جو فیض رساں شخصیت کا خاصہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر کوئی آپ سے عزت آمیز محبت کرتا ہے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کے شعری موضوعات کا کینوس خاصا وسیع ہے۔ ''عشق حقیقی، حب رسولؐ، عشق مجازی، غم جاناں، غم دوراں، اُمید پسندی اور رجائیت، حسن محبوب، جمالیاتی پہلو، شعریت و ادبیت، لہجے کا دھیما پن، تصور انسان، بے باکانہ انداز، حالات کی عکاسی، موسیقیت اور غنائیت، بھوک اور افلاس، امن و آشتی کی خواہش، استحصالی قوتوں کے خلاف جنگ، رنج والم کا بیان، حب وطن، ایمائیت، سچے جذبات کی ترجمانی، اجتماعی شعور، زندگی میں جدوجہد، انسانی زندگی کی ترجمانی، آفاقیت، حقیقت نگاری، شکایت زمانہ، یادِ ماضی، نیرنگی خیال، بے ساختگی، فلسفہ زندگی، مشاہدہ، لفظی تصویر، مشیت ایزدی، معاشرتی جبر اور گھٹن، روایت اور جدت کا امتزاج'' جیسے موضوعات آپ کی شاعری کا احاطہ کرتے ہیں۔ آپ کی شاعری ایک طرف جذبات کی فراوانی کے باوصف متانت، سنجیدگی اور معانی آفریں کی مانند ہے تو دوسری طرف آپ کی شخصیت کا پرتو بھی ہے۔ انتخاب الفاظ، تراکیب، تشبیہات و استعارات میں اکثر جدت و خوش آہنگی کے ساتھ ساتھ واضح معنویت بھی موجود ہے:

چاند پر جا کے منوّر ہمیں احساس ہوا
ہم اسے کہتے رہے رشکِ قمر ایسے ہی

ڈاکٹر منور ہاشمی نے اپنے اسلوب سے شاعری کو ایک نئی تاثیر عطا کی۔ انہوں نے پامال زمینوں کا استعمال نہیں کیا بلکہ سادہ انداز میں ایسی گہری باتیں لکھی ہیں کہ قاری دنگ رہ جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار میں دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ یہی ایک بڑے شاعر کی خوبی ہے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزلوں میں عصری رویوں کا جائزہ

راج محمد آفریدی

ڈاکٹر منور ہاشمی کا شمار اردو ادب کے اُن مایہ ناز ادیبوں میں ہوتا ہے جن کی خدمات کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کیا گیا۔انہوں نے اپنی زندگی ادب کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی ہے۔اس حوالے سے وہ ایک بھرپور ادبی زندگی گزار رہے ہیں۔ان کی ادبی خدمات بالخصوص غزل گوئی کی پذیرائی ملک سے باہر بھی ہو رہی ہے۔ملک کے مختلف اداروں میں ادبی خدمات سرانجام دیتے ہوئے آج کل ڈاکٹر منور ہاشمی ناردرن یونی ورسٹی نوشہرہ میں ڈین فیکلٹی سوشل سائنسز و آرٹس اور اردو کے پروفیسر کے طور پر ادب میں نئی پود کی نشو ونما کر رہے ہیں۔ڈاکٹر منور ہاشمی کے مطابق ادب زندگی کے ساتھ چلتا تو ہے مگر زندگی کے مطابق بدلتا نہیں۔ان کے مطابق ادب ہی زندگی میں تبدیلیاں لاتا ہے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی غزل کے شاعر ہیں۔غزل زمانہ قدیم سے شاعری میں عظمت کا تاج پہنے آ رہی ہے کیونکہ اس کے پیروکاروں میں بڑے بڑے نام شامل ہیں۔غزل اس لیے ابھی تک پوری آب و تاب کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے کہ اس کے پیچھے ولیؔ، میرؔ، دردؔ، غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، آتشؔ، مصحفیؔ کی تخلیقی صلاحیتیں کارفرما ہیں۔غزل کی خوش بختی کہ دورِ جدید میں جہاں ہر کوئی مادہ پرستی کا شکار ہو چکا ہے، لوگ ادب سے دور بھاگے جا رہے ہیں مگر غزل کی معنویت و اصلیت کو برقرار رکھنے کے لیے نئے شعرا نے کمر کس لی ہے۔ان میں اقبالؔ، احمد ندیمؔ قاسمی، فیضؔ، ناصرؔ کاظمی، ساحرؔ لدھیانوی، احمد فرازؔ، شہزادؔ احمد اور جدید ترین شعرا میں قتیلؔ شفائی، محسنؔ احسان، ڈاکٹر منورؔ ہاشمی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

۲۱ ویں صدی جہاں ٹیکنالوجی کی صدی ہے، اردو ادب میں یہ بھی غزل کی صدی ہے۔مختلف نظموں پر تجربات کے باوجود غزل کی بادشاہت و مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔آج بھی غزل سے محبت کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔جس طرح کے تجربات نظموں میں ہوئے، اسی طرح غزل میں بھی موضوعات کے لحاظ کافی تجربے ہوئے۔

ترقی پسند تحریک نے مغرب سے آنے والے سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشی تصورات نے ہندوستان کے ادیبوں کو ہر حوالے سے متاثر کیا۔ان ادبا نے اپنے فن پاروں میں آزادی، انصاف کے حصول، ظالمانہ رسوم کے خلاف آواز

بلند کر کے معاشرے کی فرسودہ روایات سے چھٹکارا دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔انہوں نے ادب میں تخیل کے بجائے حقیقت بیانی پر زور دیا۔ادب کی دوسری اصناف کی طرح اس تحریک کی بدولت غزل میں بھی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔جس کی وجہ سے آج کی غزل محبوب کا سراپا بیان کرنے والی غزل نہیں رہی۔بلکہ آج کی غزل میں مختلف سماجی ،سیاسی ،معاشی ،موجودہ عالمی مسائل کا تذکرہ ،دہشت گردی ،خوف کا بیاں ،انتہا پسندی کے موضوعات شامل ہو گئے ہیں۔

آج دنیا کو جن بڑے مسائل کا سامنا ہے ،ڈاکٹر منور ہاشمی نے انہی عصری مسائل و موضوعات کو اپنی غزل میں بیان کر کے آج کے انسان کو درپیش مسائل پر تشویش کا اظہار کر کے روشنی ڈالی ہے۔ان کی شاعری میں کلاسیکیت کا رنگ اور میرؔ و غالبؔ کی پیروی موجود ہے۔انہوں نے اقبالؔ کی تعلیمات پر عمل کر کے عصری اور قومی تقاضوں کو بھی ترغیبی انداز میں بیان کیا ہے۔راقم الحروف نے ڈاکٹر منور ہاشمی کی شاعری میں مختلف عصری رجحانات جن میں سماجی ،معاشی ،سیاسی ،مشترکہ خوف کا مختصر جائزہ لیا ہے اور ان کی شاعری سے ان اشعار کا انتخاب کیا ہے جن میں مذکورہ حالات نمایاں ہیں۔

ڈاکٹر منور ہاشمی نے اپنی ابتدائی غزلوں ہی سے معاشرے کو سچ کا سبق دیا۔ان کی شاعری ''سچ کڑوا ہوتا ہے'' کے قول پر پورا اترتی ہے۔وہ انسان کو جھوٹی تسلیاں نہیں دیتے بلکہ اس کے سامنے حقیقت بیان کرتے ہیں۔وہ داد کے طلب گار نہیں۔وہ زندگی کی تلخیوں کو الفاظ کے لبادے میں اوڑھ کر کچھ یوں پیش کرتے ہیں:

چھاؤں کی خواہشیں ،دھوپ کی سازشیں ،جسم جلتے رہیں
ایک صحرائے بے آب میں گھومنا، زندگی ہے یہی
موت کے خوف سے جیتے جی مر چلیں ،کام کوئی نہ ہو
حوصلے چھوڑنا ، سوچ میں ڈوبنا ، زندگی ہے یہی
لحہ لحہ اذیت میں گزرے اگر پھر بھی زندہ رہو
کوئی شکوہ شکایت نہ ہو دیکھنا ، زندگی ہے یہی

زندگی کی ناہمواریوں اور تلخیوں کو بیان کرتے ہوئے مزید ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ:

میں سر کہاں چھپاؤں گا اس تیز دھوپ میں
وہ موم کا مکان تو کب کا پگھل گیا

روٹی ،کپڑا ،مکان آج کے انسان کی بنیادی ضرورتیں ہیں۔معاشی ناہمواری کے خلاف مختلف طبقہ فکر نے آواز بلند کی ہے۔ڈاکٹر منور ہاشمی نے معاشی ناانصافی ،حالات کی مجبوری کا ذکر اس پیرائے میں کچھ یوں کیا ہے۔

اپنی سوچوں کے مطابق کچھ بھی کر سکتا نہیں
آدمی حالات کے ہاتھوں بہت مجبور ہے

یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ مکمل ذات صرف خدا کی ہے۔ انسان ہمیشہ نامکمل رہا ہے۔ اس حوالے سے انسان کو زندگی کے مختلف مراحل میں ناکامی و محرومی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر منور ہاشمی بھی اپنی ناکامیوں، محرومیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

حسرتیں، ناکامیاں ، مایوسیاں ، محرومیاں
بے دلی ، بے چارگی ، افسردگی ، اے زندگی

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کسی حال میں بھی خوش نہیں رہتا مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے خواب مکمل ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ وہ ہمیشہ عصری ہنگاموں میں پھنس کر اپنی خواہشات کو ساحل تک پہنچانے میں ناکامی کا سامنا کرتے ہیں۔

مادہ پرستی کی وجہ سے دنیا میں انسان دوستی کے آثار کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی حوالے سے ڈاکٹر منور ہاشمی مایوسی اور خوف کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ دنیا انسانیت سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد کو بھولنے لگے ہیں۔ ان کے دلوں سے احساسِ ترحم نکلتا جا رہا ہے۔ مادہ پرستی کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر منور ہاشمی ایک خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

پھیلا ہوا ہے چار سُو جنگل حیات کا
مل جائیں ایک دو بھی جو انسان ہیں بہت

معاشی عدم استحکامی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر حیران ہے کہ پروردگار نے ہمارے سروں پر اتنے بڑے بوجھ رکھے ہیں جن کی برداشت کرنے کی ہم میں طاقت نہیں کیونکہ ہم کمزور و لاچار ہیں اور ایسے مصائب اٹھانے کی سکت نہیں رکھتے۔ تڑپتے دل اور بے چین ذہنیت کے ساتھ اس کیفیت کا اظہار اپنی شاعری میں کچھ یوں کرتے ہیں:

سر پہ بارِ فلک اٹھائے ہیں
گو نحیف و نزار ہیں ہم لوگ

ڈاکٹر منور ہاشمی سماجی پہلوؤں اور تلخ رویوں کی عکاسی غزل میں کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے لہجے میں ہمیں تلخی محسوس ہوتی ہے۔ وہ ایک جدت پسند شاعر ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے بقول "منور ہاشمی روایت پرست شاعر نہیں ہے۔" ان خوبیوں سمیت صاف گوئی موصوف کی بڑی خوبی ہے۔ کسی کو مخاطب کرتے ہوئے وہ بات کو گھما کر پیش کرنے والوں میں سے نہیں۔ اس حوالے سے ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

شر آدمی کے ساتھ ہے وابستہ اس قدر
شامل یہ لفظ جس قدر لفظِ بشر میں ہے

منوّر دوست ہیں مجھ سے گریزاں
مرے ہاتھوں میں جب سے آئینہ ہے

ڈاکٹر منور ہاشمی نے علامہ اقبال کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔اس مد میں ان کی شاعری میں بھی اقبال جیسا ترغیبی انداز ہے۔وہ قارئین کو جینے کا سبق دیتے ہیں۔اسی طرح وہ ڈر اور خوف میں گزرنے والی زندگی پر مرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہو:

ایسے لوگوں کا مرجانا جینے سے بھی بہتر ہے
وہ جو لوگ منوّر سب سے ڈر کر زندہ رہتے ہیں

ہمارے معاشرے میں بہت سی برائیوں میں دغا،فریب اور جھوٹ سرفہرست ہے۔چاپلوسی،خوشامد اور دوسروں کو خوش کر کے اچھائی کی سند حاصل کرنا عام وطیرہ ہے۔اس کے ساتھ منافقت اختیار کر کے صاحبانِ عالیشان سے رفعتیں پانا معمول کی بات ہے۔ان تلخ حقائق کو ڈاکٹر منور ہاشمی نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

ہم صداقت کے علمبردار ہیں لیکن یہاں
جھوٹ جو کہتا رہا وہ شخص اچھا رہ گیا

ڈاکٹر منور ہاشمی کی شاعری میں خارجیت سے زیادہ داخلیت پر توجہ دی گئی ہے۔وہ سراپا بیان نہیں کرتے بلکہ اندرونی کیفیات کا نقشہ آسان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔ڈاکٹر منور ہاشمی انسان کی محرومیوں کا ذکر جگہ جگہ کرتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہو:

تمام رات مجھے زندگی مناتی رہی
میں اپنے آپ سے اتنا کبھی نہ روٹھا تھا

ڈاکٹر منور ہاشمی نے افلاس وغربت کے پامال مناظر میں زندگی کی ایسی حقیقی تصویریں پیش کی ہیں جو حیات کے کربناک المیوں سے مزین ہیں۔وہ عام لوگوں کی تکالیف سے واقف ہیں اس لیے ان کے دکھ درد کو سب کے سامنے لا کر انسان کے معاشی مسائل کو جگہ جگہ بیان کیا ہے۔

زمانہ کس لیے نظریں جمائے بیٹھا ہے
ہمارے پاس لٹانے کو کچھ رہا ہی نہیں

بقول پروفیسر فارغ بخاری ''ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزل کا نمایاں وصف اس کی عوامی سوچ ہے۔'' عوامی سوچ سمیت ڈاکٹر صاحب عوام کا درد رکھنے والا دل رکھتے ہیں۔اصل میں وہ ایک ایسے معاشرے میں سانس لینے پر مجبور ہیں جہاں ایک طرف غربت وافلاس،بھوک پیاس اور پیٹ کی آگ بجھانے میں غریب اور مزدور طبقہ خون پسینہ ایک کر رہا ہے۔اتنی محنت

کے بعد بھی وہ بنیادی سہولیات سے محروم ہے۔ایسے حالات کو دیکھ کر ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔

گھر کا احساس نہ تھا اپنے ہی گھر میں مجھ کو
ایک دیوار تو تھی سایہ دیوار نہ تھا

ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزلوں میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔انہوں نے کسی ایک خاص موضوع کو نہیں اپنایا۔اس حوالے سے ہم ان کو ایک خاص تحریک سے نہیں جوڑ سکتے۔وہ اپنی شاعری کے ذریعے ترپتی، سسکتی اور مختلف سماجی مسائل میں گھرے عوام کی آواز بن کر خدمت کی خاطر اس میدان میں آئے ہیں۔ان کی شاعری عوامی مسائل کا ایوان بالا تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔وہ اپنے خیالات،افکار اور سوچ کو نئی پود میں منتقل کرنے کی اپنی بھرپور سعی کر رہے ہیں۔مختصراً ایک جدید لہجے اور نئے اسلوب کے ساتھ ڈاکٹر منور ہاشمی پاکستان میں انفرادیت کا حامل شاعر ہے۔جس کے فن و شاعری کا ستارہ درخشاں ہے۔

منور ہاشمی کا تصورِ حیات

(غزل کے حوالے سے)

اورنگزیب

کائنات کا ذرہ ذرہ انسان کے عمیق مشاہدے کا طلب گار ہے تاکہ وہ اپنے عقل وفہم سے کام لے کر اس کے رازوں سے پردہ اٹھا سکے۔ان رازوں میں سے کئی ایسے راز ہیں جن سے مشیتِ ایزدی نے خود ہی پردہ اٹھادیا ہے لیکن کچھ کے لیے فکر وتدبر کی ضرورت پڑتی ہے۔انسان کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ان گتھیوں کو سلجھانا پڑتا ہے کیونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے دوسری مخلوقات کے بدلے میں عقل وشعور کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کے ذریعے ان کا حل تلاش کرتا ہے تاہم تمام انسان اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ کائنات کا عمیق مشاہدہ کرسکیں اور اپنی شعوری صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر بنی نوع انسان کی رہنمائی کرسکیں۔ان میں سے کچھ افراد اس قابل ہوتے ہیں جو ان رازوں کو سمجھ سکیں۔شعراء کا شمار بھی ان افراد میں ہوتا ہے۔

شعراء میں غور وفکر کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتا ہے۔ان کی قوتِ مشاہدہ وسیع ہوتی ہے۔جس کی بدولت وہ ہر عقدے پر غور کرتے ہیں اور انسانیت کی رہنمائی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔اردو شاعری کی روایت میں ایسے متعدد شعراء ہیں جنھوں نے کائنات کے اسرار ورموز سے انسانیت کو آگاہ کیا ہے۔سید الطاف حسین اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ہماری آرزوؤں کا منتہیٰ اور ہماری کوششوں کی غرض وغایت سب کی سب باتیں ایک رازِ سربستہ ہیں۔جس کی ''عقدہ کشائی'' میں عقل وخرد کے ناخن متعدد بار ناکام رہ چکے ہیں۔ہر ایک شخص نے اپنے اپنے خیال کے مطابق اس معمے کا کوئی نہ کوئی حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ہر ایک نے زندگی کے پیچ در پیچ مسائل کو مختلف الخیال فلاسفہ کے ظنون واوہام کی بازی گاہ تصور کرنا چاہا۔عام آدمی خوش قسمتی یا بد قسمتی سے اس قابل نہیں کہ اسرارِ حیات کا ادراک کرسکیں لہٰذا فطرت گاہے ایسا دیدہ ور پیدا کردیتی ہے۔جو اس کے اشاروں کو سمجھ سکے اور اس کے رموز سے آشنا ہو کر اور لوگوں کو بھی ہدایت دے۔''(۱)

اردو شاعری کی روایت میں منور ہاشمی بھی ایک بڑا نام ہیں۔منور ہاشمی نے اپنی شاعری کی بدولت اردو ادب میں اپنا مقام اور مرتبہ بنایا ہے۔انھوں نے اردو شاعری کے چراغ کو اپنے فکر وفن سے چراغاں کیا ہے۔انھیں قدرت نے فکر وتدبر کی نعمت سے نوازا ہے۔وہ اپنے گردوپیش کا عمیق مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کو اپنے فکر کی بھٹی میں تپا کر شعر کے روپ میں ڈھالتے ہیں۔

منور ہاشمی نے اپنے عقل وفہم اور پختہ شعور کی بدولت زندگانی کی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔انسان زندگی میں کئی مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرتا ہے۔ہر فرد اپنی اہلیت کے مطابق ان سے نبرد آزما ہوتا ہے۔زندگی بنیادی طور پر نام ہی اسی

کا ہے کہ انسان مصائب کا مقابلہ کرے اور اپنے لیے نئی منزلیں تلاش کرے۔منور ہاشمی بھی زندگی کو ایک مشکل سفر سمجھتے ہیں۔ جہاں قدم قدم پر ظلم و جبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔حادثات سے دو چار ہونا پڑتا ہے لیکن اس میں کامیاب وہی ہوتا ہے جو ان تکالیف کو برداشت کرے اور مایوس نہ ہو۔کیونکہ زندگی ایک حال میں نہیں رہتی بلکہ ہر دم ہر لحظہ ایک نئے امتحان سے گزارتی ہے۔منور ہاشمی نے اس خیال کو اس انداز میں بیان کیا ہے:

حادثوں سے رہے آمنا سامنا زندگی ہے یہی
موت کے کھیل میں جان کر ہارنا، زندگی ہے یہی
لمحہ لمحہ اذیت بھی گزرے اگر، پھر بھی زندہ رہو
کوئی شکوہ شکایت نہ ہو دیکھنا، زندگی ہے یہی (۲)

منور ہاشمی کے مطابق مشکلات کا ڈٹ کر سامنا کرنا اور زندگی کی امید کو قائم رکھنا ہی اصل زندگی ہے۔ یہ دنیا عیش و عشرت اور آرام کے لیے نہیں ہے۔سرسری نگاہ ڈالنے والے تو اس کی ظاہری چمک اور نمود پر فریب کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس دنیا میں غرق ہو کر اپنے اصل مقصد کو فراموش کر دیتے ہیں لیکن اہل علم اور پختہ شعور رکھنے والے اس کی اصل حقیقت سے آشنا ہیں۔وہ دنیا کی ظاہری چمک دمک پر فریب کا شکار نہیں ہوتے۔انھیں اس بات کا یقین ہے کہ دنیا کی حقیقت کچھ اور ہے اس لیے اس پر فریفتہ نہیں ہوتے بلکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ دنیا ابدی نہیں ہے، فانی ہے۔اس دنیا میں انسان کو اپنی بقا کے لیے سخت محنت اور مشقت کرنا پڑتی ہے۔دنیا کے ظاہر و باطن میں فرق ہے۔اس خیال کو منور ہاشمی نے اس انداز میں بیان کیا ہے:

جیسی باہر سے چمکدار ، حسیں ہے دنیا
ویسی اندر سے ذرا سی بھی نہیں ہے دنیا
یہ نہ سمجھو کہ مرے ساتھ بہت اچھی ہے
دوست دنیا میں کسی کی بھی نہیں ہے دنیا (۳)

منور ہاشمی زندگی کی حقیقت آشکار کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آیا بلکہ اسے اس دنیا میں کچھ محدود وقت کے بھیجا گیا ہے اور اس کے بعد اس حقیقی زندگی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔وہ بیان کرتے ہیں کہ اس دنیا میں جتنے بھی لوگ آئے ہیں۔انھوں نے کتنی ہی شہرت، طاقت یا سلطنت حاصل کی مگر سب کچھ حاصل کرنے کے باوجود بھی وہ اس دنیا میں بقا حاصل نہیں کر سکے۔یہاں سکندر جیسے لوگوں کو بھی بقا حاصل نہیں ہے:

خود کو جو بھی سمجھیں لوگ، لیکن یاد یہ رکھیں لوگ
میر ، سکندر اور سلطان، کُلُّ مَن علیھا فان (۴)

منور ہاشمی نے ان لوگوں کی مثال سے اس بات کو واضح کیا ہے کہ جب ان جیسی ہستیاں اس دنیا سے مٹ گئی ہیں

پھر تو انسان کی ذات کچھ بھی نہیں ہے۔ اس لیے اسے دنیا میں رہ کر اس حقیقت سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ اسے اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ اس دنیا میں اس کا وجود صرف ایک لحظہ میں ختم ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس کی ذات کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے عجز و انکسار کے ذات اس حقیقت کو قبول کر کے اپنی اصلیت سے باخبر رہنا چاہیے:

تیری میری کیا ہے ذات، تیری میری کیا اوقات
تیری میری کیا پہچان کُلّ مَن علیہا فان (۵)

اس حوالے سے پروفیسر خیال آفاقی لکھتے ہیں:

''فرمان الٰہی ہے کل نفس ذائقۃ الموت؛ ''ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔'' یہ ایک حقیقت ہے جس سے نہ انکار ممکن ہے اور نہ ہی فرار کی گنجائش ہے۔'' (۶)

منور ہاشمی انسان کی زندگی کو فریب قرار دیتے ہیں کہ انسان کی زندگی بلبلے کی مانند ہے جس کا وجود تھوڑی دیر کے لیے قائم رہتا ہے اور اس کے بعد اس نے ختم ہو جانا ہوتا ہے یہی حال انسان کا ہے۔ اس نے بھی اس دنیا میں کچھ وقت گزارنا ہے۔ جس طرح بلبلہ تھوڑی دیر کے لیے نمودار ہوتا ہے اسی طرح دنیا میں انسان کچھ وقت کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کے لیے آیا ہے۔ اس کے بعد اسے اپنے خالق حقیقی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں مہمان کی طرح ہے جس طرح ایک مہمان کچھ وقت کے لیے کہیں جاتا ہے۔ ویسے ہی انسان بھی کچھ وقت کے لیے عارضی طور پر اس دنیا میں بھیجا گیا ہے:

ہستی اپنی ایک سراب، جیسے دریا بیچ حباب
پل دو پل کی ہے مہمان، کُلّ مَن علیہا فان (۷)

انسان کی زندگی سفر کی مانند ہے جس طرح سفر ایک منزل تک پہنچنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی اس دنیا سے رخصت ہونے کے لیے زندگی کا سفر اختیار کرتا ہے۔ منور ہاشمی زندگی کی منزل موت کو قرار دیتے ہیں۔ انسان کے دنیا میں آنے کے اس سفر کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس سفر کا انجام اور اس کی اصل منزل موت ہے:

گر سفر ہے زندگی تو اس کی منزل موت ہے
غرقِ دریا جو ہوئے ان کو کنارا مل گیا (۸)

منور ہاشمی نے سادہ الفاظ میں بڑی شائستگی سے انسان پر نہ صرف زندگانی بلکہ اس کی ذات کی حقیقت کو ظاہر کیا ہے کہ انسان کو دنیا میں کسی خوش فہمی یا فریب میں نہیں پڑنا چاہیے۔ اسے دنیا کی ظاہری چمک دمک پر فدا نہیں ہونا چاہیے بلکہ حقیقی زندگی کے لیے سامان کرنا چاہیے۔ اسے دنیا میں اپنی تخلیق کا مقصد سمجھ کر ایک بامقصد زندگی بسر کرنی چاہیے۔

حوالہ جات

۱۔ الطاف حسین، سید، ترجمانِ حقیقت، مشمولہ ''راوی'' ۱۵۰ سالہ جشن نمبر، جی سی یونیورسٹی، لاہور ۲۰۱۳ء، ص ۱۳

۲۔ منور ہاشمی، ڈاکٹر، غزل اے غزل، دنیائے اردو پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۴۷

۳۔ منور ہاشمی، ڈاکٹر، غزل اے غزل، دنیائے اردو پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۵۱

۴۔ منور ہاشمی، ڈاکٹر، غزل اے غزل، دنیائے اردو پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۰۹

۵۔ منور ہاشمی، ڈاکٹر، غزل اے غزل، دنیائے اردو پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۰۹

۶۔ خیال آفاقی، پروفیسر، ''زندہ رود'' اقبال کا فلسفۂ حیات و موت، مشمولہ: اذانِ اقبال، جہان حمد پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۱۴

۷۔ منور ہاشمی، ڈاکٹر، غزل اے غزل، دنیائے اردو پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۱۰

۸۔ منور ہاشمی، ڈاکٹر، غزل اے غزل، دنیائے اردو پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۲۱۷

پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کی شاعری کا اجمالی جائزہ

نوید ملک

پرندے جس طرف جائیں پلٹ آتے ہیں شب کو
وہ اپنا آشیاں ، اپنا شجر پہچانتے ہیں

اس خوب صورت شعر کے خالق پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کا نام اس عہد کے اُن ممتاز شعرا کی فہرست میں شامل ہے جنھوں نے ادب کے لیے کئی راستے ہموار کیے اور جدید رجحانات کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ کی شخصیت تصنع سے پاک ہے۔ اقبال فہم ہونے کی وجہ سے نظریات کے ساتھ ان کے اسلوب میں جست بھرنے والا رجحان ہے۔ ایک شعر کے آئینے میں ہمیں وہ تمام نقوش ملتے ہیں جن کا انسلاک ان کے اسلوب سے ہے:

حصولِ زر کا جو موقع کبھی ملا مجھ کو
گنوا دیا ہے اسے کر کے شاعری میں نے

معلم، نباض، ہوتا ہے اسے طلباء کی نفسیات میں چھپے تمام جواہر اور پتھر نظر آتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے قلم کے سامنے کئی نسلوں کی نفسیات کی افزائش ہوئی۔ اسی لیے انھوں نے بدلتی قدروں کی مصوری کرتے ہوئے بھی حسن کو منہدم ہونے نہیں دیا اور جمالیاتی سطح پر شعری عناصر کو برقرار رکھتے ہوئے تخلیقی اثاثوں کو تحفظ فراہم کیا۔ دائیں بازو اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے اذہان کے پیدا کردہ موضوعات پر مزید موضوعات کو پروان چڑھانے کے بجائے ڈاکٹر صاحب نے ''ایجاد'' کا لائحہ عمل اپنایا اور کہا:

زمانہ لاکھ ہماری مخالفت میں رہا
جو کام کرنا تھا ہم کو وہ کام کر بھی گئے

فکری اور فنی سطح پر آپ کی شاعری اور موضوعات کے دائرے بہت وسیع ہیں۔

منور ہاشمی کی شاعری کا فنی جائزہ

حافظ حیات

ہر فرد ایک جداگانہ انداز گفتگو کا حامل ہوتا ہے۔ ہر فرد اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے ایک ڈھب اختیار کرتا ہے جو اس کی انفرادیت کی نشاندہی کرتا ہے اسی طرح ہر ادیب اور شاعر ایک خاص طریقہ اختیار کرتا ہے جو اس کا اسلوب کہلاتا ہے۔ اسلوب انگریزی لفظ سٹائل کے مماثل ہو گیا ہے۔ سٹائل کا اطلاق نظم و نثر دونوں پر ہوتا ہے جب کہ اُردو میں شاعرانہ طرز بیان اور نثری طرز بیان کہہ کر امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کی گئی یعنی سٹائل ذہنی دنیا میں موجود خیال و معنی کو دنیا کے باسیوں میں منتقل کرنے کا قرینہ جو بذاتِ خود ایک جداگانہ حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ اسلوب دراصل فکر و معانی اور ہیئت، ساخت یا قافیہ و پیکر کے حسین امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ سید عابد علی عابد اسلوب کی تعریف کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"اسلوب سے مراد لکھنے والے کی وہ انفرادی طرز نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے ممیز ہو جاتا ہے۔"

اسلوب کو فکری صفات کی بنا پر تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ سادگی ۲۔ قطعیت ۳۔ اختصار

اگر بات سیدھی سادھی اور معمولی ہو تو اس کے لیے الفاظ متعلق اور تراکیب پیچیدہ استعمال کی جائیں اس طرح تحریر میں سادگی پیدا ہوتی ہے۔ سادگی کے مقابلے میں قطعیت اسلوب کی وہ صفت ہے جس میں فکر کے رشتے پیچیدہ اور جذبے کے پہلو دقیق ہوتے ہیں۔ ان کی آمیزش طبعاً ایسے الفاظ کا تقاضا کرتی ہے جو چاہے مشکل ہوں، پیچیدہ ہوں، لیکن وضاحت مطلب کے اعتبار سے وہ کسی طرح سادگی سے کم نہ ہو۔ اختصار میں بات جامع اور مختصر ہوتی ہے۔ بلا ضرورت طویل نہیں کیا جاتا۔ اختصار کا بیان مشکل نہیں ہوتا۔

منور ہاشمی کی شاعری جہاں فکری حوالوں سے ہمالہ کی چوٹیوں کی مانند بلند ہے اور وہ شاہین اقبال کی مانند بلند پروازی کے قائل ہیں۔ آپ کی شاعری میں مقصدیت اور روایت کی پاسداری کے ساتھ جدت اور اچھوتا پن بھی نظر آتا ہے۔ آپ کی شاعری میں فکری حوالوں سے کوئی بھی ایسا حوالہ نہیں جس سے کوئی عامیانہ بات کا پہلو نکلتا ہو۔ منور ہاشمی کی شاعری جہاں فکری حوالوں سے اپنی مثال آپ ہے۔ اسی طرح فنی حوالوں سے بھی منفرد مقام رکھتے ہیں۔ آپ صاحب اسلوب شاعر ہیں اور منفرد اسلوب کی وجہ سے غزل گوئی میں نمایاں مقام و حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ کی شاعری میں بہترین اسلوب پایا جاتا ہے جس میں نہایت سادگی، قطعیت کے ساتھ ساتھ اختصار بھی موجود ہے۔ ایک خاص انداز ایک خاص شخص سے منسوب ہو کر اس کا اسلوب بنتا ہے۔ شاعری کی مشکلات، اسلوب، فنی کمالات کے حوالے سے خواجہ حیدر علی آتش کہتے ہیں:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

شاعر کو اس لیے شاعر کہا جاتا ہے کہ اُس کا شعور عام لوگوں کی نسبت زیادہ بیدار ہوتا ہے اور وہ ان امور کا علم اور شعور رکھتا ہے جو عام انسان نہیں رکھتا اسی وجہ سے شعر کو عموماً شعور کے مترادف سمجھا جاتا ہے اور اس اعتبار سے شاعر کا لفظی معنی ''صاحب علم و ادراک'' یا ''صاحب شعور'' بنتا ہے۔ منور ہاشمی کی شاعری کی فنی خوبیوں کا ذکر درج ذیل عنوانات کے تحت کیا جاتا ہے:

تشبیہ:

کسی بھی ادب پارے میں کسی شے کا ذکر اور پھر مشترک خصوصیات کی بنا پر دوسری شے جیسا قرار دینا تشبیہ کہلاتا ہے۔ منور ہاشمی ایک صاحب کمال شاعر ہے ان کی شاعری میں تشبیہ کی بہت سی مثالیں ہیں لیکن ہم چند مثالیں ہی بطور مثال پیش کریں گے۔ ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

صحرا کی طرح خشک میرے لب ہیں منوّر
ہے اس کے نگر پیار کی برسات کہیں اور

اس شعر میں لبوں کو صحرا کی خشکیوں سے تشبیہ دی گئی۔ اس میں ''لب'' مشبہ، ''صحرا'' مشبہ بہ اور وجہ مشترک ''خشکی'' پیاس ہے۔ حرف تشبیہ'' کی طرح'' کا استعمال اس شعر میں ہوا ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

جانے والا جا چکا تھا اور میری آنکھ میں
اک ستارہ سا لرزتا ، جھلملاتا رہ گیا

اس شعر میں آنکھ کی چمک کو ستارے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں آنکھ ''مشبہ'' اور ستارہ ''مشبہ بہ'' ہے۔ وجہ مشترک ''چمک'' ہے۔ حرف تشبیہ ''سا'' کا استعمال ہوا ہے۔ شعری مفہوم میں شاعر نے محبوب کے جانے کے بعد دلی حالات کا تذکرہ کیا ہے کہ اس کے جانے کے بعد آنکھ میں آنسو ایسے چمک رہے تھے کہ جیسے کوئی ستارہ ہو جو جھلملاتا رہ گیا ہو۔ شاعر نے آنسوؤں کو ستاروں کی چمک سے تشبیہ بھی اس لیے دی ہوگی کہ یہ آنسو بہت قیمتی ہے کہ یہ محبوب کے ہجر میں بہہ رہے ہیں تو اس لیے ان کو ستاروں کی چمک سے تشبیہ دیتے ہیں، ایک اور شعر دیکھیے:

صورت شمع پگھلتا رہوں لمحہ لمحہ
میں منور ہوں اندھیرا نہیں چھانے دیتا

اس شعر میں منور ہاشمی نے خود کو شمع سے تشبیہ دی ہے۔ اس شعر میں ''خود کی ذات'' مشبہ اور ''شمع'' مشبہ بہ ہے۔

وجہ مشترک ''پگھلنا'' اور ''صورت'' حرف تشبیہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ شعری مفہوم میں منور ہاشمی ایک خواہش تمنا کا اظہار کرتے ہیں کہ میں شمع کی طرح روشن ہو جاؤں اور میرے روشن ہونے سے اندھیرا ختم ہو جائے گا۔ منور ہاشمی چونکہ اقبالیات میں پی ایچ ڈی ہیں اور علامہ اقبال کے افکار و نظریات کے شارح کے طور پر جانے جاتے ہیں آپ نے اقبال کی شاعری کے بعض حوالوں کو اپنے انداز سے نسل نو کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک شعر مزید دیکھیے:

مثالِ نور منوّر بکھر گیا ہر سو
وہ ایک چاند تھا اور آسماں سے اترا تھا

اس شعر میں منور ہاشمی نے تخلص کو بطور ''مشبہ'' استعمال کیا ہے اور چاند کو ''مشبہ بہٖ'' کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وجہ مشترک ''نور''، ''چاندنی'' ہے۔ حرف تشبیہ ''مثال'' کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایک اور شعر دیکھیے:

اہلِ نظر کی موت ہے اک انجمن کی موت
گویا شجر کی موت ہے پورے چمن کی موت

اس شعر میں فنی طور پر منور ہاشمی نے اہل نظر اور شجر کو بیک وقت بطور ''مشبہ'' استعمال کیا۔ انجمن اور چمن دونوں کو ''مشبہ بہٖ کے طور پر استعمال کیا۔ وجہ مشبہ ''موت'' ہے اور ''گویا'' کا لفظ بطور ''حرف تشبیہ'' استعمال ہوا۔ شعری مفہوم میں اہل نظر سے مراد، صاحب درد آدمی جو دوسروں کا احساس کرتا ہے۔ خیر خواہی کا جذبہ رکھتا ہو، انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتا ہو دوسرے معنوں میں ہمارے صوفیاء، اولیاء جو کبھی انسانیت کی خدمت کے لیے ہمہ تن مصروف رہتے ہیں اکثر ایسے افراد میں سے جب کسی کی وفات ہوتی ہے تو پوری انجمن کی موت ہوتی ہے۔ منور ہاشمی نے ان کو شجر کی چھاؤں سے تشبیہ دی ہے کہ لوگ گرمی کے ستائے ہوئے جس طرح دھوپ سے بچنے کے لیے شجر کی چھاؤں کا سہارا لیتے ہیں۔ اسی طرح صوفیاء بھی اپنے فیض سے لوگوں کو فیض یاب کرتے ہیں اور جب ایسی کوئی شخصیت اس دنیا سے پردہ فرماتی ہے تو شاعر نے کہا کہ جیسے پورے چمن کی موت ہو جاتی ہے۔

تلمیح:

تلمیح کے حوالے سے ادبی اصطلاحات میں پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں:

''کلام میں کوئی ایسا لفظ یا مرکب استعمال کرنا جو کسی تاریخی، مذہبی یا معاشرتی واقعے کی طرف اشارہ کرے، تلمیح کہلاتا ہے۔''

منور ہاشمی تاریخی واقعات پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ کچھ واقعات تاریخ کے اوراق پر ہمیشہ روشن رہتے ہیں کہ کوئی بھی شاعر، ادیب ان سے آنکھ نہیں چرا سکتا۔ ایسا ہی واقعہ، کربلا کی سرزمین پر ہوا تھا جب امام عالی مقامؑ اپنے جانثاروں کے ساتھ معرکۂ حق و باطل کے لیے میدان میں اُترے تھے۔ منور ہاشمی نے اس واقعے کے اسرار و رموز کو، سبق کو، خلاصے کو، دو

مصرعوں میں سمودیا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوزے میں دریا کو بند کرنا۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

ظلم کے سیلِ خوں میں اک دن ظالم بھی بہہ جاتا ہے
لشکر مر جاتا ہے اور بہتر زندہ رہتے ہیں

مندرجہ بالا شعر میں منور ہاشمی نے ''بہتر زندہ'' اور ''لشکر مر جاتے ہیں'' کے الفاظ سے اس تاریخی واقعے کو قارئین کے ذہنوں میں تازہ کر دیا ہے اور ان کو اس واقعے کے اسرار و رموز سمجھ آنے لگ جاتے ہیں اور شعر ملاحظہ کیجیے:

خود کو جو بھی سمجھیں لوگ ، لیکن یاد یہ رکھیں لوگ
میر، سکندر اور سلطان، کل من علیہا فان

اس شعر میں منور ہاشمی نے مختلف کرداروں کے نام لے کر شعر میں استعمال کیا ہے۔ ان میں ایک کردار ''سکندر'' کا ہے جو تاریخ میں ایک طاقتور ترین بادشاہ گزرا ہے جو تاریخ کے اوراق پر ''سکندر اعظم'' کے نام سے جانا جاتا ہے جس نے پوری دنیا پر قبضے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا مگر وہ آدھی سے زائد دنیا فتح کر سکا تھا اور پھر جوانی کے عالم میں اس کی زندگی وفا نہ کر سکی۔ ایک اور کردار ''سلطان'' ہے ویسے تو یہ لفظ بادشاہوں کے لیے بھی مستعمل ہے اور اس سے مراد سلطان صلاح الدین ایوبی، سلطان نورالدین زنگی جیسی مقدس اور بہادر ہستیاں ہیں۔ ایک اور شعر دیکھیے:

نئے جہان کا سقراط مر نہیں سکتا
اسی یقیں سے ہر زہر مجھ کو پینا ہے

جہاں منور ہاشمی نے اس شعر میں تاریخ کے اس کردار پر روشنی ڈالی ہے جس کو حق بات لکھنے کے عوض زہر کے جام سے نوازا گیا۔ سقراط نے ریاست کے خلاف کلمہ حق لکھا تو اسی کے شاگرد، افلاطون نے جو کہ حکومت میں شامل تھا بہت کوشش کی کہ سقراط کہہ دے کہ مجھ سے یہ جھوٹ لکھا گیا یا جب میں نے لکھا تھا میرا ذہنی توازن ٹھیک نہیں تھا بلکہ اُس نے اپنے استاد کو بچانے کے لیے یہ نظریہ بھی دیا کہ شاعر جب شاعری کرتا ہے تو وہ ابنارمل حالت میں ہوتا ہے اور شاعری نارمل حالت میں لکھی بھی نہیں جا سکتی۔ اس بحث کا آغاز ہوا اور پھر افلاطون کے شاگرد بقراط نے اس کا جواب دیا اور یہ بحث آج تک ادب ایوانوں میں چلتی ہے۔ اس شعر میں صرف ایک لفظ ''سقراط'' سے یہ پوری کہانی قاری کے ذہن میں یاد آ جاتی ہے۔

استعارہ:

منصف خان سحاب، استعارہ کی تعریف کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''استعارہ کے لغوی معنی ادھار لینا اور اصلاح میں جب کوئی لفظ اپنے حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہو اور حقیقی اور مجازی میں تشبیہ کا تعلق موجود ہو تو اُسے استعارہ کہتے ہیں۔''

منور ہاشمی کی شاعری صنعت استعارہ سے بھی مزین ہے۔آپ نے استعارات کا استعمال بڑے فن کے ساتھ کیا ہے۔چند شعری مثالیں پیش ہیں، ملاحظہ کیجیے:

میں شاخ نخلِ تمنا وفا کے جنگل میں

ہوائے درد میں بروقت لہلہاتا ہوں

اس شعر میں منور ہاشمی نے ''شاخ نخل تمنا'' کا استعارہ استعمال کیا ہے۔انھوں نے خود کو ایک نخل کی شاخ قرار دے کر جنگل میں ہوائے درد میں یعنی ہر مشکل کی گھڑی،مصیبت میں اس کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرنے کے لیے میں لہلہاتا ہوں یعنی اپنی جگہ پرڈٹا ہوا ہوں۔ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

اُس نے جانے کس طرح دیکھا مجھے

میں جہاں بیٹھا تھا پتھر ہو گیا

اس شعر میں رومان و جمالیات کے ساتھ منور ہاشمی نے محبوب کی ذات میں محویت کی بات کی ہے اور خود کو پتھر مستعار لیا کہ محبوب نے مجھے نجانے کس انداز حجابانہ سے دیکھا کہ جہاں تھا وہیں پتھر ہو گیا۔ مجھے دنیا و مافیہا ہر چیز کی کوئی فکر نہ رہی۔فنافی الذات المحبوب کا تصور اور عاشق ہونے کا حق ادا کیا گیا۔ایک اور شعر دیکھیے:

ساری رات گرائے میری آنکھوں نے

میرے دامن میں سے موتی بکھرے ہیں

اس شعر میں منور ہاشمی نے آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کو موتی قرار دیا ہے۔یعنی شاعر ہجر محبوب میں آنکھوں سے آنسو بہا رہے ہیں۔تو وہ آنسو اس لیے قیمتی ہیں کہ وہ ہجر محبوب میں بہائے جا رہے ہیں اور اُن کو اب قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا ہے اس لیے شاعر نے ان کو موتی قرار دیا ہے۔

صنعت تضاد:

پروفیسر انور جمال صنعت تضاد کے بارے لکھتے ہیں:

''(شعری صنعت ہے) جب کلام میں ایسے الفاظ لائے جائیں جو معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہوں اور مقابلی ہوں۔''

منور ہاشمی کی شاعری صنعت تضاد سے بھی آراستہ ہے ان کے کلام سے چند اشعار بطور مثال پیش ہیں:

اب صورتِ حال نہاں ہے نہ عیاں ہے

یہ کون سی منزل ہے پڑاؤ یہ کہاں ہے

اس شعر میں لفظ ''نہاں'' جس کے معنی پوشیدہ کے ہیں۔اس کے برعکس لفظ ''عیاں'' جو ظاہر ہونے کے معنوں

میں استعمال ہوتا ہے۔ پہلے مصرعے میں ہی دو الفاظ ایسے استعمال کیے گئے جو لفظی معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے مقابل اور شعر ملاحظہ کیجیے:

جو اُس نے اپنے گھر کا بتایا ہے راستہ
آنے کے واسطے ہے نہ جانے کے واسطہ

اس شعر میں ''آنے'' اور ''جانے'' کا ذکر ہے جو معنوی لحاظ سے ایک دوسرے سے مخالف ہیں۔ مزید شعر دیکھیے:

کس کے انجام پہ میں صبح کا آغاز کروں
کون سے لمحے کو میں رات کہوں، سوچتا ہوں

اس شعر میں منور ہاشمی نے لفظ ''صبح'' اور ''رات'' کا استعمال کیا جو کہ ایک دوسرے کی ضد ہے اور لفظ متضاد ہیں۔
اسی غزل کا ایک اور شعر دیکھیے جس میں بھی تضاد موجود ہے:

رات کو دن کے الم میں اوڑھ کے سو جاتا ہوں
دن کو میں رات کے خوابوں کی گرہ کھولتا ہوں

اس شعر میں منور ہاشمی نے فنی پختگی کا اظہار کرتے ہوئے ''رات کو دن'' پہلے مصرعے میں اور ''دن کو رات'' دوسرے مصرعے میں استعمال کیا۔ دن اور رات کا استعمال دو بار ہوا جو کہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔

صنعت سیاقتہ الاعداد:

عارف حسن خان لکھتے ہیں:

''یعنی کلام میں ذکر کرنا عددوں کا خواہ ایک سے دس اور اس سے زیادہ تک خواہ برعکس اس کے ایک اور عدد خواہ ترتیب دار ہوں یا بے ترتیب۔''

منور ہاشمی نے اپنی شاعری میں اس صنعت کا بھی استعمال کیا ہے۔ ان کے کلام سے چند اشعار بطور مثال پیش خدمت ہیں:

ہوتی اگر امید مہ چار دہم کی
اِک جشن ستاروں کا سرِ شام نہ ہوتا

اس شعر میں منور ہاشمی نے لفظ ''چار'' جو عدد ہے اُس کا ذکر کیا ہے۔ صنعت سیاقتہ الاعداد سے مزین ایک اور شعر ملاحظہ کریں:

دیپ روشن ہوں ہزاروں رات پھر بھی رات ہے
لاکھ تاریکی ہو پھر بھی دن بھلا ہے رات سے

اس شعر میں منور ہاشمی نے ''ہزاروں'' اور ''لاکھ'' کے الفاظ کا ذکر کیا ہے۔اس صنعت سے آراستہ ایک اور شعر دیکھیے:

ہمیں سکون کی دو ساعتیں ہی مل جائیں
نہ دن کا ہے یہ ارادہ نہ شب کی مرضی ہے

صنعت مراعات النظیر :

مولانا سعید الدین مخزن بلاغت میں لکھتے ہیں:

''کلام میں چند ایسے معنے جمع کیے جائیں جن میں تضاد نہ ہو بلکہ باہم کسی قسم مناسبت ہو اور وہ ایک ہی سلسلے کی چیزیں ہوں۔''

کلامِ ہاشمی سے صنعت مراعات النظیر کی چند مثالیں پیش ہیں:

ہم چھوڑ کے سب اپنے قبیلے چلے آئے
ہیں پیڑ کہیں اور تو پھل پات کہیں اور

اس شعر میں پیڑ کی نسبت سے ''پھل اور پتوں'' کا ذکر کیا گیا۔ایک اور شعر ملاحظہ کریں:

میرے ذہن کے آنگن میں جو اترے خواب
آج بھی ان کے ریزے آنکھ میں چبھتے ہیں

اس ''ذہن کے آنگن'' کی نسبت سے ''خواب'' اور ''آنکھ'' مراعات النظیر ہیں۔ ایک اور شعر سے ملاحظہ کریں:

جنگل میں کرتے ہیں چھوٹے چھوٹے پودے شور
جب سے سارے قد آور اشجار ہوئے خاموش

اس مثال میں ''جنگل'' کی نسبت سے ''پودے'' اور ''اشجار'' کا ذکر کیا گیا۔اور شعر دیکھیے:

تیری دید کو ترسیں میرے آنگن کے مرجھائے پھول
پیلی پڑتی بیلیں ، رنگ بدلتا سبزہ یاد کرے
میری سوچوں کی صورت ہیں بکھری بکھری سب چیزیں
تجھ کو بے رونق سا اجڑا اجڑا کمرہ یاد کرے

پہلے شعر میں ''آنگن'' کی نسبت سے ''پیلی پڑتی بیلیں'' اور پھر ''رنگ بدلتا سبزہ'' دوسرے شعر میں ''بکھری بکھری سب چیزیں'' کی نسبت سے ''بے رونق سا اجڑا اجڑا کمرہ'' مراعات النظیر ہے۔

صنعتِ تکرار لفظی:

کلام میں الفاظ کی تکرار کی صنعت کو صنعتِ تکرار کہتے ہیں۔ایک لفظ کا بار بار آنا تکرار کہلاتا ہے۔کلامِ ہاشمی میں

صنعت تکرار لفظی سے مزین اشعار کافی ہیں ہم یہاں صرف چند اشعار بطور مثال پیش کریں گے۔

دل اپنا تھا افسردہ و پژمردہ و مردہ
اک زیست کا جذبہ ترے پیغام سے آیا

اس شعر میں لفظ ''مردہ'' کی دو بار تکرار ہے اگر ''دہ'' کو دیکھا جائے تو اس کی تین بار تکرار موجود ہے۔مزید شعر ملاحظہ کریں:

اس کی نظر کا رنگ نظر میں ملا لیا
اپنی نظر سے خود کو گرانے کے واسطے

اس شعر میں لفظ ''نظر'' کی تین بار تکرار موجود ہے۔ایک اور شعر دیکھیے:

چاند کو دیکھ کے گنگناتا رہا ، چاند چپ ہی رہا
جانے کیا کیا اُسے میں سناتا رہا، چاند چپ ہی رہا

اس شعر میں ''رہا'' کے لفظ کی تکرار چار بار ہوئی۔لفظ ''کیا'' کی دو بار تکرار ہے۔''چاند چپ ہی'' کی تکرار بھی دو بار ہوئی۔ایک اور شعر دیکھیے:

اپنی کہاں کہاں نہ کمند نظر گئی
ہر قریہ بام بام تجھے ڈھونڈتے رہے

اس شعر میں لفظ ''کہاں'' کی تکرار دو بار ہوئی اور لفظ ''بام'' کی تکرار بھی دو بار ہوئی ہے۔صنعت تکرار لفظی کے حوالے سے ایک آخری شعر بھی ملاحظہ کیجیے:

کہاں کہاں سے وہ گزرا ، کہاں کہاں ٹھہرا
ہمارے پاس خبر آتی جاتی رہتی ہے

اس شعر میں ''کہاں'' کے لفظ کی چار بار تکرار موجود ہے۔

صنعت ذوقافتین:

ذوقافیہ یا ذوقافتین سے مراد کلام میں دو قافیوں کا لانا ہے۔لغت میں ''ذو'' کے معنی ''دو'' اور ''ذوقافتین'' کے معنی دو قوافی والے کے ہیں۔

کلامِ منور ہاشمی سے صنعت ذوالقوافی سے مزین شعر ملاحظہ کریں:

اہلِ نظر کی موت ہے اک انجمن کی موت
گویا شجر کی موت ہے پورے چمن کی موت

اس شعر ''نظر'' اور ''شجر'' بطور قوافی اور ''انجمن'' اور ''چمن'' بطور قوافی ایک ہی شعر میں استعمال ہوئے ہیں۔

شاعرانہ تعلی:

اس سے مراد ہے کہ شاعر اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرے۔ اپنے بڑے پن کا مظاہرہ کرے۔ لغت کے مطابق ''تعلی'' کا مطلب درج ذیل ہے: ''شیخی، اپنی بڑائی بیان کرنا۔''

منور ہاشمی نے شاعرانہ تعلی کا استعمال بھی کیا ہے ان کے کئی اشعار میں وہ اپنے حق میں مبالغہ کرتے ہیں اسی حوالے سے کلامِ ہاشمی سے چند اشعار بطور مثال پیش ہیں:

میں تو خود اک پیڑ گھنا ہوں یہ کیسے ہے ممکن
چھوٹے موٹے پودوں کے میں سائے میں دب جاؤں

ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے جو اسی غزل کا مقطع ہے:

میرے نام کا ''نون'' منور اصل میں ایک معما
لاکھوں شرحوں میں اُبھروں اک نکتے میں دب جاؤں

مندرجہ بالا دونوں اشعار میں منور ہاشمی نے شاعرانہ تعلی کا استعمال کیا اسی حوالے سے ایک اور شعر دیکھیں:

اک ستارہ ہے منور بہ جبینِ فن پر
کیسے ممکن ہے میرا نام مٹایا جائے

اس شعر میں منور ہاشمی نے خود کو جبینِ فن کا ستارہ قرار دیا ہے۔

صنعت تجسیم:

پروفیسر انور جمال ادبی اصطلاحات میں صنعت تجسیم کے بارے رقم طراز ہیں:

''غیر مرئی حقائق، جبلات یا عادات وغیرہ کو حرکی، مادی جسم میں ڈھال کر پیش کرنا تجسیم (Personification) کہلاتا ہے۔ زندگی، موت، نفرت، غصہ، شوق، خوف، خوشی، غم وغیرہ کو جسمانی اور محسوس انسانی افعال وخصوصیات سے متصف کرنا تجسیم ہے۔''

اردو ادب میں بہت سے شعرا نے اس صنعت کا استعمال کیا ہے۔ حضرت اقبال کی شاعری اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔ آپ کی مشہور نظمیں بھی اس صنعت سے متصف ہیں۔ کلامِ اقبال سے پہلے چند مثالیں پیش ہیں تاکہ صنعت کا صحیح مفہوم واضح ہو سکے:

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے

کلامِ اقبال کی صرف ایک مثال دیکھیے جو بالِ جبریل سے نظم ''پرواز'' سے ہے:

کہا درخت نے اک روز مرغِ صحرا سے
ستم یہ غم کدہ رنگ و بو کی ہے بنیاد

علامہ اقبال نے ان اشعار میں غیر مجسم، غیر انسانی چیزوں کو انسانی صفات سے مزین کر کے ان سے مکالماتی انداز میں بات کروائی ہے۔ اسی طرح اقبال کی دیگر نظمیں، حسن و عشق، عقل و عشق وغیرہ مشہور ہیں۔

منور ہاشمی نے بھی اسی صنعت میں اپنے فن کا اظہار بڑی پختگی کے ساتھ کیا ہے۔ وہ کسی طرح سے اپنے معیارِ فن سے نیچے نہیں آتے۔ ان کے کلام سے شعر ملاحظہ کیجیے:

ایک جانب ہے حرم اور اک طرف سب کچھ حرام
جانے کیا کیا شاہی مسجد کا منارا سوچتا ہے

اس شعر میں منور ہاشمی نے شاہی مسجد کے مینارے کو ایک انسانی صفت، سوچنے کی حس دے کر اور اس سے مشاہدہ بھی کروایا ہے کہ شاہی مسجد کے حرم میں خدا کی مخلوق اپنے خالق کے حضور سجدہ ریز ہوتی ہے اور مینار کی دوسری جانب بازارِ حسن ہے جہاں لوگ اپنی ہوس کی تسکین کرتے ہیں اور مجبور، لاچار عورتیں اپنی غیرت و حمیت اور خواہشات کا خون کرتی اور لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ شریعت کی رو سے یہ کام حرام ہے۔ اب اس شعر میں شاعر نے مینار کو سوچنے اور دیکھنے کی انسانی خوبیوں سے لبریز کیا ہے۔ یہ بھی تجسیم کی بہترین مثال ہے۔

منفرد ردیفوں کا استعمال:

منور ہاشمی نے غزلوں میں سنگلاخ زمینوں اور منفرد ردیفوں کے تجربات سے غزل کو ایک نیا پیرہن دیا۔ ان کی غزلوں میں یہ چیز بھی حیرت افزا ہے کہ یہ سنگلاخ زمینوں کا استعمال بھی کرتے ہیں اور اپنی غزل میں عصرِ حاضر کے مسائل پر اشعار بھی کہتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں سے چند اشعار ایک ہی غزل سے بطور مثال پیشِ خدمت ہے۔ کلامِ ہاشمی سے اسی حوالے سے چند اشعار ملاحظہ کریں:

بڑھتا جاتا ہے بہت کارِ جہاں روز بروز
گھٹتی جاتی ہے مگر عمرِ رواں روز بروز

ایسا ملبوس یقیں ہم کو ملا ہے جس میں
لگتے ہی رہتے ہیں پیوند گماں روز بروز
چھپ نہیں سکتی چھپانے سے محبت ہے میاں!
ہوتی جائے گی تیرے رُخ سے عیاں روز بروز

اس غزل کی ردیف ''روز بروز'' ایک منفرد حیثیت کی مالک ہے۔ یہ ایک نئی ردیف ہے۔ اس سے پہلے ایسی ردیف اور اس طرح سے مستعمل نہیں دیکھی گئی۔ ان کے کلام میں بہت سی غزلیں ایسی موجود ہیں جن میں انہوں نے نت نئے تجربے کیے اور سنگلاخ زمینوں اور منفرد ردیفوں کا استعمال کیا ہے۔

صنعت حسن تعلیل:

منصف خان سحاب، نگارستان میں لکھتے ہیں:

''یعنی کسی چیز کی کوئی ایسی صفت بیان کی جائے جو حقیقت میں اس کی علت نہ ہو لیکن اصل علت ظاہر ہو۔''

کلامِ ہاشمی سے اسی حوالے سے اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہو نہ پائی کبھی تعمیر کی حسرت پوری
بہتے پانی پہ گھروندے کی بنا رکھی تھی

اس شعر میں ''بہتے پانی پر گھر کی بنیاد'' کی علت موجود ہے۔ بہتے پانی پر کوئی تعمیر اور اس کی حسرت ناممکن بات ہے۔ ایک اور شعر دیکھیے:

کتنے گزرے کتنے باقی مرحلے ہیں ضبط کے
آنکھ کی دہلیز پہ بیٹھا ستارا سوچتا ہے

اس شعر میں ''ستارا کا سوچنا'' اور ''آنکھ کی دہلیز پر بیٹھ کر سوچنا'' علت ہے۔ ایک اور شعر دیکھیے:

ترا رونا تواتر سے منوّر
شب تاریک کا منہ دھو گیا ہے

اس شعر میں ''شاعر کا رونا'' اور ''شب تاریک کا منہ دھو جانا'' اس میں علت ہے۔ شاعر کے رونے سے شب تاریک کیسے منہ دھو سکتی ہے۔ مگر شاعر کے تخیلاتی انداز نظر نے اس کو بھی ممکن کر دیا ہے۔

استفہامیہ انداز:

اس سے مراد ہے کہ کلام میں سوال کی صورت شعر کہا جائے۔ شاعری کے بارے میں اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ

شاعری صرف قاری کو لطف اندوز، محظوظ کرنے اور اس کے لیے مسرت کا باعث بنتی ہے لیکن یہ باتیں محض ابتدائی سطح پر درست ثابت ہوتی ہیں، مگر جب شاعری کو اعلیٰ فکری وفنی مدارج کی انتہا پر پرکھا جاتا اور سمجھا جاتا ہے تو شاعری ذات کا ایسا خلا ہے جو شاعر کے اندر موجود ہوتا ہے اور شاعر اس خلا کو فنکارانہ مہارت سے قاری کے سامنے کچھ اس انداز سے رکھتا ہے کہ بعض اوقات اس خلا کو بھرنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر دیوانِ غالب کا پہلا ہی شعر اپنے اندر ایسا خلا رکھتا ہے جس خلا کو آج تک بھرا نہیں جا سکا اور وہ شعر آج بھی ذات وکائنات کے بارے مجموعہ سوالات ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

منور ہاشمی کی شاعری میں بھی ایک ایسا ہی خلا موجود ہے جو قاری کو اپنے تخیل کے حصار میں لے لیتا ہے۔ منور ہاشمی نے روایت سے ہٹ کر شاعری کی ہے وہ چیزوں کو ایک الگ زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہمیشہ نئے حقائق سامنے لانے کی سعی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

آنکھ کی خیرگی یہ کہتی ہے
کوئی شعلہ تھا، نور تھا، کیا تھا
میری جانب نگاہ اٹھ نہ سکی
شرم تھی یا غرور تھا کیا تھا
خط کے لفظوں سے تھا عیاں کیا کیا
وہ جو بین السطور تھا کیا تھا

منور ہاشمی نے اپنی شاعری میں بہت سے موضوعات کو برتا اور ان کو الفاظ ومعنی کی وسعت دے کر جدت اور روایت کے ساتھ ڈھالنا ایک مشکل عمل تھا مگر کمال فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس عمل کو بخوبی احسن انداز میں کیا۔ ان کے اس عمل میں کامیاب ہونے کی چند دلیلیں یہ بھی ہیں کہ انہوں نے تشبیہات واستعارات، تلمیح، تضاد، ذوالقوافی، تجسیم، حسن تعلیل، تکرار حرفی ولفظی ودیگر صنعتوں کے استعمال سے اپنی شاعری کو فنی اعتبار سے نمایاں کیا ہے۔ آپ نے اپنی شاعری میں غزل کی آبرو رکھی ہے۔ آپ اردو غزل کا وہ نام ہے جو واقعی منور ہے۔ آپ کی غزل شعری چاشنی اور تغزل کے انداز سے بھرپور ہیں اور گلشن غزل کی آرائش میں آپ نے اپنا کردار ادا کیا۔ غزل کو فکری حوالوں کے ساتھ ساتھ فنی اعتبار سے دل فریب بنا کر غزل کے مزاج میں ڈھالتے ہوئے شعر کہنا ان کی فنی صلاحیت کے سبب منفرد ہیں۔

(ادارتی نوٹ: زیر نظر مقالہ حافظہ حیات کے ایم فل تھیسس کا ایک باب ہے۔ جس میں ایک صد سے زاید حوالہ جات تھے۔ کئی حوالوں کو حذف کر دیا گیا ہے جبکہ باقی حوالہ جات کے نمبر شمار بھی طوالت کے خوف سے نہیں دیے گئے۔)

ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزل کا اسلوبیاتی جائزہ

محمد بلال اسلم

اردو شاعری میں منور ہاشمی کا نمایاں مقام بطور ایک غزل گو شاعر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منور ہاشمی کی غزل صرف نئے عہد کی نئی غزل کا ایک منفرد نقش ونشاں ہی نہیں تخلیقی بصیرت کے ایک لازوال سلسلے کا حصہ بھی ہے جس کا ایک دریچہ آنے والے زمانوں کی طرف کھلتا ہے اور دوسرا کلاسیکی غزل کی طرف یہی وجہ ہے کہ منور ہاشمی کی غزل کو بے مثال مقبولیت اور شہرت ملی ہے کیونکہ اردو شاعری کی دوسری اصناف کی برعکس غزل کی صنف انسانی صورت حال اور زماں ومکاں کے تمام تغیرات کی پرچھائیاں سمیٹنے کے بعد بھی اپنے ورثے سے کبھی دست بردار نہ ہوگی۔ نئی غزل کا ایک قدم اپنی روایت کے سمٹتے پھیلتے دائرے میں بھی نہایت مضبوطی سے جما رہے گا۔ منور ہاشمی کی غزل میں حال اور مستقبل کے ادراک کے علاوہ ماضی کا احساس ایک دائمی قدر کے طور پر موجود ہے چنانچہ ان کا قائم کردہ اسلوب اور ان کا مخصوص رنگ وآہنگ ہماری ادبی تاریخ کے آئندہ موسموں میں بھی اپنی بہار کے ساتھ زندہ اور روشن رہے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ منور ہاشمی ایسے شاعر ہیں جن کی غزل کا اعتراف ان کی حیات میں ہی ہوگیا ہے ورنہ بہت کم ایسے شعراء ہیں جن کے فن کا اعتراف ان کی زندگی میں ہی ہوا ہو اور شہرت کی بلندی ان کا نصیب ٹھہرا ہو۔ منور ہاشمی شہرت کے روایتی ہتھکنڈوں کے بجائے چاہتے ہیں کہ ان کی پہچان ان کی شاعری سے ہو۔

منور ہاشمی اردو غزل کے میدان میں منور ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس دور میں جب کہ نئے ادب کی ترجمانی کرنے والے معروف ادبی رسالے نئی شاعری کے نامعتبر شعراء کو بھی شروع کے صفحات میں نمایاں جگہ دے رہے ہیں لیکن اس کے باوجود منوؔر ہاشمی رسالوں کے معروف اور مستحکم شاعروں کی طرح نہیں چھپ رہے لیکن منوؔر ہاشمی کی شاعری کی قوت اور وسعت کا انداز ذی فہم اور باشعور قاری کو ہونے لگا ہے اسی قوت اور وسعت کے وصف کی وجہ سے منوؔر ہاشمی کا شمار پاکستان کے صفحہ اول کے نمایاں شعراء میں ہونے لگا ہے مگر منور ہاشمی کو اس منزل تک ناقدین نے نہیں بلکہ ان کے قارئین نے پہنچایا ہے۔ کیوں کہ تو انا تخلیق کا پیمانہ نقاد سے زیادہ قاری کی دسترس میں ہوتا ہے۔ منوؔر ہاشمی نے معروف اور مستحکم شعراء کے درمیان دیر سے نمودار ہونے کے باوجود بہت جلد اپنی الگ شناخت بنائی ہے اور ان معاصرین سے آگے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جو بہت زمانے سے شاعری کے میدان میں جمے ہوئے ہیں۔

جہاں تک اسلوب کی تعریف یا Definition کا تعلق ہے مختلف ناقدین ادب کی آرا اس بارے میں مختلف ہیں۔ معروف فرانسیسی ادیب فلا بیئر اسلوب کو تخلیق کار یا مصنف کے سوچنے اور دیکھنے کا مخصوص انداز قرار دیتا ہے۔ اسلوب کا انگریزی مترادف Style ہے۔ جو بنیادی طور پر لاطینی زبان کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی لوہے کا قلم ہے اسلوب کی سادہ

سی تعریف کسی شخص کا مخصوص انداز بیان یا طرز تحریر ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر کی اس رائے کو بہت شہرت حاصل ہوئی ہے جو انہوں نے ۱۷۵۰ء میں فرنچ اکیڈمی کے افتتاحی اجلاس میں پیش کی تھی۔اس رائے کے فرانسیسی الفاظ یہ تھے۔ Le Style Estl homme Men.یعنی ''اسلوب خود انسان ہے۔'' یہی تعریف انگریزی ادب میں مستعمل ہے۔ Style is the man himself.

اسلوبیات کی اصطلاح نئے تنقیدی مباحث یا جدید تر تنقیدی تصور میں شمار کی جاتی ہے۔اس کی قدامت کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ قریباً بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے اسلوبیاتی تنقید یا اسلوبیات کے ذریعے معروضی ،لسانی اور سائنٹفک بنیادوں پر ادبی تخلیقات کے اسلوبیات کا تجزیہ کیا جا رہا ہے۔یوں تنقید کا مکتب ۱۹۲۰ء کے بعد خاصا مقبول و معروف ہوا ہے آج اسلوبیات نے اس قدر ساکھ قائم کر لی ہے کہ اسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

آج ادب کی کوئی پہچان اسلوب کے بغیر مکمل نہیں کسی بھی شاعر یا مصنف کے انداز بیان کے خصائص کیا ہیں۔ کسی مصنف یا ہیت میں کس طرح کی زبان استعمال ہوتی ہے۔یا کسی عہد میں زبان کیسی تھی اور اس کے خصائص کیا تھے۔ وغیرہ وغیرہ یہ سب اسلوب کے مباحث ہیں۔اسلوب کو ہم ایک مصنف کا ''دستخط'' قرار دے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ''اشارات تنقید'' میں رقمطراز ہیں:

> ''سٹائل صرف خارجی خصائص تحریر کا نام نہیں بلکہ مصنف کی شخصیت کے داخلی نقوش،اس کا طرز مشاہدہ ہی نہیں بلکہ اس کا طرز احساس بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر مصنف کے زمانے اور اس کی قوم،بلکہ اس کی پوری تہذیب کے نقوش کا نام ہے۔''

یوں دیکھا جائے تو ہر لکھنے والا ایک مخصوص اسلوب کا حامل ہوتا ہے جس سے وہ پہچانا جاتا ہے اور اسی مخصوص اسلوب کی تخلیق سے ہی ایک تخلیق کار یا فنکار کی امیج کا پتہ چلتا ہے۔الفاظ کی مختلف صورتوں میں انسانی زندگی کے مختلف تجربات جذب ہوتے ہیں۔مصنف کے تجربات بھی مصنف کے الفاظ کی ہی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں کسی بھی تحریر میں اسلوب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں صاحب اسلوب اپنی بنائی ہوئی تصویر کو بخوبی دکھا سکتا ہے کہ جو تصویر اس نے بنائی ہے وہ اس کے ذہن اور اس کی سوچ کے معیار کے مطابق بن پاتی ہے یا نہیں۔ ہر شخص کا طریق کار اور مزاج مختلف ہوتا ہے اس لیے ہر شخصیت کے اسلوب تحریر میں واضح فرق ہوتا ہے۔اسلوب کے ضمن میں سید عابد علی عابد نے اپنی تصنیف ''اسلوب'' میں درج ذیل فکری صفات کا احاطہ کیا ہے۔۱۔سادگی ۲۔قطعیت ۳۔اختصار ۴۔زبان و بیان ۔اسلوب کی یہی صفات منوؔر ہاشمی کے اسلوب میں بھی جھلکتی ہیں۔

۱۔سادگی:

سادہ اسلوب وہ ہوتا ہے جس میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہوتی۔جہاں الفاظ بھی معانی کے ساتھ پہلو بہ پہلو سادہ ہوتے ہیں اور اس میں سادگی بھی نظر آتی ہے۔ان کے اسلوب میں فکر کے رشتے پیچیدہ اور نازک اور جذبے کے پہلو دقیق

ہوتے ہیں۔ان کے اسلوب میں سادہ پن پایا جاتا ہے جو پڑھنے والے کو دشوار نہیں گزرتا ہےان کے اسلوب کی سادگی کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے اسلوب میں زیادہ مشکل الفاظ کا استعمال نہیں ہے۔ان کے اسلوب میں جو سادگی پائی جاتی ہے وہ کم ہی لکھنے والوں کے اسلوب میں میسر ہوتی ہے۔

اک اجنبی کو اپنا بنانے کے واسطے
ہم نے دیے ہیں سارے زمانے کے واسطے

۲۔قطعیت:

سادگی کے مقابلے میں قطعیت اسلوب کی وہ صفت خاص ہے جس میں فکر کے رشتے پیچیدہ اور جذبے کے پہلو دقیق ہوتے ہیں۔ان کی آمیزش طبعاً ایسے الفاظ کا تقاضا کرتی ہے جو چاہے معلق اور پیچیدہ ہوں لیکن وضاحت مطلب کے اعتبار سے وہ کسی طرح سادگی سے کم نہ ہوں۔منور ہاشمی کے اسلوب میں قطعیت پائی جاتی ہے وہ اگرچہ الفاظ و تراکیب بھی پیچیدہ اور دقیق استعمال کرتے ہیں لیکن اپنا مطلب قطعیت سے پڑھنے والے تک بخوبی پہنچا دیتے ہیں۔شعر و ادب میں خیال اور اسلوب دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں ایک کو جسم اور دوسرے کو روح کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ خیالات اظہار کے لیے الفاظ کے محتاج ہوتے ہیں۔چنانچہ اسلوب اور خیال کا ادب کی کسی بھی صنف سے ہو اس کا تعلق واضح ہوتا ہے۔کسی بھی تحریر میں اسلوب کی اہمیت بنیادی ہے۔یہ بات بجا طور پر درست ہے کہ منور ہاشمی کی غزل متنوع موضوعات کی حامل ہے۔تاہم اس کے ساتھ ساتھ ان کا انداز بیان بھی موثر ہے اظہار کی سادگی اور پرکاری بھی ان کا خاص وصف ہے جو انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے ان کی غزل سادگی اور اعلیٰ ذوق کی پرکاری مثال لگتی ہے منور ہاشمی نے بیشتر فنی لوازمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے کلام کو فنی خوبیوں سے سجایا ہے ان کے ہاں فکر کی بلندی کے ساتھ ساتھ اظہار کا سلیقہ بھی دکھائی دیتا ہے۔

شاعری میں خوبصورت اور موزوں الفاظ ہی شاعرانہ فکر میں بلندی پیدا کر سکتے ہیں اس لیے بہترین اور کامیاب شاعر وہی ہوتا ہے جو اپنے کلام میں ان فنی لوازمات کا خیال رکھے یہ ایک دقیق فعل ہے۔شاعری میں الفاظ کا انتخاب اور حسن کاری پیدا کرنے کے لیے جس مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ بہت مشکل اور کٹھن مرحلہ ہے۔

عشق بھی ہم نے کیا تو اک عبادت کی طرح
قریۂ جاں میں بچشم باوضو پھرتے رہے

۳۔اختصار:

ان کے اسلوب میں اختصار کا عنصر نمایاں ہے وہ بات کو مختصر کر کے بیان کرتے ہیں اور اپنی بات قاری تک پہنچا

دیتے ہیں۔ وہ اختصار کے ساتھ اپنا مقصد اور اپنے جذبات واحساسات کو قاری تک پہنچاتے ہیں۔ سیّد عابد علی عابد اپنی تصنیف ''اسلوب'' میں گداز کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ انسانی زندگی یا تجربات کی وہ صفت جو رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرے یا خارجی حالات میں کوئی ایسا تغیر جس سے یہی ذہنی کیفیت پیدا ہو اور منوّر ہاشمی کی شاعری کا اسلوب بھی ایسا ہے جو انداز تحریر میں رحم کے جذبات اکساتا ہے ان کا شعری اسلوب بھاری بھرکم ہے۔

لگتا ہے کہ بس ایک تکلف ہے یہ ملنا
ہم خود تو کہیں اور ہیں جذبات کہیں اور

ڈاکٹر منوّر ہاشمی زبان و بیان پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔ وہ بات کو سادہ لب و لہجے میں بیان کرتے ہیں۔ خیالات کو الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھانے کے بجائے سادہ زبان میں خیالات کو سامنے لاتے ہیں۔ منوّر ہاشمی کی غزل کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ آسان اور سادہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ زبان و بیان کی قدرت نے ان کو اس دور کا ایک قابل ذکر اور ممتاز شاعر بنا دیا ہے۔

شعر میں حسن و بیان کا جو مجاز کھلتا ہے تو وہ نقاد کے حسن و بیان اور لطف زبان کا محرم راز ہے۔ وہ جانتا ہے کہ شعر میں اصل حقیقت مجاز ہے۔ مجاز میں بھی جو صنعت گری کی جان ہے۔ اسے تشبیہ واستعارے کے نام سے پکارتے ہیں اور یہ ہی تشبیہ واستعارے منوّر ہاشمی نے اپنی غزل میں برتے ہیں اور انہی کی بدولت اپنی غزل میں چار چاند لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

رات بھر دل میں کسی کی یاد کا میلہ رہا
ایک ویرانے کو ایسی رونقیں دیتا ہے کون

ایسے وہ خانہ دل میں اترا
جیسے ویرانے میں آہو آئے

ہاتھ ہی اسلوب ہے۔ اسی کے زور سے آج بڑے بڑے شاعر اور نثر نگار ادب میں محفوظ ہیں اور دور سے واضح طور پر پہچان لیے جاتے ہیں کیوں کہ متفقہ طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ تحریر میں لکھنے والے کا عکس جھلکتا ہے۔ خواہ شخصیت کا مکمل، نصف یا کچھ ہی حصہ منعکس ہو رہا ہو۔ ہم تحریر کے مخصوص اسلوب سے پتہ چلا سکتے ہیں کہ یہ عبارت کس مصنف کی ہے۔ لفظوں کا انتخاب، فقروں کی چستی اور جملوں کی ساخت یہ واضح اشارہ کر دیتی ہے کہ کاغذ پر گل کاری کس مصنف کی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے وضاحت کرتے ہوئے اس بات کو یوں بیان کیا ہے:

''لکھنے والا بہر حال چیزوں کو دیکھتا ہے، ان کے بارے میں سوچتا ہے اور ایک مخصوص انداز بیان میں ان تاثرات کو پیش کرتا ہے

جو ردِعمل کے طور پر اس شخصیت میں ترتیب پاتے ہیں اس لیے اسلوب اس کی شخصیت کا عکس اور اس کے مزاج کا آئینہ دار ہوتا ہے۔"

ان تمام تعریفوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلوب کا مصنف کی شخصیت سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اسلوب مصنف کی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس سے مراد وہ منفرد انداز بیاں ہوتا ہے جس کے آئینہ میں ہم مصنف کی شخصیت کو بے نقاب دیکھ سکتے ہیں خواہ وہ شخصیت کا خارجی پہلو ہو یا داخلی، ایک منفرد شخصیت کی تعمیر میں جو عناصر کارفرما ہوتے ہیں وہی مخصوص اسلوب کی بھی تشکیل کرتے ہیں۔

منور ہاشمی کے منفرد لب و لہجے نے اُن کے اسلوب کو انفرادیت بخشی ہے انہوں نے فنی اور فکری حوالوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے شاعری کی ہے۔ عہد کی معاشرتی فکر اور اسلوب ان کی شاعری کا لباس ہے۔ پختگی، بے ساختگی اور علمیت ان کے کلام کا خاصہ ہے۔ ان کی شاعری اپنے عہد کی شاعری ہی نہیں ان کی زندگی کی آپ بیتی بھی محسوس ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں گہری فکر اور سوچ موجود ہے۔ ان کی فکر بے شمار موضوعات لیے ہوئے ہے۔ اگر انہیں موضوعات کا متنوع شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ ان کی شاعری زمانے بھر کے حسین حساس اور تلخ موضوعات زیر بحث لاتی ہے اور یوں وہ آفاقیت سے ہمکنار ہوتی ہے۔

محبتوں کے آس پاس نفرتوں کے درمیاں
حیات نوحہ خواں ہے آج سازشوں کے درمیاں
عجیب کشمکش میں ہوں قدم اٹھاؤں کس طرف
کھڑا ہوا ہوں آج کتنے راستوں کے درمیاں

سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں:

"منور ہاشمی کی غزل کو میں نے نئی رتوں کے ذائقے سے آباد پایا ہے۔ وہ دھوپ سے چھاؤں کشید کرتا ہے۔ وہ زندگی اور فن دونوں سے مخلص ہے۔ وہ اپنی آواز میں شعر کہتا ہے۔"

منور ہاشمی نے اپنے کلام میں حمد و نعت اور سلام کو بھی صف اوّل کے طور پر شامل کیا ہے۔ کسی بھی شاعر کی شاعری میں خاص طور پر حمد، نعت اور منقبت سے محبت کا اظہار ایمان کی علامت ہے۔ منور ہاشمی نے اپنی غزل میں اپنے اس ایمان کے اُجالے کو عام کیا ہے۔ عشق رسولؐ میں وہ ہمیں اعلیٰ مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ اس کا شعر ملاحظہ ہو۔

اگر اے منوّر پر خطا کوئی نام پوچھے تو یہ بتانا
میں دائیٔ شہر رسول ہوں، میرا نام ادنیٰ غلام ہے

پاک و ہند کے مشہور شاعر شمیم جے پوری نے کچھ ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔

''عجز و انکسار کا جو انداز منور ہاشمی کی نعت میں ملتا ہے۔ وہ ان کی عقیدت و محبت کا عکاس ہے۔ وہ بلا شبہ عشق نبی میں ڈوب کر نعت کہتے ہیں۔ ان کے ہاں فن کی پختگی بھی ہے اور فکر کی گہرائی بھی۔ ان کی نعت کا ہر شعر قلب و روح میں اترتا چلا جاتا ہے۔ بعض اشعار تو ایسے ہیں کہ ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔''

منور ہاشمی کی ماہرانہ بصیرت، عمیق نظری اور ذہنی پختگی نے انہیں شاعری کے میدان میں ایسا بلند مقام بخشا ہے کہ آج ان کے اشعار زبان زد عام ہو رہے ہیں۔ انھیں الفاظ سازی پر ایسی گرفت حاصل ہے جو کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہ آئے گی۔ حرف حرف نگینے کی طرح موزوں مقام پر جڑا ہوا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر مناظر احسن ہرگانوی لکھتے ہیں:

''اُردو غزل کے تمام سرمائے میں اداسی اور کرب کا حوالہ نمایاں ہے۔ منور ہاشمی کی غزلوں کی چمک، جذبہ، قوت حرارت اور پیغام حیات میں مضمر ہے۔ آشوب آگہی اور روح عصر کی فکری توجیہہ سے مرصّع ان کی غزلیں نئے جہاں اور زندگی کی نئی تعبیر کا حوالہ ہیں۔ روابط اور رشتوں کی نوعیت، بدلے ہوئے نظام اور عمل اور ردعمل کے سلسلے کے نئے پیمانے اور سانچے کی وجہ سے ان کی غزلوں میں راہیں الگ نظر آتی ہیں۔ نمایاں جدت طرازی اور تنوع کے ساتھ ساتھ غزل کی منجھی ہوئی روایت کا نکھار صد کیف بداماں ہے۔''

محرومی انسانیت، احساس دردمندی منور ہاشمی کی شاعری میں حوصلہ مندی کے ساتھ در آئی۔ یہ ان کے اسلوب کی خاص صفت ہے کہ خدا نے انہیں حساس طبیعت بخشی جس کا عکس ان کی شاعری پر واضح ہے۔ دردمندانہ جذبات کا اظہار دلکشی کے روپ میں پیش کرنا انہی کو آتا ہے۔ زندگی کے دُکھوں سے سُکھوں کا ایمان ہے۔ منور ہاشمی کی شاعری ایک دردمند شاعر کا فنی سفر ہے ان کی شاعری کا فنی حوالہ اور فکری رُخ اپنی جگہ اہم ہے۔ غزل جیسی لیے دیئے رہنے والی ہمہ آشنا صنف کے دل میں جگہ بنا لینا، اُسے اپنا لینا، کوئی چھوٹی سی بات نہیں منور ہاشمی نے اس میں تازہ طرز بھی اپنائی ہے اور یاد رہ جانے والے شعر بھی نکالے ہیں۔ مایوسی اور ناامیدی کا لفظ منور ہاشمی کی ڈکشنری میں موجود نہیں۔ وہ خود بھی حوصلہ مند ہیں ان کے خیالات اور نظریات بھی صحت مند ہیں اور ان کی شاعری کا پیغام بھی یہی ہے۔ وہ قاری کے اندر ایک نئی روح اور طاقت اپنے شعروں کے ذریعے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

پھول صحرا میں کھلائے ہیں منوّر میں نے
تاکہ مہکی رہے کچھ دیر فضا میرے بعد
نظر کا کوئی بھی انداز رکھ لو
تمہارا دیکھنا ہی کم نہیں ہے

منور ہاشمی کی نشاط زیست میں خوشی و غم دونوں کا تاثر ملتا ہے۔ شوق طلب اور عشق کے متعلقات نارسائی کے دُکھ بھی شامل ہیں۔ خوشی اور زندگی کی خوبصورتی بھی ملتی ہے۔ غزل میں رنگارنگی کا سماں ہے۔ الفاظ کی حقیقت پسندی، نشست و برخاست، جذبے اور تخیل کی فراوانی کی بجائے ایک اعتدال سا پایا جاتا ہے اور یہی خصوصیت انہیں اُردو ادب میں منفرد مقام

عطا کیے ہوئے ہے منور ہاشمی کے اسلوب کی منفرد خصوصیات میں تحیر، تفکر اور تجسس نمایاں ہیں۔ تحیر آمیز لہجہ فکر و فلسفہ سے پُر موضوعات شاعری اور تجسس انہی کا خاصا ہے۔ وہ قاری پر اپنی گرفت مضبوط رکھتے ہیں اور اگر کہیں ڈھیلی پڑتی بھی ہے تو صرف اس قدر کہ قاری کو اس کا احساس تک نہیں ہو پاتا۔ قاری کے دل کی دھڑکن اور نبض کی رفتار ان کے لہجے کی برجستگی اور الفاظ کی چابکدستی میں پنہاں ہے۔ الفاظ سازی میں تو مرصّع ساز ہیں ہی مگر الفاظ کو نگینوں کی طرح شعر کے اندر صحیح مقام پر چننا انہیں خوب آتا ہے کوئی حرف بے محل نہیں نظر آتا۔ وہ کوئی لفظ بے موقع نہیں برتتے بلکہ ادب اردو کو الفاظ کے لیے استعمال کرنا ان کا احسان ہے۔ موضوع کے وسیع سمندر کو کوزے بلکہ قطرے میں بند کرنا انہی کی شاعری ہے۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کی غزلیں جدید فکر اور احساس کی حامل ہیں۔ ہر غزل پر ان کی انفرادیت کی مہر ہوتی ہے اور بات کہنے کا انداز انتہائی مؤثر، لہجے کے لحاظ سے جدید اور طرزِ سخن کا انداز دیکھئے تو وہ بھی ایک جدید شاعر ہونے کے باوجود قادر الکلامی کی سرحدوں کو چھوتے ہیں۔ نئی فکر نے اُردو غزل کو نئے نئے خیالات سے مالا مال کیا ہے اسی طرح ان کی بیشتر غزلیں قافیے اور ردیف کے گھسے پٹے انداز سے مبرا ہوتی ہیں۔ منور ہاشمی جب حروف سے کھیلتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے حروف ان کے ہاتھ بندھے غلام ہوں جو ضرورت محسوس ہوتے ہی خالی جگہ پر کر لیتے ہیں۔ ان کی شاعری جذبات کی شاعری ہے جذبات ہر جگہ جھلکتے نظر آتے ہیں۔ جذبہ حب الوطنی نہایت اعلیٰ ذوق کا حامل ہے۔ جن سے ان کی وطن پرستی، دیس سے محبت، علاقے کا پیار اور روایت پسندی ظاہر ہوتی ہے۔ وطن کی محبت ان کی غزل میں بھی ملتی ہے۔ وہ قدیم روایت کو جدیدیت کے ساتھ یوں منسلک کرتے ہیں جیسے یہ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہوں۔ منور ہاشمی کربِ آگہی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''میں اس ادب کو نہیں مانتا جو پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کو عبور کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے اس کے ادب کو بھی نظریاتی ہونا چاہیے۔ اس حوالے سے مجھے متعصب یا جانبدار کہا جائے تو بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ اس رائے پر مجھے فخر ہوتا ہے۔''

شاعری چوں کہ لطیف جذبات کا اظہار ہے۔ لطیف جذبات انسان کے تخیل کے گلشن میں مچلتے ہیں تو شاعری کے پھول کھلتے ہیں۔ اس لیے محبت اور لطافت کے جذبات نہ چاہتے ہوئے بھی شاعری میں چھلک آتے ہیں۔ اشعار کے اندر ایک شفیق چہرہ ابھرتا ہے جو محبتوں کی منڈی کا سوداگر ہے۔ اُسے جذبات میں پاکیزگی اور دوستی میں بے غرضی بڑی پسند ہے شاعر جذبات سے کھیلتا ہے مگر جذبات کو اپنی ذات پر حاوی نہیں ہونے دیتا۔

منور ہاشمی کا یہ بھی خاص وصف ہے کہ انہوں نے شعری تجربے کو دھیما پن دیا۔ سخت سے سخت بات بھی غنائیت و رعنائیت سے بھرپور ہے۔ ان کی شاعری جدیدیت اور روایت کا سنگم ہے۔ کیوں کہ منور ہاشمی نہ تو روایت سے ناطہ توڑتے ہیں اور نہ ہی جدیدیت سے منحرف ہوتے ہیں بلکہ درمیانہ راستہ اپناتے ہوئے اپنی بات غزل کی ہیئت میں لطافت اور

ملائمیت کے غلاف میں لپیٹ کر قاری کو پیش کرتے ہیں۔ان کی شاعری کہیں بھی شعر گری کی نذر نہیں ہوتی۔ بلکہ صحت مند ماحول برقرار رکھتی ہے۔منور ہاشمی شعر برائے شعر کہنے کے قائل نہیں بلکہ اپنے تجربات اور جذبات کو احساس کی سطح پر پرکھنے کے بعد شعر کہتے ہیں،ان کے اشعار میں لہجے کا تنوع اور مصرعوں کی تراش قابل دید بھی ہے اور لائق داد بھی ہے۔

منور ہاشمی کی شاعری میں قلبی واردات،حسن وعشق،محبت وشگفتگی اور عصری شعور کے ساتھ ساتھ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو ان کی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔وہ خود بھی انفرادیت پسند ہیں اور ان کی شاعری بھی منفرد ہے۔ان کی زندگی کے نشیب وفراز کے ذاتی تجربات بھی ان کی شاعری میں درآئے جو عصری رویوں کے قریب تر ہونے کی وجہ سے آفاقی ہیں اور ہر شخص کو وہ اپنے ہی واردات قلبی کے تشاکل نظر آتے ہیں۔ پروفیسر کرار حسین لکھتے ہیں:

> ''اُردو غزل اپنے مزاج کے اعتبار سے بہت کم شعرا سے ہم آہنگ ہے۔آج کل علامتی انداز میں گفتگو کرنے کا رواج عام ہے مگر غزل اس آہنگ سے کبھی ہم آہنگ نہیں ہے۔غزل میر تقی میر کی میراث ہے اور میر کا وارث وہی ہوسکتا ہے جو میر کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہو قبیلہ عشق سے۔ مجھے منور ہاشمی سے ملاقات کر کے خوشی ہوتی ہے کیوں کہ یہ آج کے دور میں اس قبیلے کا واحد فرد اور نمائندہ ہے۔منور ہاشمی نے غزل کو اعتماد دیا اور غزل نے اس اعتماد کا بھرم رکھا۔''

عظمت انسانی، معاشرتی ناہمواریوں، مسائل زندگی، احساس محرومی کو بھی بڑے تناسب اور موزوں انداز سے پیش کیا گیا ہے۔یہی دردمندی،کسک اور احساس اسے اپنی عہد کے شعراء میں ممتاز کرتا ہے کیوں کہ خلوص اس کا وصف ہے جو ان کی شاعری کا اسلوب بھی بن گیا۔ منور ہاشمی کی شاعری میں صنائع بدائع،تشبیہ واستعارات اور تلمیحات کے ساتھ ساتھ منظر کشی،فطرت نگاری اور حقیقت بیانی بھی موجود ہے۔ان کی شاعری اوزان اور بحروں کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔ چھوٹی، بڑی اور لمبی بحروں میں غزلوں کی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں۔کہیں استفہامیہ انداز ہے تو کہیں ناصحانہ رنگ،مکالمہ نگاری وافر مقدار میں موجود ہے۔قاری کو ان کی شاعری پڑھتے ہوئے اکیلے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ گویا اک ہمدرد ساتھی دلجوئی اور اکلاپے پن کو دُور کرنے کے لیے حاضر ہے اور انہی باتوں کی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ منور ہاشمی کا شعری اسلوب ایک منفرد لہجہ اور رنگ اپنائے ہوئے ہے۔وہ خود فرماتے ہیں:

بنے گی سرمۂ اہل نظر وہ خاک آخر
کہ اشک جس میں کوئی ایک بھی گرا مرا

(اداراتی نوٹ:زیر نظر مضمون میں کئی ناقدین فن کے حوالوں کو بخوف طوالت حذف کر دیا گیا ہے۔)

کلیاتِ منور ہاشمی اور سماجی شعور

مظہر عباس

شاعر معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے، سماج میں معاشی و معاشرتی ناانصافی، ظلم وستم، حکمران طبقہ کی لوٹ کھسوٹ اور دیگر واقعات اس کے شعور پر گہرا اثر ڈالتے ہیں اور وہ اپنے محسوسات وخیالات کو بیان کرنے کے لیے غزل کا سہارا لیتا ہے۔ اس طرح غزل کے موضوعات میں وسعت اور تنوع پیدا ہو گیا ہے اور غزل کسی موضوعاتی دائرے کی پابند نہیں رہی۔ پوری انسانی زندگی اور پورا سماج اس کا موضوع ہے۔ اس طرح انسان کے داخلی، خارجی، دونوں جذبات، افکار اور مسائل کے اظہار کا ذریعہ غزل ہے۔ غزل انسان کے تمام مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ موسیقی انسان کے لطیف جذبات کو متاثر کرتی ہے۔

معاشرہ یعنی سماج غزل کا موضوع ہے لہٰذا شاعر اپنے سماج میں جو چیز دیکھتا ہے، اسے غزل کے ذریعے بیان کر دیتا ہے۔ جس میں اس کے معاشرے کے مثبت اور منفی رویوں کے علاوہ اس معاشرے کی تہذیب وثقافت، اقدار، رسومات اور دیگر سماجی چیزیں شامل ہیں۔ اس لیے کوئی بھی شاعر، ادیب یا لکھاری ہو، اس کی تحریریں اپنے عہد کی معاشرت اور سماج کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اس کے تاثرات اور محسوسات انفرادی نہیں ہوتے بلکہ وہ ان میں زمانے کے حادثات اور دکھ سکھ سمو دیتا ہے اور یہی خوبی اور احساس اس کو اپنے زمانے اور آنے والی نسلوں کے لیے زندہ رکھتا ہے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی بھی ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے زمانے کے دکھ درد اور حالات کو محسوس کیا اور اپنی غزل میں زمانے کے حالات بیان کیے۔ جنھیں مختلف عنوانات کی ذیل میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ حسد/نفرت:

حسد یا نفرت انسان کے اندر ایک ایسا مادہ ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے دور کرتا ہے۔ حسد انسان

کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ حاسد کے لیے اتنی ہی سزا کافی ہے کہ وہ خود ہی حسد اور نفرت کی آگ میں جلتا ہے۔ حسد کی بنا پر انسان میں نفرت اور دشمنی جیسے موذی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اتفاق و اتحاد کی فضا ختم ہو جاتی ہے اور سماج میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے جس سے سماج ترقی کے بجائے تنزلی کی سیڑھیاں اُترتا ہوا صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے جو انسان کے اندر عداوت اور دشمنی پیدا کرتا ہے۔ بقول ہاشمی:

لازم ہے ایسے دوستوں کی ہم مدد کریں
جو ایک ایک بات پر سب سے حسد کریں

۲۔ مظلوم کی آواز:

ظلم کے عمل میں ظالم اکیلا نہیں، مظلوم بھی برابر کا شریک ہوا کرتا ہے۔ مظلوم کی خاموشی اور برداشت ظالم کی مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ وہ مظلوم کی خاموشی سے شہ پاتا اور ظلم کا تازیانہ بڑھ چڑھ کر برساتا ہے۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے تا وقتیکہ مظلوم بے حسی اور بے غیرتی کی چادر اُتار پھینکے۔ بقول ہاشمی:

پہنچا ہر نقصان ہمیں کو جب تک تھے خاموش
آخر ہم بھی بول پڑے پھر کیوں رہتے خاموش

پوری دنیا میں انقلاب اور تبدیلی کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ایک نہ ایک دن نچلے اور پس ماندہ طبقات کو ظلم و زیادتی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا ہی پڑتا ہے۔ انسان جبرِ مسلسل پر قانع نہیں رہ سکتا۔ جیسا کہ ہاشمی فرماتے ہیں:

تبدیلی کا بن جائے گا اک دن دعویدار
ماں کی گود میں جو لیٹا ہے سر رکھے خاموش

فرعونی جبر کے قصرِ استبداد سے ایک نہ ایک موسیٰ پرورش پا کر نکلتا ہے اور اپنی ضربِ کلیمی کا اعجاز دکھاتا ہے۔

۳۔ مزدور کی بے بسی:

مزدور ہمیشہ سے سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کی چکی میں پستا آیا ہے۔ اس کی بے بسی، تہی دستی و تہی دامانی اور تنگ دستی و حرماں نصیبی کا رونا ہر صاحبِ درد شاعر نے رویا ہے۔ اس کا ذکر ہمیں فیض سے لے کر حبیب جالب تک اور احمد ندیم قاسمی سے لے کر علی سردار جعفری اور ن م راشد سے لے کر احمد فراز تک تمام ترقی پسند شعرا کے ہاں بکثرت ملتا ہے۔ بقول منور ہاشمی:

گھر اپنے جب شام کو لوٹ کے آیا خالی ہاتھ
میری جانب دیکھ رہے تھے سب بچے خاموش

۴۔ منافقت:

منافقت، فی زمانہ ہمارا سماجی نشان اور طرۂ امتیاز ہے۔ ہر شخص اپنا ہی فائدہ سوچتا اور مطلب براری کے دھندے میں بری طرح گرفتار ہے۔ خون سفید ہو چکے ہیں۔ قول و فعل میں بعد المشرقین ہے۔ ہر شخص بغل میں چھری دبائے ہوئے ہے اور زبان ہے کہ رام رام کے ورد میں مصروف ہے۔ اس رویے کی عکاسی منور ہاشمی کے ہاں یوں نظر آتی ہے:

اُس نے مجھ سے بھی تری ساری کہانی کہہ دی
جس نے تجھ کو مری ہر بات سنا رکھی ہے

۵۔ نچلے طبقات کا احساسِ محرومی:

شاعر معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے اور بہت دور اندیش ہوتا ہے۔ وہ غریب طبقہ کو غربت کی بھٹی میں جلتے ہوئے جب دیکھتا ہے تو ان کا احساسِ محرومی اُس سے دیکھا نہیں جاتا۔ بقول منور ہاشمی:

وہ بھول جاتی ہے رستہ کبھی کبھی یونہی
خوشی ہمارے بھی گھر آتی جاتی رہتی ہے

زیرِ نظر شعر میں منور ہاشمی نے نچلے طبقات کے احساسِ محرومی، زندگی کی رنگینوں اور خوشیوں سے خالی شب و روز کی واضح عکاسی کی ہے۔ قارونی نظامِ معیشت نے یہ دن دکھائے ہیں کہ غریب کا چولھا کئی کئی دن نہیں جلتا۔ جس کے بازو کی قوت سے زمانے کے تمام کارخانے چلتے اور جس کے جوان خون کی بدولت کھیت سونا اُگلتے اور کھلیان ہیروں کی دکان کا منظر پیش کرتے ہیں، وہی مزدور اور غریب کسان، جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ جو زمانے بھر کو خوشیاں دیتا ہے، اسی کے ہونٹ مسکراہٹ کو ترستے ہیں اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ خوشی اس کے صحن کا رُخ کرے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اعلیٰ ظرفی سے کام لے اور یوں کہے کہ ''خوشی ہمارے بھی گھر آجاتی رہتی ہے۔'' اس کا مطلب ہے ہمارے گھر میں خوشی کا مستقل ٹھکانہ نہیں کیوں کہ ہمارے حصے کی خوشی ہمارے حصے کا اناج، ہمارے حصے کی تعلیم، علاج اور وسائل کوئی اور چھین کر لے گیا ہے۔ یہ خوشی، یہ امن، یہ ترقی، یہ لٹے ہوئے حقوق اس وقت تک نہیں ملیں گے جب تک محروم طبقات اس بربریت اور ظلم کے خلاف اُٹھ کھڑے نہیں ہوتے۔

۶۔ رہبر نما رہزن:

دنیا عجب بازار ہے، جہاں گندم نما فروشوں کی بھرمار ہے۔ جس سمت دیکھو، ایک سے بڑھ کر ایک مکار ہے۔ انھی رہنماؤں کے وجود سے چادرِ انسانیت داغ دار ہے۔ کاروبارِ دنیا کیا ہے؟ منافقت کا اشتہار ہے۔ سبز باغ دکھا کر سادہ لوح عوام کی جمع پونجی لوٹ لینا ایک فن اور آرٹ کا درجہ اختیار کیے ہوئے ہے۔۔۔ منور ہاشمی کی شاعری بھی اس سماجی پہلو کی عکاسی

کرتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

جانے رہبر کی ہے یا رہزن کی ہے مجھ کو تلاش
دیکھتا ہوں غور سے چہرہ ہر اک رہگیر کا

۷۔ ناانصافی:

ناانصافی کسی بھی معاشرے کی تباہی کا بڑا ذریعہ ہوا کرتی ہے۔ جیسا کہ حضرت علیؓ کا فرمان ہے: ''معاشرہ کفر پر قائم رہ سکتا ہے، ظلم اور ناانصافی پر نہیں۔'' (نہج البلاغہ) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا کہ ہر شخص اپنے اعمال کا جواب دہ ہے۔ باپ کے جرم کے بدلہ میں بیٹے کو اور بیٹے کے جرم کے بدلہ میں باپ کو نہیں پکڑا جائے گا۔ لیکن وائے حرماں نصیبی کہ ہم نے پیغمبرِ اعظمؐ کے فرمودات عالیہ کو فراموش کر دیا اور اب صورت احوال یہ ہے کہ بقول منور ہاشمی:

جرم جہاں کے سارے میں کر جاؤں گا
اور سزائیں میرا بچہ پائے گا

۸۔ مایوسی/قنوطیت:

جب انسان مایوس ہو جاتا ہے، اس کی زبان دراز ہو جاتی ہے اور جو منہ میں آئے کہہ گزرتا ہے اور عواقب و نتائج کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس لیے جذبۂ سفلی کی ہر شاعر نے مذمت کی ہے لیکن وسائل کی عدم دستیابی اور غربت و افلاس اور پے در پے ناکامیاں بندے کو مایوسی اور قنوطیت کے حصار میں دھکیل دیتی ہیں۔ ناکام خواہشیں حسرتوں میں بدل جاتی ہیں اور شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے، بقول منور ہاشمی:

اپنے اپنے آشیانوں میں پرندے دیکھ کر
خون ہو جاتا ہے میری حسرتِ تعمیر کا

۹۔ تغیر و تبدلِ زمانہ:

زمانہ تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ دنیا میں سوائے خدا کے، کسی شے کو ثبات نہیں ہے۔ تبدیلی کا یہ سفر اور تغیر کا یہ عمل ہر لمحہ اور ہر آن جاری وساری ہے اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ دنیا ''گلوبل ولیج'' بن چکی ہے۔ اسی ترقی، انقلاب اور تغیرِ زمانہ کا تذکرہ منور ہاشمی کی شاعری میں بھی ملتا ہے:

اس طرح سے آئے گا اب انقلاب زندگی
آنکھ میرے عہد کی حیران ہی رہ جائے گی

۱۰۔ماضی سے مستقبل:

انسان ماضی پسند واقع ہوا ہے بلکہ کسی دانا نے تو یہاں تک کہا ہے کہ انسان اپنے دن کا تجزیہ کرے تو اسے یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس دن کا زیادہ تر حصہ یا تو ماضی کو یاد کرتے گزرا ہے اور یا پھر مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے۔ قرآن حکیم نے بھی جا بجا ماضی کی اقوام و ملل کے واقعات بیان کر کے انسان کو اپنے ماضی سے سبق اندوز ہو کر اچھے مستقبل یعنی آخرت کی تیاری کا حکم دیا ہے۔ اس حکیمانہ موضوع کو بھی منور ہاشمی اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں:

گزرتی ساعتوں کی خاک اُڑتی ہے نگاہوں میں
مگر ذہنوں میں مستقبل کا اک دھندلا سا خاکہ ہے

۱۱۔دھوکا:

دھوکا دینا، دھوکا کھانا، دونوں مشہور سماجی رویے ہیں۔ دیکھیے کس خوب صورتی سے منور ہاشمی نے ان کی عکاسی کی ہے:

مسکرا کے جس نے بھی اک لمحے کو دیکھا مجھے
میں سمجھ بیٹھا اُسے بھی زندگی اے زندگی!
یقین اس پہ منوّر کریں تو کیسے کریں
کہ ہم نے پہلے بھی اس سے فریب کھائے ہیں

(ادارتی نوٹ: مظہر عباس کے ایم فل تھیسس میں ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزل میں سماجی رویوں کی عکاسی کی گئی تھی۔ طوالت کے خوف سے چند ایک ہی شامل کیے گئے ہیں۔)

منور ہاشمی کی غزل میں رومانوی عناصر

نیلم بہادر

۔۔۔ایک حساس رومانوی شاعر ہی اپنے عہد کی ترجمانی کر کے اپنے سماج کے معصوم افراد کے محسوسات کو شعری پیراہن دے کر ان کی دُکھتی رگوں پر مرہم رکھتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جب رومانوی شاعر منور ہاشمی اپنے عہد کی ترجمانی کرتے ''سوچ کے صحرا'' میں پہلی بار قدم رکھتے ہیں تو سماجی ،معاشرتی مسائل اور ''کربِ آگہی'' سے دوچار ہونے پر ''بے ساختہ'' غزل کے بامِ فلک پر نمودار ہو جاتے ہیں۔

''سوچ کا صحرا'' سے ''کربِ آگہی'' اور پھر ''بے ساختہ'' کی جانب اس سفر میں نیند پوری کرنے اور خوابوں کی تعبیر دینے کے لیے منور ہاشمی کو غمِ جاناں اپنی جانب کھینچتا ہے اور غمِ جہاں اپنی جانب۔ وہ فکرِ دل اور فکرِ دنیا کے سمندر میں ڈوب کر وقت کی پیشانی پر اُبھرتے ہوئے زمانے کے تغیرات کو چیلنج سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔

عرصۂ دراز سے انسان تلاشِ حسن میں اس کائنات میں سرگرداں ہے۔ خوب سے خوب تر کی یہ تلاش نہ صرف زندگی بلکہ ادب کو بھی اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ پتھروں کے دور سے آج تک انسانی افکار و نظریات میں مثبت تبدیلی آتی رہی۔ ایک رومانی شاعر زندگی اور کائنات میں حسن کی دریافت سے دراصل ماضی، حال اور مستقبل دریافت کرتے ہیں۔ منور ہاشمی کی غزل میں ماضی کی پرچھائیاں، حال کی الناکیاں اور مستقبل کے خاکے نظر آرہے ہیں۔

حسن مجازی ہو یا حقیقی، توجہ کا مرکز ضرور بنتا ہے۔ حسن کی تلاش میں جب منور ہاشمی ''سوچ کے صحرا'' میں داخل ہوئے تو حسنِ محبوب اور حسنِ فطرت نے انھیں حیات و کائنات کی جیتی جاگتی تصویریں دکھا کر عشق کے جذبے سے ہم کنار کیا۔ فطری مناظر نے منور ہاشمی کے ساتھ اپنا رشتہ کچھ اس انداز سے قائم کیا کہ دونوں کی ہم آہنگی تشبیہات کی صورت میں ہوئی۔ مثلاً صحرا، دل کی ویرانی، پھول، محبوب کا حسین چہرہ، تاریکی، غم و اندوہ، آگ، عشق کی گرمی اور روشنی، امید کی کرن، یہی مناظرِ فطرت ان کے اندر کے احساسات کا اظہار بن کر سامنے آئے۔ خارجی اشیاء میں داخلی جذبات و احساسات کو محسوس کر کے اور مناظرِ فطرت سے گہری وابستگی نے حسن و عشق کی تپش میں اضافہ کیا۔

''سوچ کا صحرا'' کی غزلوں میں حسن و شباب، فطرت کا پُرلطف احساس، جذبات کی فراوانی اور عشق و عاشقی کے معاملات کے بیان نے نہ صرف منور ہاشمی کے فکر کو رومانوی مزاج عطا کیا بلکہ عشق کی گرمی نے ایسا تاثراتی انداز اختیار کیا کہ جس نے جلال و جمال کے تقاضوں کو پورا کیا۔ حسن و عشق کے معاملات اور عشقیہ واردات کے بیان سے انھوں نے غزل کے اندر رنگینی و رعنائی کی ایسی فضا قائم کر دی کہ جس کے دامن میں معاشرتی کرب اور سماجی مسائل اُجاگر ہوتے ہیں۔

منور ہاشمی کا دوسرا شعری مجموعہ ''کربِ آگہی'' ان کے حساس دل کے اس کرب کی پکار ہے جس میں سماج کے

مجبور طبقے کی خواہشات اور تمناؤں کا گلا دبایا گیا ہے۔ زیادتیوں اور ناانصافیوں کے خلاف اُٹھنے والی منور ہاشمی کی آواز غریب عوام کو ان کا حق دلانے کے لیے ہمہ وقت کوشاں ہے۔ ''کربِ آگہی'' کی غزلیں ان کے سینے میں پائے جانے والے اس کرب کی شدت کی آئینہ دار ہیں جو بنی نوع انسان کی زندگی کو مصائب و مشکلات سے دوچار کر کے ان کا جینا حرام کرتی ہے۔ کربِ آگہی کی غزلوں کی گھن گرج سماج کو جھنجوڑ کر بے حسی کے پردے کو اُلٹ دیتی ہے۔

منور ہاشمی کے سینے میں ہمدرد دل دھڑکتا ہے۔ ہمدردی کے جذبے کے تحت عام آدمی کے فکری مسائل کا بار اُٹھائے خندہ پیشانی سے نوجوان نسل کی رہنمائی کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔

غزل میں عشقیہ معاملات کا بیان ہو یا معاشرتی مسائل کا، انھوں نے اپنا مخصوص انداز کبھی اور کسی بھی حال میں نہیں چھوڑا۔ غمِ جاناں ہو، غمِ جہاں ہو یا زندگی سے گلہ، ہمیشہ سچی اور کھری بات کرتے ہیں۔ سچائی کا یہ خاص انداز انھیں دوسرے شعرا سے منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

ذاتی تجربات اور تاثرات کے حق و صداقت سے اظہار بیان نے ''بے ساختہ'' کی غزلوں میں انسانی رویوں کو بے نقاب کیا ہے۔ انھوں نے عاشق اور محبوب کے کرداروں سے یہ بات واضح کی ہے کہ زندگی نشیب و فراز، افسردگی و ملال، غم و خوشی، دکھ درد، مصائب و حوصلے کے سہارے ان سب کا سامنا کیا جا سکتا ہے ورنہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانا مقدر بن جاتا ہے۔ مسلسل محنت سے زندگی کو گلزار بنایا جا سکتا ہے۔

''بے ساختہ'' کی غزلوں سے رومان اور حقیقت کی متوازن روئیں پھوٹتی ہیں جس میں احساس کی شدت، جذبات کی صداقت، حسن و جمال کی کشش، تخیل کی رعنائی اور تجربات کی گہرائی ملتی ہے۔ رومانوی فکر کی تاثیر ''بے ساختہ'' کے ہر شعر سے پھوٹ کر نکلتی ہے۔ یہ تاثیر وقتی نہیں بلکہ پائیدار ہے کیوں کہ احساسِ حسن کی وارفتگی اس میں شامل ہو کر عشقیہ واردات کو جذباتی رنگ دیتی ہے۔

''بے ساختہ'' کی غزلوں میں اُبھرنے والا عاشق روایتی عاشق سے قدرے مختلف ہے۔ وہ زندگی اور حقائق کے قریب ہو کر روایتی رومان کے بجائے فکر و احساس کی لطیف رومانوی فضا سے نئی نسل کے احساسات کو جگاتے ہیں۔ جیسے منور ہاشمی نے عشق و محبت کی۔ خوشبو سے معطر کر کے چار سو پھیلا دیا تو زندگی کے تمام رنگوں کا مرقع بنے ہر دکھ درد، غم مسرت، سچ اور جھوٹ کا مقابلہ جواں مردی سے کرتے ہیں۔

منور ہاشمی اُمید کے آئینے میں روشنی کی کرن دکھا کر دلوں کو تسلی دیتے ہیں مگر تقدیر کے ہاتھوں ہزار ہا تدابیر اختیار کرنے پر بھی جب خواب حقیقت نہیں بن پاتے تو یوں لگتا ہے کہ کچھ خواب ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تعبیریں کبھی نہیں ملا کرتیں۔ حاصل اور لاحاصل کی اس کشمکش کا انسانی زندگی میں اہم کردار رہا ہے۔ نگاہ مست اس جنگ میں ہزار اشکوں کی لڑیاں پروئے مگر دل پر لگنے والے زخموں سے خود کو بچا نہیں سکتی۔ اس کی ہر صدائے غم پر قاری بھی رونے پر مجبور

ہو جاتا ہے۔

شاعر یا ادیب جب خواب دیکھے تو اسے تعبیر دینے کے لیے بے چین رہتا ہے مگر جب وہ اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدل دینے کی بجائے اسے ہوا میں اُڑتا دیکھے تو اس کا دل افسردہ ہو جاتا ہے۔ وہ کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ انسانیت کا کرب، ظالم سماج اور معاشرے کا کرب، جاگیرداروں اور حکمرانوں کے ظلم وستم کا کرب، وطن سے غداری کا کرب، اسلام سے دوری کا کرب، فریب دنیا اور فریب نظر کا کرب، دوستی کے روپ میں چھپے بہروپ کا کرب، سنگدل محبوب اور مظلوم عاشق کا کرب۔ یہ تمام وہ کرب ہیں جو منور ہاشمی نے غزل کی صورت میں پیش کیے ہیں۔

موجودہ صورتِ حال کے بارے میں منور ہاشمی فکرمند ہیں۔ ان کے مطابق آج یہ صورتِ حال ہے کہ ہم منتشر ہو رہے ہیں۔ ہمارے اندر نفاق نے جڑ پکڑ لی ہے۔ ہمارے دشمن ہماری آزادی کے درپے ہیں۔ وہ ہمیں ایک بار پھر غلامی کی زنجیریں پہنانے پر تلے ہیں۔ آج ہم ایک بار پھر سے اپنی تشکیل کے مراحل سے گزر رہے ہیں۔ آج کا دور ہم سے یہ تقاضا کر رہا ہے کہ ہم نفرت کی دیوار گرا کر آپس کے اختلافات بھلا کر ایک نئی قوم بن کر دنیا کے نقشے پر چھا جائیں۔ حالاتِ حاضرہ کے متعلق یہ فکرمندی بلاوجہ نہیں ہے کیوں کہ ہر کرب کو مٹانا ناممکن ہے مگر انھوں نے اس کی شدت کو کم کرنے کے طریقے سکھا دیے ہیں۔ منور ہاشمی معمارانِ قوم سے مایوس نہیں۔ ادب کی خدمت کرنے والی نوجوان نسل کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے وہ پُرامید ہیں کہ اگر ان کی صلاحیتوں کی صحیح سمت میں رہنمائی کی جائے تو ہمارے آنے والی یہ نوجوان نسلیں معاشرے کے مسائل کا سامنا ہمت و بہادری سے کر کے ایک مثالی اور خوش گوار معاشرے کو تشکیل دینے میں کامیاب ہوگی۔

منور ہاشمی نے اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے کی بجائے معاشرے کے اجتماعی خواب کو تعبیر کرنے کے لیے قلم کا سہارا لیا۔ ان کے اندر جذبۂ حب الوطنی ہے۔ اسی جذبے سے سرشار وہ ملکی اور قومی وحدت اور مساوات کے آرزومند ہیں۔ وہ نوجوان نسل کے اندر بھی جذبۂ حب الوطنی پیدا کر کے ان کی صلاحیتوں کی روشنی میں اُردو ادب کی خدمت، قوم کی نئی تشکیل اور پیارے وطن روشن پاکستان کی نئی تعبیر کے خواہاں ہیں۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ ان کے سارے خواب شرمندۂ تعبیر ہو کر سامنے کھڑے ہوں گے۔ (ان شاءاللہ) وہ بے حسی کی ان تیز ہواؤں میں دلوں میں احساس کا چراغ فروزاں کرنے کا پختہ عزم لیے ہوئے ہیں۔ جس طرح غزل کے اندر رومانیت کی روایت منور ہاشمی کے تذکرے کے بغیر ادھوری ہے، بالکل اسی طرح ان کے افکار نہ صرف رومانیت کے تقاضے پورے کرتے ہیں بلکہ ان کا اسلوب بھی ان تقاضوں پر پورا اترتا ہے۔ وہ اپنی تحریر میں رنگینی پیدا کرنے کے لیے خوب صورت الفاظ کا استعمال کے اپنے اسلوب کو مزید حسن اور نکھار عطا کرتے ہیں۔ وہ اشعار کو جذبات کی زبان سے پُرلطف بناتے ہیں کیوں کہ جذبات اور احساسات جس قدر گہرے اور عمیق ہوں گے، اتنے ہی رنگین بیان بھی ہوں گے۔

منور ہاشمی کی غزل میں زندگی ہو یا عشق کی رنگینیاں ،فطرت کے رازوں سے پردہ ہٹانا ہو یا محبوب کے حسن و جمال کو بے نقاب کرنا ہو۔ مایوسی میں اُمید کی کرن ہو یا غم کے نشاطیہ پہلو دکھانا ہو، ان سب کے ساتھ ساتھ سوز وگداز، تغزل، نغمگی، غنائیت، رمزیت، ایمائیت، اختصار بیانی، جذبات واحساسات، تاثرات وکیفیات، عشقیہ انداز، حسن و جمال سب کچھ موجود ہیں جو غزل کو صحیح معنوں میں جاندار اور دلچسپ بناتے ہیں۔ منور ہاشمی نے یہ سارے رنگ غزل کو دے کر رومانیت کا حق ادا کر دیا ہے۔ انھوں نے غزل میں رومانیت کے مثبت پہلو اُجاگر کیے ہیں۔ ان کے ہاں رومانیت خیالی دنیا کی سیر نہیں بلکہ وہ عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ایک فعال اور خوشحال معاشرے کے خواہاں ہیں۔ انھوں نے ایک ایسے مثالی معاشرے کا خواب دیکھا ہے جہاں فرد کی بالادستی ہو، مظلوم طبقے کے جذبات واحساسات کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ عدل وانصاف ہو، سب کو مساوی حقوق ملیں، انھوں نے معاشرے کی کج روی کے خلاف آواز اُٹھائی ہے اور یہ آواز سماعتوں سے ٹکرا کر دلوں میں اُتر رہی ہے۔

منور ہاشمی کی شہرت کے کئی گوشے ہیں جو عام نظروں سے اوجھل ہیں۔ جنھیں منظرِ عام پر لانے کی از حد ضرورت ہے۔ اتنے عظیم شاعر پر نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ ہمسایہ ملک (بھارت) میں بھی جامعات کے اندر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیقی کام جاری ہیں۔ ان پر جو مقالات تحریر کیے جا رہے ہیں، وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ منور ہاشمی نے نہ صرف آج کے دور میں دنیائے ادب میں اپنا لوہا منوایا ہے بلکہ آنے والے وقتوں میں غزل کا یہ بے تاج بادشاہ بالخصوص غزل سے لگاؤ رکھنے والوں کے دلوں پر راج کرے گا۔

زمانے بھر کو خبر ہے کہ میں منوّر ہوں
میرا وجود ضروری ہے روشنی کے لیے
میں نے تجھے شباب کے سب رنگ دے دیے
تجھ سے ہوا تھا پیار کا پیمان اے غزل!

ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزل میں تخلص کا ذومعنی استعمال

شمسہ نورین

ڈاکٹر منور ہاشمی کا شمار عہدِ حاضر کے صفِ اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔ شاعری اور خصوصاً صنفِ غزل آپ کی پہچان کا بنیادی حوالہ ہے تاہم وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین محقق، نقاد، ماہرِ تعلیم اور سیرت نگار بھی ہیں۔

آپ صاحبِ اُسلوب شاعر ہیں۔ آفاقی انسانی اقدار آپ کا اہم موضوع ہیں۔ غزل میں ان کی پہچان اور انفرادیت کے کئی زاویے ہیں تاہم یہاں جس زاویے کو بطورِ خاص زیرِ بحث لایا جائے گا، وہ تخلص کا ذومعنی استعمال ہے۔

تخلص عربی زبان کا لفظ ہے جس کا لغوی معنی ہیں ہے اختصار، چھٹکارا، خلاص۔ (۱) اصطلاحی معنوں میں تخلص وہ مختصر شاعرانہ نام ہوتا ہے جو شاعر مقطع میں استعمال کرتا ہے تاہم ہر غزل کے آخری شعر میں تخلص استعمال کرنا شرط نہیں ہے۔

''وہ قلمی مختصر نام جو شاعر یا ادیب اپنے اصل نام کے بجائے رکھ لے۔'' (۲)

تخلص کی ابتدا ایرانی شعرانے کی۔ ایرانی ادب ہی سے یہ روایت اُردو ادب میں داخل ہوئی۔ ۱۶۱۱ء میں اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ کی کلیات میں تخلص استعمال کیا گیا۔ کم وبیش تمام اُردو شعرانے اپنی شاعری میں تخلص استعمال کیا، تاہم شعروادب کی دنیا میں بعض شعرانے اس بنا پر انفرادیت حاصل کی۔ کہیں اس انفرادیت کی وجہ ایک منفرد تخلص ہے تو کہیں تخلص کا ذومعنی، پہلودار استعمال ہے۔

جگر مرادآبادی، ساحر لدھیانوی اور فانی بدایونی نے اپنے اصل نام کے بجائے تخلص ہی سے شہرت حاصل کی۔ تخلص کے ذومعنی پہلودار استعمال کی اہم مثال مومن خان مومن ہیں۔ انھوں نے تخلص کے ذومعنی استعمال کی ایک توانا فنی روایت قائم کی۔ انھوں نے جگہ جگہ اپنا تخلص ایسے انداز میں شعر میں سمو دیا کہ اس سے معنویت پیدا ہوگئی۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

ہرگز نہ رام وہ صنمِ سنگ دل ہوا
مومن ہزار حیف کہ ایماں عبث گیا (۳)

چپہم تجود ہائے صنم پر دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں (۴)

مقطع میں تخلص کا لغوی معنی میں استعمال کے حوالے سے پرنم الہٰ آبادی کا نام بھی قابلِ ذکر ہے:

چشمِ پُرنم سے جدائی میں کسی کی پرنم
اشکباری ہے کہ ساون کی جھڑی ہو جیسے (۵)

تخلص کے ذومعنی استعمال کی جو فنی روایت مومن خان مومن سے چلی، وہی فنی رویہ ہمیں عہدِ حاضر

میں ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزل میں بھرپور انداز میں نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر منور ہاشمی کا تخلص ''منور'' ہے۔ منور کے معنی ہیں ''روشنی دیا گیا، نورانی، روشن، چمکدار۔''(۶)

ہر وہ جسم جو خود براہ راست روشنی کا منبع ہو، جیسے سورج، ستارے یا کسی روشن شے کے سہارے کی ضرورت نہ ہو، وہ منور کہلائے گی۔ اسی طرح وہ اجسام بھی جو دوسروں سے روشنی مستعار لیتے ہیں اور پھر خود بھی روشن ہیں، وہ بھی منور ہی کہلائیں گے۔ اس کی مثال چاند ہے جو سورج سے روشنی مستعار لیتا ہے اور پھر منور نظر آتا ہے۔ ہر منور شے خود روشن ہونے کے ساتھ ساتھ ہر سمت بساط بھر اُجالا بانٹتی بھی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کا تخلص روشنی کا استعارہ بن کر سامنے آیا۔ وہ اپنے تخلص کے وسیلے سے ذو معنویت پیدا کرتے ہوئے معنی کی کئی پرتیں وا کرتے چلے جاتے ہیں اور جہانِ معنی کے اَن گنت مناظر دکھاتے ہیں۔ آپ کا تخلص بہت سی غزلیات اور نعتیہ کلام میں بھی اپنے لغوی معنوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ آپ اپنے مقطع میں تخلص کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایسی فضا قائم کرتے ہیں کہ تخلص اپنے لغوی مفہوم سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ نعتیہ کلام سے ذو معنیاً استعمال کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

کاش ہوجائے کوئی رات منوّر میری
خواب درخواب تیرا روئے منور دیکھوں (۷)
میں منوّر ہوں فقط ایک کرن سے اُس کی
نور جو آپ کے دامن سے بکھرتا آیا (۸)

یہاں لفظ منور تخلص ہونے کے ساتھ ساتھ نورِ رسالت سے اپنی نسبت کو ظاہر کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ نورِ فیض جس سے تمام عالم جگمگا رہا ہے، اسی نور کی ایک کرن سے شاعر بھی اپنے آپ کو منور پاتا ہے۔ چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں:

پاک نعلین سے مس ہو کے منوّر ٹھہرے
آپؐ نے کیسا شرف خاک کے ذرّوں کو دیا (۹)
دل منوّر جو ہوا عشقِ محمدؐ کے طفیل
لکھنے والا اسے کعبہ وحرم لکھتا ہے (۱۰)
آپؐ کا جب ظہورِ مقدس ہوا
پھر منوّر ہوئی محفلِ زندگی (۱۱)
یہ چاند اورتارے منوّر نہ ہوتے
اگر ضوفشاں مہرِ تاباں نہ ہوتا (۱۲)

نعتِ محبوب منوّر کیے جائے مجھ کو
میں جدھر جاؤں مرے ساتھ اُجالے جائیں (۱۳)
کوئی دن ہو کوئی شب ہو کوئی ساعت کوئی لمحہ
ترے حسنِ تصور سے مری دنیا منوّر ہے (۱۴)

یہی انفرادی فنی رویہ ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزل میں پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے، جو نہ صرف ان کی غزل کو انفرادیت اور تشخص کو جلا بخشتا ہے بلکہ مقطع کی اثر آفرینی میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ کہیں ان کا تخلص روشنی کا ایک ایسا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے جس کا انکار چاہ کر بھی ممکن نہیں، نہ اس روشنی کو مٹایا جا سکتا ہے، نہ جھٹلایا جا سکتا ہے:

گر حرفِ غلط ہے تو منور کو مٹا دو
لیکن یہ اُجالا جو اسی نام سے آیا (۱۵)

کبھی وہ ایسی روشنی بن کر سامنے آیا جس کا اپنا وجود پگھل کر رفتہ رفتہ معدوم ہو جاتا ہے لیکن اندھیروں کو غالب نہیں آنے دیتا۔ یہاں صورتِ شمع پگھل کر روشنی دینا ان کے جذبۂ ایثار کی عکاسی کرتا ہے۔ خود کو مٹا کر دوسروں کو جلا بخشنے کے جذبے کی ترجمانی کرتا ہے۔

صورتِ شمع پگھلتا رہوں لمحہ لمحہ
میں منوّر ہوں اندھیرا نہیں چھانے دیتا (۱۶)

کہیں وہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی تفسیر بن کر سامنے آتے ہیں، وہ اپنے وجود میں اُتر کر اپنی پہچان کرتے ہیں اور پھر دوسروں کو اس آگہی کے تجربے سے آشنا کرتے ہیں:

زمانے بھر کو خبر ہے کہ میں منوّر ہوں
مرا وجود ضروری ہے روشنی کے لیے (۱۷)

کہیں وہ اپنے محبوب کے تصور سے اپنی ذات میں اُجالے اُترتے دیکھتے ہیں اور اپنے ماحول کو روشن ہوتا دیکھتے ہیں اور یوں معنی کی ایک نئی پرت سے اظہار کا ایک نیا زاویہ تراشتے ہیں۔

کیا تصور تھا جو پھیلا چار سُو
لمحہ بھر میں گھر منوّر ہو گیا (۱۸)

کہیں وہ اپنے نام کی لاج نبھانے کے لیے روشنی کی تلاش وجستجو کو خود پر لازم قرار دیتے ہیں:

تڑپ رہا ہوں اُسی دن سے روشنی کے لیے
کہ جب سے نام منوّر کسی نے رکھا ہے (۱۹)

ڈاکٹر منور ہاشمی ایک وسیع المطالعہ شاعر وادیب ہیں۔ شعر وادب کی روایت پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ شعر وادب کے تابندہ ستاروں کی ضو سے خوب واقف ہیں اور وہ خود انھیں روایتوں اور روشنیوں کے امین بھی ہیں اور قاسم بھی:

اک ستارہ ہے منوّر یہ جبینِ فن پر
کیسے ممکن ہے مرا نام مٹایا جائے (۲۰)

روایت کے تسلسل کا عکاس ایک اور خوب صورت دل میں اُتر جانے والا شعر ملاحظہ کیجیے:

میرؔ سے لے کر منوّر تک فقط رسوائیاں
عشق رکھتا ہے عداوت کس قدر سادات سے (۲۱)

روشنی کے کچھ اپنے خواص ہیں۔ روشنی کا راستہ مستقیم ہے۔ اس کے راستے میں پیچ وخم نہیں۔ اس کا پھیلاؤ ہر سمت ہے۔ جہاں اس کے راستے میں رکاوٹ آئے، یہ منعکس ہو کر اپنی روشنی مخصوص سمتوں میں پھیلاتی ہے۔ مختصراً روشنی اپنے وجود کا اظہار ہر صورت میں کرتی ہے۔

روشنی لے کر منوّر میں گیا کس کس کے گھر
غیر ہو یا کوئی اپنا یہ کبھی دیکھا نہیں (۲۲)

ڈاکٹر منور ہاشمی نے مقطع میں اپنے تخلص کی کشش اور اثر آفرینی کو تخلص کی ذو معنویت سے دو چند کر دیا ہے۔ تخلص کی مناسبت سے عمدہ مضامین باندھے گئے۔ تخلص کی پہلو داری نہ صرف ان کی فنی پختگی کا ثبوت ہے بلکہ ان کے احساس وجذبات کی بھی بھرپور عکاسی ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر منور ہاشمی رجائیت پسند اور حقیقت پسند شاعر ہیں۔ وہ لمحۂ کرب کو بھی اپنی طاقت بنا لیتے ہیں اور اس سے حوصلہ کشید کر لیتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔الحاج مولوی فیروز الدین،فیروز اللغات،اُردو جامع،فیروز سنز،لاہور،ص ۳۵۰۔

۲۔ایضاً۔

۳۔مومن خان مومن،کلیات مومن،مرتبہ کلب علی فائق،جلد اول،مجلس ترقی ادب لاہور،۱۹۸۳ء،ص ۱۶۰۔

۴۔ایضاً،ص ۴۲۔

۵۔پرنم الٰہ آبادی،پھول دیکھے نہ گئے،مدنی پبلی کیشنز ایبٹ آباد،سن ندارد،ص ۱۱۷۔

۶۔فیروز اللغات،ص ۱۳۹۸۔

۷۔منور ہاشمی،لوح بھی تو قلم بھی تو،استعارہ،اسلام آباد،۱۹۹۸ء،ص ۴۸۔

۸۔ایضاً،ص ۵۳۔　۹۔ایضاً،ص ۵۷۔　۱۰۔ایضاً،ص ۵۸۔　۱۱۔ایضاً،ص ۲۷۔

۱۲۔ایضاً،ص ۸۰۔　۱۳۔ایضاً،ص ۸۴۔　۱۴۔ایضاً،ص ۸۷۔

۱۵۔منور ہاشمی،غزل اے غزل(کلیات)،دنیائے پبلی کیشنز اسلام آباد،۲۰۱۶ء،ص ۳۳۔

۱۶۔ایضاً،ص ۱۴۴۔　۱۷۔ایضاً،ص ۱۵۳۔　۱۸۔ایضاً،ص ۱۶۳۔　۱۹۔ایضاً،ص ۱۶۹۔

۲۰۔ایضاً،ص ۱۷۳۔　۲۱۔ایضاً،ص ۵۹۔　۲۲۔ایضاً،ص ۱۸۵۔

Neend Poori Na Hui

Dr. Amjad Pervaiz

(ادارتی نوٹ: مضمون ہذا کو اُردو کی ترتیب سے پڑھا جائے)

The poetry book titled Neend Poori Na Hui by Prof. Dr. Munawar Hashmi has been printed in India, perhaps because Munawar has been Jeddah for a long time and has been exposed to international intellectual community including those from India involved with Urdu literature. Professor Munawar Hashmi has been teaching in Pakistani International Community School, Jeddah since few years. He is due back to return to Pakistan at the time of writing this piece. He has been the President of Alami Urdu Markaz, Jeddah and this organization held a send off function in his honour on February 02 in Jeddah and this reviewer happened to be the Chief Guest of this function. All the speakers spoke high about Professor's contribution in the domains of literature and teaching. It was during this function that the distinguished Professor presented his captioned poetry book to this reviewer. It was there that it came to the knowledge of those present that he has written eight books earlier to this one. These are titled 'Soch Ka Sehraa', 'Besakhta', 'Karb-e-Agahi' in poetry, 'Loh Bhi Tu Qalam Bhi Tu' (Naatia Poetry) and 'Nakhalistan' (Hikayaat), 'Noor-e-Hidayat' (Seerat), 'Pardesi Ki Yaad' (Novelette) and 'Amali Sahafat' (Criticism). Prof. Hashmi is also editor of literary journal 'Duniya-e-Urdu' and editor-in Chief of 'Al-Qalam', Jeddah. Iqbal has been Hashmi's favourite topic in which he has done lot of research. He has also obtained doctorate in literature. All the intellectuals who have contributed their comments on Hashmi's poetry however point out towards one fact that many have churned out poetry in Ghazal format lately but the only thing that makes Hashmi's Ghazals different from those of his contemporaries is because of an independent identity he has been able to create for himself. Let us see if Iftikhar Arif, Amjad

Islam Amjad, Dr. Waheed Qureshi and Qateel Shifai who agree independently on their impressions to this point, are correct in their assessment of Hashmi's poetry, especially in the field of Ghazal Saying.

The Matla'a of Hashmi's Ghazal from where he has picked the title of the book under review is 'Aik Hi Mas'ala Teh Umer Hul Na Hua/ Neend Puri Na Hui Khwaab Mukammal Na Hua' perhaps is the story of Hashmi's lifetime. It can be the story of many of us that we mean to do a lot in order to realize what we dream and lay awake for proper sleep to come for that phenomenon to happen. Munawar's delicacy of expression erupts in another couplet of the same Ghazal. It says 'Rashini Chan Key Terey Rukh Ki Na Mujh Tak Puhnchey/ Aik Deewar Hui Yeh Koi Aanchal Na Hua'. Munawar complains to the way his beloved is wearing her veil as it bars the radiance of her silhouette. Munawar seems to have learnt a lot from life as he desires to eliminate double crossers from the list of enemies in order to make peace with his opponents. He says 'Sab Dushmanon Ko Dost Bananey Key Wasetey/ Lazim Hey Sab Munafaqon Ko Mustarad Kar Dain'. It is his because of experiences of life that Munawar's idiom is astringent on occasions. However he does not lay aside the comportment of human being aside on the basis of which he is known as 'Ashraf ul Makhlooqaat' despite that he lay awake many nights wondering about the bitterness in life, both within him and outside. That is why he says 'Yeh Ratjagey Key Siwa Kutch Aur Nahin/ Hayaat Deeda-e-Tar Key Siwa Kutch Aur Nahin'. This reviewer therefore does not believe in the theory forwarded by Elliot that the creation should be oblivious of the personality of the creator and agree with the theory offered by Wazir Agha who believes that a link between the two cannot be ignored. Munawar not only refers to quality of life in his poetry but also tries to discover the fabric in his poetry. Professor Manazar Aashiq Harganavi, Professor in Bhagalpur University, India also refers to this point of view in his prologue to the book under review.

Dr. Ahsan Jamal observes that Munawar's Ghazal is so strong that after reading the whole book, this impressions further gains potency. In order to enjoy the creation of a poet or writer, it is essential that one is aware of the background in which he/she he hails from and the era he has lived in. For example, the poetry of century ago poet Akbar Allahabadi can only be understood if we are aware of the history of that era in which he said his poetry which was in the backdrop of the intellectual poverty of the residents of the subcontinent and the way the British availed the opportunity of capturing the riches of this area and then leaving India high and dry. Similarly in order to enjoy Munawar's poetry one has to understand his struggles of lives at home and in the Kingdom of Saudi Arabia. Otherwise he would not have come out with a couplet such as 'Hasratein, Nakaamian, Maayusian, Mehroomian/ Bedili, Bechargi, Afsurdagi Aei Zindigi' wherein he speaks of all the disillusionments he met with in his life. He should however not be termed as a cynic but should be appreciated because he has learnt from such experiences in his life as that is what that makes him different from his contemporaries.

مختصر آرا:

ڈاکٹر وحید قریشی

منور ہاشمی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ غزل کی روایت ایک توانا اور قدیم روایت ہے، جس میں اپنی الگ پہچان ظاہر کرنا قریب قریب ناممکن ہو چکا ہے۔ منور ہاشمی نے اس روایتی لب و لہجے میں اپنی انفرادیت ظاہر کردی ہے۔ وہ روایت پرست نہیں ہے، اس لیے اس نے غزل کے بندھے ٹکے لہجے میں بھی اپنی شخصیت کا ایک الگ رنگ دکھایا ہے۔

سب کی آواز میں آواز ملا رکھی ہے
اپنی پہچان مگر ہم نے جدا رکھی ہے

غزل کے روایتی سانچوں میں عموماً ہمارے شاعر اپنے آپ کو گم کر کے اپنی شعری توانائی کو بحال نہیں رکھ پاتے۔ منور ہاشمی حرماں نصیبی کا شاعر ہے لیکن انسانی نفسیات سے گہری واقفیت کی بنا پر اس نے جذبوں کی جو دنیا آباد کی ہے، وہ ہماری عمومی دنیا سے مختلف ہے۔ اس کا طرزِ احساس جدیدیت کی ایسی چمک رکھتا ہے جس نے ''بے ساختہ'' کی غزلوں کو ایک نیا حسن، نیا آہنگ اور نئی طرزِ فکر سے آشنا کیا ہے۔

قتیل شفائی

منور ہاشمی کا نام اور کلام کسی کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ وہ ایک مدت سے شعر و سخن کے نئے نئے گلدستے پیش کر رہے ہیں اور ان سے کبھی یہ شکایت نہیں ہوتی کہ ان کے کسی شعری مجموعے میں رنگ و بو کی کمی ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام ''بے ساختہ'' بھی ہماری تمام تر توقعات پوری کر رہا ہے کیوں کہ منور ہاشمی غزل کے مزاج اور اس کے تقاضوں سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ انھیں کلاسیکی شعریات سے لے کر عصری لہجے کے اسرار و رموز سے پوری طرح آگاہی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا کلام بالکل نئے اسلوب اور اچھوتے مضامین کا حامل ہے اور اس کلام کی مسلسل تیز گامی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں جس منزل کا نشان بن چکا ہے، وہ اس کے قریب ہیں۔

پروفیسر سلیم خلجی

منور ہاشمی بیک وقت جدت پسند اور رومان پرور شاعر ہے۔ اُردو غزل گو شاعروں کی طویل قطار میں وہ بڑے فخر اور طمطراق کے ساتھ عشرۂ رواں کے بہترین شاعر کی حیثیت سے ایستادہ ہے۔ ''بے ساختہ'' کی غزلوں نے بجا طور پر اُردو ادب کو وقار اور اعتبار بخشا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر جاذب قریشی

''بے ساختہ'' کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ منور ہاشمی کی شہرت بلاوجہ نہیں ہے۔ان کی خوب صورت شاعری ہی نے انھیں شہرت کے بامِ عروج پر پہنچایا ہے۔اس کتاب کا ایک ایک شعر قابلِ تعریف ہے۔''بے ساختہ'' کے گلشن میں فکر وخیال کے جو دلکش پھول کھلے ہوئے ہیں۔یہ کمال منور ہاشمی ہی کا حصہ ہے

☆☆☆

ڈاکٹر سید محمد سلیم

منور ہاشمی کا مجموعہ واقعی ''بے ساختہ'' ہے۔انھوں نے شعر کے قالب میں حقیقتوں کو بسایا ہے۔انھوں نے غزل کی صنف کو اپنایا جہاں اساتذہ کو تنگی کی شکایت رہی، انھوں نے اس کے سنگلاخ ماحول میں وہ پھول کھلائے ہیں کہ جن کی خوشبو سے روح معطر اور آب وتاب سے فکر منور ہو گیا۔انھوں نے الفاظ کا جس چابکدستی سے استعمال کیا ہے۔وہ ایسے فنکار کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرتا ہے جو سخت چٹانوں سے حسین وجمیل اور نازک مجسمے تراشتا ہے۔ذہن کو جلا اور فکر کو غذا مہیا کرتا ہے۔ان کا کینوس وسیع وعریض ہے جس پر قوسِ قزح کے تمام رنگ جلوہ افروز ہیں اور اس سے جو نقوش ابھرتے ہیں وہ کٹھن زندگی کی پُر خار راہوں میں جادۂ زندگی مہیا کرتے ہیں۔تاریکیوں میں نور کا ہالہ بناتے ہیں اور نشانِ راہ مہیا کرتے ہیں۔الغرض ان کی شاعری ایک ایسا مقناطیس ہے جو فکر وخیال کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔''بے ساختہ'' یقیناً فکر وفن کا ایک حسین شاہکار ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر توصیف تبسم

منور ہاشمی کا شعر رومان اور حقیقت کے سنگم پر طلوع ہوتا ہے۔اس کا تصورِ عشق، تصورِ محبوب ومحب کیا ہے؟ میرے خیال میں عشق منور ہاشمی کے ہاں محض ایک شدید داخلی کیفیت کا نام نہیں، ایک نصب العین اور ایک اُسلوبِ حیات ہے۔وہ دوٹوک بات کرنے کا قائل ہے۔اس کے یہاں ابہام کی کیفیت نہیں ملتی۔یہی وجہ ہے کہ اس کے اشعار پڑھنے اور سننے والوں کو براہِ راست متاثر کرتے ہیں۔وہ اپنی شاعری کے بارے میں کہتا ہے:

منوّر میرے فن میں تازگی ہے
میں خوشبو کی طرح زندہ رہوں گا

ہم شاعر کی اس رائے سے اختلاف نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

ایک عظیم باپ کے عظیم فرزند منور ہاشمی کے شعری مجموعہ کا نام ہی اس شعری کیفیت اور سرشاری سے ہم کنار کر دیتا ہے جو سچے وعدے جیسی شاعری سے پھوٹتی ہے۔ بے ساختگی ہی وہ جوہر ہے جو لفظ اور خیال کو ترفع عطا کرتا ہے۔ ترفع کے بغیر شاعری اس طرح ہے جیسے روح کے بغیر بدن۔ میں ایسی زندہ شاعری کرنے پر منور ہاشمی کا شکر گزار ہوں۔

☆☆☆
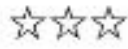
افتخار عارف

منور ہاشمی ہماری جدید ترین غزل کے نمایاں اور مختلف طرزِ احساس رکھنے والے نمائندہ شعرا میں بہت اہم گردانے جاتے ہیں۔ یہ ان آوازوں میں سے نہیں جو شور میں گم ہو جانے کے خطرے سے دو چار ہوں کیوں کہ یہ آواز اپنی الگ پہچان بنا چکی ہے۔ اتنی آوازوں کے ہجوم میں ہم کسی آواز کی طرف یوں ہی تو متوجہ نہیں ہو جاتے۔ کوئی جادو ہوتا ہے جو ہمیں کھینچتا ہے۔ کوئی خاص منظر ہوتا ہے جو ٹھہرنے پر مجبور کرتا ہے۔ کوئی پھوار کہیں دھیرے دھیرے نغمہ خواں ضرور ہوتی ہے جو ٹھہرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ منور ہاشمی تازہ خیال، تازہ فکر اور تازہ دم شعرا کی صفِ تازہ تر کی نمایاں تر آواز ہے۔ غزل میں لفظ لکھے نہیں جاتے، ان کو روشن کیا جاتا ہے اور منور ہاشمی لفظ کو روشن کرنے کے ہنر سے آگاہی رکھنے والوں میں ایک بہت اہم نام ہے۔

☆☆☆
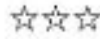
امجد اسلام امجد

غزل کہنے والوں کی بھیڑ میں کم چہرے ایسے ہیں جو پہچان میں آتے ہیں اور وہ تو بہت ہی کم ہیں جو اس گزراں منظر میں اپنے لیے کوئی مستقل جگہ بنا پاتے ہیں۔ منور ہاشمی کی شاعری میں اس کی جذباتی زندگی کے ساتھ ساتھ عصری شعور کی جھلک قدم بہ قدم چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس کا چہرہ اس بہت بڑے ہجوم میں نہ صرف قابل شناخت ہے بلکہ ایک اہم مقام کا حامل ہے۔

☆☆☆
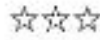
ڈاکٹر منور ہاشمی

بطور اقبال شناس

منور ہاشمی کی اقبال شناسی

ڈاکٹر تحسین بی بی

اقبال شناسی اور اقبال فہمی کی تحریک تقسیم ہند سے بہت پہلے شروع ہوئی۔ اقبال سے دلچسپی رکھنے والوں میں ایک نیا شعور بیدار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نیا رجحان بھی پیدا ہوا۔ علامہ اقبال کے فکر و فن اور شخصیت کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرتے ہوئے جن شاعروں، دانشوروں، مفکروں، محققوں اور ناقدین نے اقبال شناسی کی اس تحریک کو منظم اور مربوط طریقے سے آگے بڑھانے میں اہم تاریخی کردار ادا کیا۔ اور اقبال کی شاعری کی روح میں اتر کر ان کے صحیح مقام کا تعین کیا ان اقبال شناسوں میں سے ڈاکٹر منور ہاشمی بھی ایک ہیں۔ منور ہاشمی نے اقبال کا جزوی اور کلی دونوں حیثیتوں سے جس باریک بینی اور انہماک سے مطالعہ کیا ہے اس کی مثال اقبالیاتی ادب میں کم ہی ملتی ہے۔

منور ہاشمی شاعر، ناقد، دانشور، عالم کے ساتھ ساتھ ماہر اقبالیات بھی ہیں۔ اقبال شناسی اور تحقیق و تنقید کے سلسلے میں موصوف اقبالیاتی ادب میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کی اقبال شناسی کو ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں سراہا جاتا ہے۔ اقبالیاتی مطالعہ کے سلسلے میں منور ہاشمی کا کام مجموعی طور پر تحقیقی نوعیت کا ہے۔ انہوں نے اقبالیات کے مخفی گوشوں کو کھوجنے اور اجاگر کرنے میں محققانہ بصیرت، وقتِ نظری اور تبحر علمی کو بڑی لگن کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

منور ہاشمی کی تصنیف ''فیضِ اقبال'' اقبال شناسی کے حلقہ میں ایک مفید اضافہ ہے کیونکہ اقبال پر تحقیق کرنے والے محققین کے لیے یہ بڑی کارآمد کتاب ہے۔ جو فکر انگیز، معلوماتی اور تحقیقی و تنقیدی نوعیت کی حامل ہے۔ منور ہاشمی کی یہ کتاب نومبر ۲۰۱۸ء میں تیسرا رُخ پبلشرز اسلام آباد سے شائع ہوئی ہے۔ ۹۷ صفحات پر مشتمل اس تصنیف میں مختلف مضامین شامل ہیں۔ منور ہاشمی نے اس کا انتساب ''محبِ اقبال'' کے نام کیا ہے۔ اس کا پیش لفظ بعنوان ''اقبال اور فیضِ اقبال'' کے نام سے خاور چودھری نے لکھا ہے۔ جس میں انہوں نے اقبال کی شعری فکر اور ان کے نظریات و تصورات پر تفصیلی بحث کی ہے۔

> '' نظری اعتبار سے اقبال کا تصورِ مذہب، تصورِ فطرت، تصورِ اخلاق، تصورِ تمدن اور فلسفہ، استقبال نہایت اہم رہے ہیں۔ انہوں نے فکری سطحوں پر پوری فصاحت اور بلاغت کے ساتھ ان تصورات کو پیش کیا۔''

اس کے ساتھ ہی خاور چودھری نے اقبال شناسوں کی علمی و ادبی خدمات کے آغاز و ارتقا اور روایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منور ہاشمی کو بطور اقبال شناس متعارف کروایا اور اقبال کے کلام کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں منور ہاشمی کی ان خدمات کو سراہا ہے جو کہ قابل اعتراف ہیں۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''شارحین اقبال کی ایک کہکشاں ہے۔ جس کا ہر رکن اپنی جگہ اہم ہے انہی میں پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب ہیں۔ انہوں نے

اقبال کی تفہیم وتشریح کا جو پیمانہ برتا، وہ جدا بھی ہے اور قابل لحاظ بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اقبال شناسی ایک مستحکم روایت کی صورت میں اگر نسل نو تک منتقل ہو رہی ہے تو اس میں موصوف کا قابل قدر حصہ ہے۔"

آخر میں خاور چودھری نے اس مجموعے میں شامل مضامین پر تبصرہ کیا ہے اور اقبال شناسی کے میدان میں ان کی وقعت و جامعیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب " فیضِ اقبال" کے شروع میں ڈاکٹر احسن جمال کا ایک تعارفی مضمون "شاعر، محقق اور نقاد پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی" کے نام سے شامل ہے، جس میں ڈاکٹر احسن جمال نے منور ہاشمی کے فن بالخصوص ان کی اقبال شناسی کا تذکرہ کیا کہ اقبال کی کثیر الجہات اور خاص کر ان کی علمی، سماجی اور فلسفیانہ حیثیات کا غائر مطالعہ منور ہاشمی کی اولین ترجیح ہے۔ چنانچہ وہ اپنے تحقیقی وتنقیدی کام کو لے کر منزل اول کو طے کر کے ستاروں سے آگے جہانوں کی یافت کا عزم رکھتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر احسن جمال:

"پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کا انداز تحقیق اور انداز تنقید اچھوتا اور قابل توجہ ہے۔ انہوں نے شرح اقبال کا حق ادا کر دیا ہے۔"

اس مجموعے میں کل آٹھ مضامین شامل ہیں۔ جن میں سے منور ہاشمی نے تین مضامین اقبال کے انقلاب آفریں اور حکمت آمیز فکر و فن پر روشنی ڈالی ہے۔ فکرِ اقبال کے حوالے سے تین مضامین یہ ہیں:

۱۔ اقبال کا تصور فطرت ۲۔ شکوہ، جواب شکوہ۔۔۔ دعوت فکر

۳۔ دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر

ان مضامین میں اقبال کے فکر و فن اور حیات و ممات کے ضمن میں ان فکری پیمانوں کا احاطہ کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ اور ان سرچشموں کی وضاحت کی ہے جن سے اقبال سیراب اور فیض یاب ہوئے ہیں۔ اقبال کی فلسفیانہ یا مبلغانہ حیثیت تسلیم شدہ ہے۔ اقبال کی عظمت کا سراغ ان کی شعری انفرادیت، جامعیت اور قوت ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ جن سے بہت سے شعرا و ادبا نے فیض پایا اور ان کے اثرات سے اپنے فن کو جلا بخشی ہے اس حوالے سے کتاب میں شامل پانچ مضامین

۱۔ اقبال احمد سہیل۔۔۔ اقبال کا مخالف بھی پیرو بھی

۲۔ اقبال کا فلسفۂ خودی اور ڈاکٹر شریعتی کی توضیحات

۳۔ حسرت موہانی پر اقبال کے اثرات

۴۔ فراق کی شاعری پر اقبال کے اثرات

۵۔ جوش کی غزلوں پر اقبال کے اثرات

اقبال کے فکر و فن کے متعلق خواہ وہ اقبال کی غزلوں کی موضوعیت کا مسئلہ ہو یا اقبال کی نظموں کے ساختیاتی پہلو کا تعلق ہے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ نقادانِ اقبال ہی کو نہیں پرستارانِ اقبال کو بھی دعوت فکر دیتا ہے یہ کسی بھی تحقیقی

وتنقیدی مضمون کی بہت بڑی خوبی ہے۔

اقبال شناسوں کی علمی وادبی خدمات اقبالیاتی خزینۂ ادب کا بیش بہا اضافہ ہے۔زیرِ نظر مجموعہ ''فیضِ اقبال'' بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جس میں منور ہاشمی نے اقبال کی شاعری ان کی فکر وفلسفہ او نظریات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔منور ہاشمی نے مضمون ''اقبال کا تصورِ فطرت'' میں فطرت کا تعارف اور اردو شاعری میں فطرت نگاری کی روایت کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ فطرت نگاری کو اردو شاعری میں امیر خسرو سے لے کر دورِ حاضر تک بڑے بڑے شعرا نے برتا ہے۔جن میں اقبال کا نام بھی سرِ فہرست ہے۔اقبال نے لفظ فطرت کو کئی معنوں میں استعمال کیا ہے۔اس طرح بعض دوسرے الفاظ کو بھی فطرت کے معنوں میں استعمال کرتے ہوئے زیادہ تر توجہ فطرت کے خارجی مظہر ہونے اور انسانی نفسیات سے اس کی وابستگی پر دی ہے۔اس حوالے سے منور ہاشمی نے اقبال کی اہم نظموں سے مثالیں بھی دی ہیں جن میں'' انسان اور بزمِ قدرت، نوائے غم، تنہائی، ایک شام، انسان اور خدا'' شامل ہیں۔بقول اقبال:

فطرت بے ہوش ہو گئی ہے
آغوش میں شب کے سو گئی ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا

منور ہاشمی نے اقبال کے تصورِ فطرت کو ان کی نظموں کے ساتھ ساتھ غزلوں کے حوالوں سے بھی پوری توضیح سے اس طرح بیان کیا ہے کہ اقبال کا فطرت کے حوالے سے نظریہ اور تصور ابھر کر سامنے آیا ہے۔اقبال کی ایک غزل سے مثال ملاحظہ کریں:

فطرت کو خرد کے رو برو کر
تسخیر مقامِ رنگ و بو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے
کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر

اسی طرح منور ہاشمی نے مختلف ناقدین و محققین کی آرا کو بھی مستند قرار دیتے ہوئے شاملِ مضمون کیا ہے اور پورے وثوق ودلائل سے اقبال کے تصورِ فطرت سے متعلق پیش کیے گئے ان کے حقائق کی حمایت ووضاحت کی ہے۔بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

''ہمیں کلامِ اقبال میں فطرت کے تینوں بڑے عناصر یعنی گہرائی، وسعت اور حسن کا احساس ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر سید عبداللہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اقبال کی فطرت نگاری، فطرت پرستی کے مترادف نہیں، وہ حسنِ فطرت کو انسان اور انسانیت سے متعلق بصیرتوں کے ادراک کا ذریعہ بناتے ہیں۔''

منور ہاشمی نے اقبال کی فکر آموز نظموں ''شکوہ، جوابِ شکوہ'' کی تفہیم و تشریح کو ایک نئے جداگانہ انداز میں پیش کیا۔ اور اقبال کی طرف سے دعوتِ فکر و عمل کی طرف مائل کرتے ہوئے ان نظموں کی فنی و فکری خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کی مقصدیت، ان نظموں میں اقبال کے پیش کردہ نظریات و تصورات جن میں تصورِ خودی، تصورِ مردِ مومن، تصورِ عشق، تصورِ حیات، تصورِ ملت، تصورِ وطن، تصورِ آزادی، تصورِ حرکت، نظریہ تعلیم، اور دیگر تصورات کی عکاسی اقبال کے اشعار کی مثالوں کے ذریعے نہایت خوبصورتی سے کی ہے۔ اس حوالے سے ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مئے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

منور ہاشمی نے اس مجموعے میں اقبال کی عظمت کو تسلیم کرنے والوں کے ساتھ ساتھ ان کے مخالفین کو بھی سامنے لانے کی سعی کی ہے اس حوالے سے ان کا ایک مضمون ''اقبال احمد سہیل، اقبال کا مخالف بھی پیرو بھی'' ہے جس میں انہوں نے اقبال احمد سہیل کے حوالے سے تذکرہ کیا ہے کہ وہ بیک وقت اقبال کے مخالف بھی تھے اور پیرو بھی یہاں تک کہ ان کی تمام شاعری اقبال کی تقلید و تضمین پر مشتمل ہے سہیل بظاہر اقبال کے خلاف تھا لیکن عملی طور پر وہ اقبال سے متاثر تھا اور ان کی شاعری کے موضوعات اور غزلیات، تراکیب، لفظیات اور رنگ و آہنگ تک کی تقلید و پیروی کی ہے۔ سہیل نے اقبال کی غزلوں اور نظموں کے مصرعے اٹھا کر مکمل طور پر یا تھوڑی بہت ان میں تبدیلی کر کے اپنے کلام کا حصہ بنایا۔ اس حوالے سے ایک مثال اقبال کی بانگِ درا میں شامل نظم ''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' کے نام سے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارہ
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

جب کہ اقبال احمد سہیل نے اقبال کی اسی نظم کے تتبع میں ''خطاب بہ مسلم'' کے نام سے لکھی۔ اس نظم کا حوالہ بھی منور ہاشمی نے یہاں پر یوں دیا ہے۔

قصر وایواں ترے اسلاف کے ویران ہوئے
ترے ہاتھوں میں فقط راکھ کا ہی ڈھیر رہا
یہی کرتوت ہیں تیرے تو سن اے ننگِ سلف
تو رہا ہند میں اب تک تو بہت دیر رہا

اقبال کی شاعری سے بہت سے شعرا مستفیض ہوئے اوران کی شاعری سے متاثر ہوکران کی شاعری کی روایت کی پیروی کی ان کی شاعری کا رنگ وآہنگ اپنایاان کی شاعری کی زمینوں کواپنی شاعری میں برتا اور شاعری کی روایت کوآگے بڑھا کر شہرت حاصل کی ان میں ایک شاعر جوش ملیح آبادی بھی شامل ہیں جنھوں نے اقبال کی غزلوں ،نظموں اور شعری زمینوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنی شاعری کو جلا بخشی ہے۔ جوش کی بے شمارغزلوں اورنظموں پر اقبال کے اثرات واضح ہیں ۔جس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

ہم نے پایا ہے شراروں میں بھی شبنم کا مزاج
ہم نے دیکھی ہے شعاعوں میں بھی مہرِ لب کشت
ہاں سوائے دل سرشار و دماغِ بیدار
تجلۂ ناز نہ کاشی ، نہ کلیسا ، نہ کنشت

جوش نے اقبال کی کتاب بال جبریل میں شامل غزلوں کی زمین پر طبع آزمائی کی اوراسی رنگ واسلوب کواپنا کر شاعری کی کوشش کی ہے لیکن وہ دیرپا غزل کی دنیا سے منسلک نہ رہ سکے اور جلد ہی غزل سے کنارہ کشی کرتے ہوئے نظم گوئی کی صنف کواپنایا جس میں ان کوشہرہ آفاق مقبولیت ملی۔

اس مضمون کے بعد منور ہاشمی نے اقبال کے شاعری میں عشق کے تصور کوان کے ایک مصرع ''دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر'' (شعرِ اقبال میں عشق کا مفہوم) کوحوالہ جات کے ساتھ زیر بحث لایا ہے۔ اقبال نے عشق کوشاعری کی روایت سے نکال کرایک نئے انداز سے مقدس ترین لفظ بنا کر کچھ اس طرح رفعت آشنا کیا:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کردے

منور ہاشمی کے نزدیک اقبال عشق کوانسان اور مذہب کے درمیان گہرے تعلق کی بنیاد قرار دیتے ہیں جواسلامی تعلیمات سے اخذ شدہ ہے۔ اقبال نے اس لفظ کو خالق کائنات سے لازوال تعلق اور خودی وکائنات کے مردِمومن کے لیے جستجو وتڑپ کا نام دیا ہے۔ اقبال عشق کوخودی کا سب سے بڑا معاون قرار دیتے ہیں۔ اقبال نے اپنی شاعری میں اس کے معنی ومفہوم کواپنے سارے نظریات میں ایک نئے پہلو سے بیان کیا ہے کہ سب کرامات عشق کی بدولت ہی ہیں۔ بقول اقبال:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اقبال کے تصور خودی کے حوالے سے ایک مضمون "اقبال کا فلسفہ خودی اور ڈاکٹر شریعتی کی توضیحات" میں منور ہاشمی نے اقبال کے افکار کو ایران و مشہد میں متعارف و روشناس کروانے والی شخصیت ڈاکٹر شریعتی پر بحث کی ہے۔ ڈاکٹر علی شریعتی اقبال کے افکار میں فلسفہ خودی سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ وہ اس فلسفے کو کائنات کی بہت بڑی قوت خیال کرتے تھے ۔ یہاں منور ہاشمی نے پوری وضاحت سے فلسفہ خودی اور اس کے مراحل کو بیان کیا ہے۔

شریعتی نے اپنے الفاظ میں تعمیر خودی اور تربیت خودی کو خودسازی کا نام دیا ہے۔ جو اقبال کے ہاں ان کو نظر آتی ہے۔ جس نے بقول ان کے کہ اقبال کو علیؓ جیسا بنادیا ہے۔ شریعتی نے اقبال کے نظریہ خودی کی بطور شارح، ترجمان، مقلد اور مبلغ کے ترویج و اشاعت اور تشریحات پیش کی ہیں۔

اقبالؔ کے دور میں بڑے بڑے شعرا موجود تھے جنھوں نے اقبالؔ جیسے بڑے شاعر کی موجودگی میں اپنی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کو منوایا ہے جن میں حسرت موہانی، فراق گورکھپوری، حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی وغیرہ شامل ہیں۔ منور ہاشمی نے مذکورہ تصنیف میں آخری دو مضامین میں "حسرت موہانی کی شاعری پر اقبال کے اثرات" اور "فراق کی شاعری پر اقبال کے اثرات" شامل کیے ہیں جن میں حسرت موہانی اور فراق کی شاعری پر اقبالؔ جیسے بڑے شاعر کے اثرات کا تذکرہ نہایت تفصیل سے کیا ہے۔ منور ہاشمی نے اس کے ساتھ ساتھ مختلف شعروں سے اقبال کی شاعری کی پیروی و اثرات کو واضح کیا ہے تاکہ کوئی بھی پہلو تشنہ نہ رہے۔ ان شعرا نے نہ صرف اقبال کے شعری موضوعات کو اپنی شاعری میں برتا ہے بلکہ اقبال کے افکار و نظریات اور مختلف رجحانات کی بھی تقلید کی ہے اس کے علاوہ اقبال کے رنگ و آہنگ، بحروں، اور لفظیات سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے۔ جن کو منور ہاشمی نے چند مثالوں سے بیان کیا ہے۔ حسرتؔ موہانی اور فراقؔ کی شاعری میں اقبال کے رنگ و اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کا ادب کی دنیا میں مقام و مرتبے کا تعین کیا ہے۔

منور ہاشمی نے اپنی اس تصنیف میں اقبال شناسی کے حوالے سے متفرق مضامین کو برت کر ایک نئے انداز سے منظر عام پر لایا ہے اور اپنے منفرد تنقیدی اسلوب کی بدولت اردو دنیا میں نمایاں مقام بنایا ہے۔ وہ شعر اقبال کے تمام پہلوؤں پر تحقیقی و تنقیدی بصیرت کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ درج بالا خصوصیات اقبالؔ شناسی اور اقبال فہمی کے لیے بنیادی تصور کی جاتی ہیں۔

اقبال شناسی ایک منفرد تنقیدی رویہ، اصول اور جمالیاتی اقدار کا تقاضا کرتی ہے۔ کیونکہ جن تنقیدی رویوں اصولوں اور جمالیاتی اقدار کی مدد سے اُردو کے دیگر شعرا کی قدر شناسی کی جاتی ہے وہ رویے اصول اور اقدار اقبال شناسی کے باب میں کارآمد ثابت نہیں ہوتے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اقبال دیگر شعرا کے برعکس ایک منفرد جمالیات کا شاعر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منور ہاشمی نے ان تمام اصول اور اقدار کو اپنایا ہے جن کی اقبال شناسی متقاضی ہے۔ انہوں نے اقبال کے نظریات و افکار اور ان کے فلسفہ خودی کی ترسیل و تفہیم کو نہایت خوبصورتی سے بیان کر کے بطور اقبال شناس اپنے آپ کو متعارف کروایا ہے۔

اقبالؒ اور فیضِ اقبالؒ

خاور چودھری

جہانِ اقبال کی وسعت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ خالق ومخلوق کے اسرار کی بوقلمونیوں اور ان کے باہمی لطیف تعلق کو سمجھنے میں اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ ایک نظر میں اس کا احاطہ ممکن نہیں۔ یہ بھی امکان سے ورا ہے کہ انسان ذاتِ یکتا کے اوصاف وکمالات کو بہ تمام وکمال سمجھ سکے؛ کیوں کہ ایسا ہوجانا انسان کے مقام میں نہیں: البتہ ایک لطیف دائرے میں سماجانے اور پھر اُس سے لطف کیش ہونے میں ایک ودیعتی امکان بہ ہر حال ہے۔ دوسرا نکتہ مخلوق سے جڑا ہے اور اس میں تخصص تو ہونے سے رہا، البتہ انسان کی حد تک اور انسان کی نفسیاتی اور ظاہری متنوع زندگی کی حد تک یہ کھوج لگایا جاسکتا ہے۔

جب خالق اور مخلوق کی امکان سے باہر کی دنیا کو سمجھنے کے لیے اقبال نے سعی کی تو بلاشبہ اُن کے سامنے فوق ومافوق کا تصور موجود تھا؛ چناں چہ کیوں، کون، کہاں، کیسے اور کس نے؟ کی بازگشت واضح طور پر ان کے یہاں گونجتی سنائی دیتی ہے۔ یہاں شاہد ومشہود، ناظر ومنظور اور سامع ومسموع کے درمیان ایک پُراسرار اور مہین زنجیر بھی کھنکتی ہوئی ظاہر ہوتی ہے۔ کائنات اور تصورِ کائنات کی سراغ رسائی اور پھر ان کے ماحصل کو اقبالؒ نے ایک انسان کی آنکھ سے دیکھا اور پھر بیان کیا۔

انسان اس جہان میں اس دعوے کے ساتھ موجود ہے کہ تخلیق وتعمیر کا سارا کھیل اس کے وسیلے سے ہے، جہانِ آب وگل کی رعنائی تو ایک طرف رہی، جہانِ ممکنات کی تابش بھی اسی کی بدولت ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو کئی دوسرے فلسفیوں اور دانش وروں سے ہوتا ہوا ہمیں اقبالؒ کے یہاں ضوفشاں دکھائی دیتا ہے بلکہ یوں ہے کہ انھوں نے کئی مزید زاویوں سے اسے چمکا دیا ہے۔ چناں چہ جہت ہائے خیال وامکان کے اس تنوع نے جہاں انسان کی داخلی وخارجی اور نفسیاتی تگ وتاز کو مہمیز کیا، وہاں اس کی تفہیم وعبارت کی گرہ کشائی کی توضیح وتوضیع کی جانب بھی متوجہ کیا، یہ ثابت کیا کہ مدیا ورمدار کی باہمی کشمکش ایک مرحلے پر ہم آغوش ہوجاتی ہے۔ یہ نقطۂ انسلاک ہی دراصل وہ مقام ہے جہاں انسان معراج کی جانب بڑھتا ہے۔

اقبالؒ انسان کی سست روی یا پست قدمی کا ہی شکوہ نہیں کرتے بلکہ اس کے عقیدے کے بخیے بھی اُدھیڑتے چلے جاتے ہیں اور اُس وقت تک یہ عمل جاری رکھتے ہیں جب تک دوسرے محیط میں داخل نہ ہوجائیں۔ یہاں ''شکوہ'' نمایاں ہونے لگتا ہے۔ ''جوابِ شکوہ'' کا عالم اس سے الگ نہیں مگر یہ مدیرومدار کی نقاب کشائی کا الگ زاویہ ہے۔ ''شے'' اور ''لاشے'' کی تفہیم میں کہیں تخبط کا امکان بھی رہتا ہے، انسان خود کو متخصص کے درجے پر فائز سمجھنے لگتا ہے۔ اقبالؒ نے البتہ ان مرحلوں میں ودیعت کوز وبرو کرتے ہوئے صحیح سمت اختیار کی؛ چنانچہ اُن کے یہاں ''آہِ سحرگاہی'' ایک خاص علامت اور نظریے کے طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ یہاں اقبالؒ ہمیں یونانی اور مغربی مفکرین سے الگ دکھائی دیتے ہیں۔ توافق

اور افتراق کا یہی عمل اقبالؒ کے خصوصی مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔

نظری اعتبار سے اقبال کا تصورِ مذہب، تصورِ فطرت، تصورِ اخلاق، تصورِ تمدن اور فلسفۂ استقبال نہایت اہم رہے ہیں۔ انھوں نے فکری سطحوں پر پوری فصاحت اور بلاغت کے ساتھ ان تصورات کو پیش کیا۔ چنانچہ اُن کی تمام کتب ایک تدریجی عمل کے وسیلے سے وضاحت کرتی چلی جاتی ہیں۔ ''جاوید نامہ'' اور ''ضربِ کلیم'' کی مخصوص فضا اُن کے تصورِ حیات کی بہترین پیش کار ہے۔ پھر اُن کا شاعرانہ فلسفہ ہے، جس کا رُخ اگرچہ متعین ہے لیکن ہنوز قابلِ بحث اور قابلِ توجہ ہے۔

اقبال کی شاعری کو اُن کی ذات سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا کیوں کہ اُن کی شاعری اُن کے نظریات کا ابلاغی وسیلہ ہے۔ البتہ اُن کے شعری محسنات کا تجزیہ بجائے خود علاحدہ مضمون ہے۔ انھوں نے بتدریج اپنی لفظیات، علامتوں، استعاروں، لب و لہجے اور اُسلوبِ نگارش کو خاص کیا۔ رومانویت سے خطابیت تک کے ادوار میں، گاہے باہم اور گاہے علاحدہ علاحدہ اقبال کے رنگ و آہنگ میں تغیر دکھائی دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اُن کے یہاں ہیئتی تنوع پھیلنے لگتا ہے۔ متروک الفاظ اور غیر مانوس مرکبات سمیت کم مستعمل بحور بھی چمکنے لگتی ہیں۔ شاعرانہ ہیئتوں پر مشرق و مغرب کے اثرات یکساں جگ مگانے لگتے ہیں، البتہ اُن کا زاویۂ نگاہ وقت کے ساتھ ساتھ مرتکز ہوتا چلا جاتا ہے۔

اقبال کی شعری کائنات میں جہاں نوجوانی کے تیز رَو احساسات اور گرم خُو جذبات کا مضطرب نقش اُبھرتا ہے، وہاں فطرت اور عناصرِ فطرت کی طرف میلان بھی بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی سے متصل حب الوطنی کا جوش اور ولولہ بھی نمایاں ہوتا ہے اور یوں بات علامہ اقبال کے اُن خاص نظریات تک محدود ہو جاتی ہے جو اُن کی ذات کا مضبوط حوالہ بنے ہیں۔ اسی عرصے میں اُن کی لفظیات اور اُسلوب کی جداگانہ شناخت قائم ہو جاتی ہے۔ دائرۂ فکر وسعت آشنا ہوتا ہے تو موضوعات بھی متعین و متصل ہو جاتے ہیں۔ اس تدریجی اور متنوع سفر کو سمجھنا بجائے خود ایک بڑا کام ہے۔

اقبال کا بلند آہنگ نغمہ اور فلک شگاف الاپ ایسا تھا جس نے اپنے آس پاس سمیت دور دراز کے منطقوں کو متاثر کیا۔ ان اثرات کا مطالعہ بھی ایک الگ باب ہے۔ اقبال شناسوں نے جہاں اقبالیات کی دوسری شاخوں کی طرف توجہ کی، وہاں اس جانب بھی متوجہ رہے۔ یہ سلسلہ اُن کی زندگی میں شروع ہوا، آج تک پھیلا اور زمانوں تک جاری رہے گا۔

شارحینِ اقبال کی ایک کہکشاں ہے جس کا ہر رکن اپنی جگہ اہم ہے۔ انھی میں پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب ہیں۔ انھوں نے اقبال کی تفہیم و تشریح کا جو پیمانہ برتا، وہ جدا بھی ہے اور قابلِ لحاظ بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اقبال شناسی ایک مستحکم روایت کی صورت میں اگر نسلِ نو تک منتقل ہو رہی تو ہے اس میں موصوف کا قابلِ قدر حصہ ہے۔ ''فیضِ اقبال'' اس سلسلے کی تابندہ مثال ہے۔ اس کتاب میں جہاں اقبال کے بنیادی نظریات کا احاطہ کیا گیا ہے، وہاں فکرِ اقبال سے متاثر ہونے والوں کی نشان دہی بھی کی گئی۔ ہاشمی صاحب نے شعرِ اقبال کی پرتو میں سے عشق کے فلک بوس شعلوں کو یوں گرفت کیا کہ یک نگاہ نیا پن اور تازگی بصارتوں کو گرمانے لگتی ہے۔ اسی طرح جب وہ شکوہ اور جوابِ شکوہ کی گرہیں کھولتے ہیں تو یوں

محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر کی روح مسلسل راہ نمائی کر رہی ہے۔فطرت اور فطرت کی ہمہ رنگیوں سے اقبال کا انسلاک وانہماک ایک مستقل مضمون ہے۔ڈاکٹر ہاشمی نے اس تناظر میں اُن گوشوں کو بھی چھو دیا ہے، عام طور پر جو نظروں سے سے اوجھل رہے ہیں۔فکرِ اقبال کے خصوصی مطالعے میں ان کے تین مضامین اس کتاب میں شامل ہیں:

۱۔اقبال کا تصورِ فطرت　　۲۔شکوہ، جوابِ شکوہ: دعوتِ فکر　　۳۔دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر

اقبال سے مستفیض ہونے والوں کی طویل قطاریں ہیں، ڈاکٹر منور ہاشمی نے ان میں سے پانچ کی نشان دہی کی ہے:

۱۔　اقبال احمد سہیل: اقبال کا مخالف بھی، پیرو بھی۔　۲۔　اقبال کا فلسفۂ خودی اور ڈاکٹر شریعتی کی توضیحات

۳۔　حسرت موہانی پر اقبال کے اثرات　　۴۔　فراق کی شاعری پر اقبال کے اثرات

۵۔　جوش کی غزلوں پر اقبال کے اثرات

ڈاکٹر منور ہاشمی کے ان مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیضِ اقبال، اقبال کی زندگی میں بھی جاری رہا اور بعد میں بھی یہ سلسلہ تھما نہیں۔اُن کے معاصرین نے بلاواسطہ اور بلواسطہ اُن کی فکر، لفظیات، تراکیب، علامات، استعارات اور تشبیہات کو برتا اور ایک نیا آہنگ دینے کی کوشش بھی کی۔یہی حال اُن سے متصل بعد میں آنے والوں کا ہے۔طرزِ اقبال کے چھینٹے ان شاعروں پر اتنے گہرے اور واضح دکھائی دینے لگے ہیں کہ مفر کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔

''فیضِ اقبال'' بیک وقت دو جہتوں میں متاثر کرتی ہے۔ایک تو اس کا علمی مقام ہے، جو واضح ہے۔دوسری جانب ناشناسانِ اقبال کے لیے یہ اقبال کی شناسائی کا آسان وسیلہ بھی ہے۔اقبال کے فلسفۂ زندگی، حسن وعشق، فلسفۂ خالق ومخلوق اور طرزِ شعر کو سمجھنے میں یہ خاص قرینہ بھی عطا کرتی ہے۔اس اعتبار سے اس کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کے نظریات کی ترسیل وتفہیم جس قدر آج ناگزیر ہے، پہلے شاید نہیں رہی۔کالونیل ازم اور صنعتی انقلاب کے بعد سیکولرازم اور پھر جدید عہد میں نیو ورلڈ آرڈر اور اس کے بعد نمایاں ہونے والے منظر نامہ مسلم اُمہ کو نئی صف بندی پر لے آیا ہے۔یہ وہ مقام ہے جہاں اقبال سے زیادہ موثر راہ نمائی کوئی اور نہیں کر سکتا۔فکرِ اقبال اور طرزِ اقبال کی مستحکم قوت اُمت کو اُس مخصوص دائرے میں پھر داخل کر سکتی ہے جس کی حدیں پامال ہو چکی ہیں۔اس تناظر میں ''فیضِ اقبال'' قدر ومنزلت کے اعتبار سے لائقِ تحسین وتوجہ ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب نے اقبال کے مطالعے کے دوران موازنے کی جو فضا قائم کی ہے، اُس سے اُردو ادب کی تاریخ کے دو ر اولیں کے بعض گوشے اگر جگمگائے ہیں تو دورِ حاضر کی رفتار کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔''فیضِ اقبال'' کا یہ رخ بھی تشنگانِ ادب کے لیے اہم ہے۔اقبال شناسی کی روایت میں یہ کتاب بادِ صبا کی مانند ہے جو بند اذہان پر عطر بار دستک دیتے ہوئے احساس کو مہمیز کرتی ہے۔

(دیباچہ ''فیضِ اقبال'')

''علامہ اقبال کی اُردو شاعری میں فطرت نگاری''

کا طائرانہ جائزہ

ندیم افضال

اُردو ادب میں اقبالیات فی زمانہ باقاعدہ ایک الگ شعبے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ خود اقبال کے عہد سے لے کر اب تک اقبال کے سیاسی، سماجی، معاشی، عمرانی اور دیگر علوم ہائے جدید و قدیم کے متعلق گوں ناگوں تصورات کی تفہیم کے لیے خامہ فرسائی کا سلسلہ جاری ہے۔ جہاں مشرقی زبانوں میں تفہیم اقبال پر قابلِ قدر کام ہوا ہے وہیں دنیا کی بیشتر معروف مغربی اور یورپی زبانوں میں بھی اقبال کی تفہیم و تشریح کے حوالے سے خاصا وقیع کام ہوا ہے۔ اُردو ادب میں تو اقبال کے معاصرین سے ہی اس کام کی ابتداء ہو چکی تھی۔ جو تا حال جاری و ساری ہے۔

تفہیم اقبال کے ضمن میں ان کے اہم تصورات کی تشریح کو اہلِ علم نے حرزِ جاں بنایا اور نت نئے تحقیقی افق دریافت کیے انہی تصورات و نظریات میں اقبال کا نظریہ فطرت بھی ہے۔ اس بات کو ڈاکٹر منور ہاشمی ''فیض اقبال'' میں کچھ یوں بیان فرماتے ہیں۔

> ''اقبال اسی ہستی کا نام ہے جن کے فکر و فلسفہ پر دنیا میں سب سے زیادہ لکھا گیا۔ اس کے باوجود بہت سے پہلو بھی تشنہ و تشریح طلب ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی بنیادی حیثیت ایک شاعر کی ہے کیوں کہ انہوں نے تمام تر فکر و فلسفہ شعر کی زبان میں ہی پیش کیا ہے۔ گویا ان کا شعر محض شعر نہیں بلکہ ایک فکری حیثیت رکھتا ہے۔ ہر شعر ایک فن پارہ ہے جس کی تشریح و توضیح کے لیے بڑی بڑی کتابیں بھی ناکافی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقالے میں کسی بھی شعر کی تشریح وغیرہ کی گنجائش نہیں، تاہم مجھے یہ جائزہ لینا ہے کہ انہوں نے اپنا پیغام آگے بڑھنے کے لیے فطرت اور مظاہر فطرت کا کہاں تک سہارا لیا ہے: (فیض اقبال، ص 18)

پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ''اقبال کے اُردو کلام میں فطرت نگاری اور ایک ہم عصر شاعر سے تقابلی جائزہ'' پر تھا۔ مقالے کی نگران پروفیسر فہمیدہ شیخ صدر شعبہ اُردو جامعہ سندھ جامشورو تھیں اس مقالے کو 2002ء میں پیش کیا گیا۔ مقالہ سات ابواب پر محیط ہے۔ باب اول کا عنوان ''فطرت کیا ہے'' فطرت اور فطرت نگاری کے مفہوم، مغربی تصور فطرت اور مغربی مفکرین و فلاسفہ اور شعراء خصوصاً گوئٹے، دانتے، شیلے، نطشے، براؤننگ، شیکسپئر ورڈزورتھ اور اقبال کے قریب العہد مفکرین کے تصورِ فطرت کے مباحث پر مشتمل ہے۔

باب دوم کا عنوان ''مشرق میں تصورِ فطرت'' ہے۔ اس باب میں مشرقی و اسلامی تصورِ فطرت سے بحث کی گئی ہے۔ اسلامی تصورِ فطرت میں قرآن و حدیث، مسلم علماء و متکلمین اور متصوفین کے نظریات فطرت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم کا عنوان ''اُردو شاعری میں فطرت نگاری (آغاز اُردو سے تا حال مختصراً) اس باب میں اُردو شاعری کے

آغاز سے تاحال مختصراً فطرت کی عکاسی اور اقبال پر اس کے اثرات کی مدلل و جامع وضاحت کی گئی ہے۔

باب چہارم کا عنوان ''بانگِ درا کی شاعری میں فطرت نگاری'' ہے۔اس باب میں اقبال کی ابتدائی شاعری کا تین ادوار کی تقسیم کر کے جائزہ کیا گیا ہے۔

ابتدا سے ۱۹۰۵ء تک　　۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک　　۱۹۰۸ء سے آخر تک

باب پنجم کا عنوان ''بالِ جبریل میں فطرت نگاری'' ہے۔اس باب میں نظموں، غزلیات، رباعیات اور قطعات وغیرہ میں فطرت نگاری کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب ششم کا عنوان ''ضربِ کلیم اور ارمغان حجاز کی اُردو شاعری میں فطرت نگاری'' ہے۔اس باب میں دونوں کتب کی نظموں، غزلوں اور رباعیات وغیرہ سے فطرت نگاری کے عناصر کو کشید کیا گیا ہے۔

باب ہفتم کا عنوان ''اقبال کی فطرت نگاری کے اثرات'' ہے۔اس باب میں اقبال کے ہم عصر شعراء پر فطرت نگاری کے حوالے سے پڑنے والے گہرے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے نیز ''حسرت موہانی کی فطرت نگاری اور اقبال سے تقابلی جائزہ'' (خصوصی مطالعہ) بھی اس باب کا حصہ ہے۔مقالہ 450 صفحات پر مشتمل ہے۔

جب انسان مظاہر فطرت سے بحیثیت ناظر حظ اٹھاتا ہے تو ان مظاہر میں موجود حسن و جمال کے تعین کا معیار دیکھنے والے کی اہلیت و استعداد سے مشروط ہوتا ہے۔انسان فطری طور پر جمال پرست ہے اور جمال پسندی کی جانب مائل ہوتا ہے۔حسنِ جمال کے اندرونی محرکات کا شعور خارجی عالم کے شعور کے بغیر ناممکنات میں سے ہے۔

اقبال کا تصور جمال ان کی فکری اساس یعنی نظریہ خودی سے پوری طرح ملحق ہے۔دراصل نظریہ خودی اقبال کے نظام فکر کی وحدت کو سموئے ہوئے ہے اور دیگر جملہ نظریات باہم دگر مربوط ہو کر اس وحدت کو مکمل کرتے نظر آتے ہیں۔

اقبال کے ہاں لفظ فطرت وسیع مفاہیم کا حامل ہے۔ڈاکٹر منور ہاشمی اس راز سے کچھ یوں پردہ اٹھاتے ہیں:

''اقبال نے اپنی نظم ''ایک شام'' میں فطرت کے لیے بیک وقت فطرت اور قدرت دونوں لفظ استعمال کیے ہیں:

فطرت بے ہوش ہو گئی ہے
آغوش میں شب کے سو گئی ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا

تاہم اب اقبال چاہتے ہیں کہ صرف ایک لفظ یعنی فطرت کو داخلی اور خارجی مظاہر کائنات کے لیے استعمال کریں گویا انھوں نے اس لفظ کا استعمال وسیع تر معنوں میں کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔بانگِ درا کی نظم ''تنہائی'' میں اس قدرت کا لفظ آخری بار فطرت کے لیے استعمال ہوا ہے:

کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل!
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل'' (فیضِ اقبال،ص ۴۱)

مطالعہ اقبال کے ضمن میں مغربی شعراء سے اقبال کا فطرت نگاری کے موازنہ بہت دلچسپ موضوع ہے۔مغرب میں ورڈز ورتھ کو بڑا فطرت نگار جبکہ مشرق میں مغربی شعراء میں سے شیکسپیئر کو بڑا فطرت نگار سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ مغربی شاعری میں رومانوی شعرا کو ہی فطرت کا رمز آشنا سمجھا جاتا ہے،اس لیے اُن کو فطرت پر اتھارٹی کا درجہ حاصل ہے اور اُن کی کہی ہوئی بات قولِ فیصل درجہ رکھتی ہے۔کالرج،ورڈز ورتھ،براؤننگ،ولیم بلیک،شیلے،ہارڈی،ٹینی سن،غرض اس دبستان کے اکثر شعرا کو فطرت نگاری کے حوالے سے یدِطولیٰ حاصل ہے۔انیسویں صدی کے اواخر میں مغربی شعراء کے ہاں تین قسم کے جذباتی رجحانات پھیل گئے ہیں۔افسردگی،حرماں پسندی،آدم بیزاری۔

اقبال کی تقابلی فطرت نگاری کے ضمن میں ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ اُن کے کلام کی یہ بنیادی جہت اُن کے پیغام وافکار کے بوجھ تلے دب گئی ہے۔مگر اس بات کو مغربی ناقدینِ اقبال نے اُن کی فطرت نگاری کے تجزیے میں ڈھونڈ نکالا ہے۔جس کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے تحقیقی مقالے میں جا بجا بیان فرمایا ہے۔فطرت کے معنی اقبال کے ہاں کیا ہیں،اس حوالے سے ڈاکٹر منور ہاشمی رقم طراز ہیں:

> علامہ اقبال نے فطرت کا لفظ ایک سے زیادہ معنوں میں استعمال کیا ہے۔اس طرح بعض دوسرے الفاظ بھی فطرت کے معنوں میں استعمال کیے۔اقبال نے حالی کے اس نظریے کو کہ فطرتِ انسانی کائنات کا اہم جزو ہے، کو بھی تسلیم کیا ہے لیکن اقبال نے زیادہ تر توجہ فطرت کے خارجی مظہر ہونے اور انسانی نفسیات سے اس کی وابستگی پر دی ہے۔'' (فیضِ اقبال،ص ۱۹)

زیرِ نظر تحقیقی مقالہ انھی موضوعات پر مفید معلومات اور علمی تشنگی مٹانے کے تمام تر سامان لیے ہوئے ہے۔ذیل میں اس اچھوتے موضوع کے مقالے کا قدم بہ قدم تعارف و تجزیہ پیشِ خدمت ہے۔

باب اول:

افتتاحی باب میں فطرت کے لفظی و اصطلاحی مفاہیم سے بحث کی گئی ہے۔''مغرب میں تصورِ فطرت'' کے عنوان کے تحت قدیم یونانی و رومی تصوراتِ فطرت و مظاہرِ فطرت پر سیر حاصل مدلل بحث کی گئی ہے اور اس دور کے مفکرین و فلاسفہ کے خیالات کا جائزہ ان کی تحاریر کی روشنی میں لیا گیا ہے۔سقراط و افلاطون کے نظریاتِ فطرت اور جدید مغربی مفکرین پر ان کے اثرات کیا ہوئے؟ زمانۂ وسطیٰ میں فطرت کے تصورات کس قدر تغیر پذیر ہوئے؟ ایک دلچسپ تحقیق کی صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔اس دور کا پھیلاؤ ڈاکٹر صاحب کے بموجب پندرہویں صدی عیسوی تک ہے اور اس کے جائزے میں سینٹ آگسٹن اور سینٹ اکوناس کی پیروی ارسطو کو دلائل و براہین سے ثابت کیا گیا ہے۔

مغربی نشاۃِ ثانیہ کے دوران ادب میں فطرت نگاری کا آغاز ڈاکٹر منور ہاشمی،دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کو قرار

دیتے ہیں جو نہ صرف اس دور میں مغربی نظریات کی عکاسی کرتی ہے بلکہ فطرت نگاری کا ایک لاشعوری مرقع بھی ہے۔

سترھویں صدی عیسوی میں الیگزینڈر پوپ کی نظم Essay on the Man اور جان ڈن Air and angles کے تناظر میں ایک نئے انداز فطرت اور تصور فطرت کو انگڑائیاں لیتے دکھایا گیا ہے۔ ساتھ ہی آنے والی صدیوں میں نیوٹن، گلیلو، ہابس، نطشے، کانٹ، شوپن ہار اور گوئٹے کے معقولی انداز فکر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نطشے کے Superman یا فوق البشر کے نظریے اور برگساں کے زمان و مکاں کی حقیقت کے فطرت سے اثبات کو اس باب میں تفہیم اقبال کے خصوصی حوالے سے شامل کیا گیا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کے رومانی دبستان کے شعرا ولیم بلیک، ایس ٹی کالرج، براؤننگ، شیلے، ٹینی سن، ہارڈی اور خصوصیت کے ساتھ ورڈزورتھ و شیکسپیئر کے تفہیمی مباحث بھی مقالے کے اس باب کا حصہ بنائے گئے ہیں۔ دراصل حاصلات تحقیق کے ضمن میں یہ بات بہت اہمیت کی حامل تھی کہ علامہ اقبال واقعتاً دستیاب دلائل کی روشنی میں مذکورہ بالا دونوں شعرا سے ہی نہیں بلکہ سب سے بڑے فطرت نگار ہیں اور حاصل بحث سے اس بات کو تقویت بہم پہنچتی ہے۔

باب دوم:

اس باب میں فطرت کے تصور کی تفہیم مشرق کے حوالے سے کی گئی ہے۔ مشرقی علوم کے سرچشموں میں قدیم ہندوستان کا آریائی ادب خصوصاً چاروید بہت اہم ہیں۔ استاد محترم نے ہندوانہ ویدانتی تصور فطرت کے ضمن میں خاصے دلچسپ تحقیقی انداز میں جوہر ربانی Divine Substance پر داد تحقیق دی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''برہم کو رحم حیات Womb of Life بھی کہا گیا ہے۔ عیسوی عقیدے کے مطابق مرد اور عورت دونوں مونث ہیں۔ خدا کی صورت اس تخلیق میں منعکس ہوتی ہے جو مرد بھی ہے اور عورت بھی۔۔۔۔ جو ہر کلی مذکر اور فطرت مونث ہے۔ یہ دونوں منطقی اعتبار سے تو الگ الگ ہیں مگر خدا کے اندر ایک ہی ہیں۔۔۔۔ ہندوؤں کے نزدیک آواز کا تعلق ایثر سے ہے جو پانچ عناصر میں سب سے پہلا عنصر ہے اور یہ ربانی جوہر Divine Substance کا سب سے پہلا، سب سے لطیف اور وسیع مظہر ہے۔ عالم کی پیدائش کے ضمن میں ایثر ہی سے باقی تمام عناصر یعنی آگ، پانی، ہوا اور مٹی برآمد ہوتے ہیں۔ چنانچہ آواز اور ایثر دونوں مل کر تخلیق کے اولین اور صداقت سے لبریز لمحے یا وجود مطلق کی تخلیقی توانائی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ (ص ۴۰)

اسی تسلسل میں مشرق کے قدیم علوم کے منابع میں سے ایک اہم حوالے یعنی چینی ذخیرۂ علم کو کھنگالا گیا ہے اور چینی نکات فطرت یانگ Yang، ین Yin اور ان کے بدیہی اجمال تائی کی Tai-Ki پر سیر حاصل معلومات محققانہ انداز میں جمع کی گئی ہے۔

اس کے بعد قدیم عربی اور اسلامی عناصر و تصورات فطرت کو نہایت احتیاط سے زمانی ترتیب اور مبسوط انداز میں مستند حوالہ جات کی روشنی میں واضح فرمایا گیا ہے۔ دلائل قرآن و حدیث، آثار صحابہ و بزرگان سلف، قدما متکلمین و فلاسفہ کی

آرا اور آخر الذکر کے دونوں گروہوں اشراقی و مشائی کے نظریاتِ فطرت کا مفصل جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اسلامی متکلمین و صوفیا ،علامہ کے روحانی پیر و مرشد مولانا جلال الدین رومی کے افکارِ فطرت کے علاوہ فخر الدین عراقی، ابن عربی، بو علی سینا، ابن خلدون، رومی، سعدی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وغیرہم کے خیالات دلائل و براہین کی روشنی میں آشکار کیے ہیں۔

اس باب کی خاص بات لفظِ فطرت کے اطلاقات کے مباحث ہیں۔ جن میں ہندومت کے رمزیہ اندازِ پُرش و پراکرتی، مشرقِ بعید کی فطرت کی فاعلی و مفعولی صورت یانگ و ین اور عربی اندازِ فکر کے "فطرت" اور "الطبیعیہ" کے وسیع مفاہیم کا شمول بھی ہے۔

باب سوم:

تیسرے باب میں اُردو شاعری کے خصوصی حوالے سے مضامینِ فطرت کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اور کم و بیش سات سو سال پر محیط اُردو شاعری کے نمائندہ شعرا کے کلام کے نمونوں کو فطرت نگاری کے حوالے سے منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ یوں تو یہ کھوج خود ہی اپنے دقت طلب اور دشوار ہونے کی گواہی دیتی ہے۔ اس پر مستزاد ڈاکٹر ہاشمی صاحب کی اُردو شاعری کے حوالے سے یہ تحقیق ہے، جس کے چند اقتباسات پیشِ خدمت ہیں:

"اس تحقیق سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قدیم اُردو شاعری میں فطرت نگاری کا کوئی ثبوت موجود نہیں ۔۔۔ تاہم غیر شعوری طور پر ان کے ہاں فطرت کے مناظر شاعری میں در آتے ہیں۔ فطرت بذاتِ خود کبھی بھی ایک موضوع کی حیثیت سے ہمارے شاعروں کا محبوب نہ بن سکی۔ مظاہرِ فطرت محض علامت کی حیثیت سے ہیں۔" (ص ۶۲)

"سودا، نظیر، میر حسن اور غالب کے ہاں منظر نگاری لاجواب ہے مگر علامتی انداز میں حسن و عشق کے دیگر موضوعات اُجاگر کرنے کے لیے۔" (ص ۶۳)

"عہدِ سرسید میں فطرت نگاری کا انداز قدرے چل نکلا۔ محمد حسین آزاد اور اسماعیل میرٹھی نے خوبصورت نظمیں بھی لکھیں تاہم ان کی فطرت نگاری منظری شاعری کی حیثیت رکھتی ہے۔" (ص ۹۸)

"حالی نے سرسید کے زیرِ اثر فطرت کا عجیب و غریب تصور پیش کیا۔ جس کا تعلق محض فکر و فن سے تھا۔" (ص ۹۶)

اس باب کے آخری حصے کو مغز کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ جس میں اقبالؒ کے تصورِ فطرت اور فطرت نگاری پر مبنی شاعری کے حوالے سے محققانہ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔

اس باب میں ڈاکٹر منور ہاشمی اقبال کی فطرت نگاری پر مشتمل ابتدائی شاعری پر مغربی شاعروں کی اثر پذیری کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اقبال کی فطرت نگاری کے اختصاصی نکتے کا تذکرہ بھی فرماتے ہیں کہ اخذ و قبول کے فطری انسانی عنصر کے باوجود اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں موضوع ہذا کو اس قدر جاذبِ نظر اور قبولِ عام کا حامل بنایا کہ خود مغربی شعرا بھی اس میں اقبال کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہیں۔ بنیادی استدلال اور محرک وہی ہے کہ فطرت

نگاری خالی خولی تفریح طبع اور لذت کام و دہن نہیں بلکہ مشاہداتِ فطرت اور آفاقی پیغام رسانی کے بنیادی وسائل کا مجموعہ ہے۔اس بات کے ساتھ بصد ادب اگر یہ جملہ بھی شامل کر دیا جائے کہ اقبال کے ذاتی خیالات و میلانات بلکہ سحر خیزی کی پختہ عادت جو یورپ جا کر مزید گہری ہوئی، نے بنیادی محرک کا کام کیا اور مہمیز دی تو بے جا نہ ہوگا۔

باب چہارم:

اس باب میں اقبال کی اُردو شاعری کے پہلے مجموعے ''بانگِ درا'' کا فطرت نگاری کے خصوصی حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔اس مجموعے کی نظموں پر انفرادی تبصرے، نظموں کے بارے میں ناقدین کی آرا اور مغربی شعرا کی منظومات سے موازنہ مشاہیر کی آرا کی روشنی میں کیا گیا ہے۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ''بانگِ درا'' کا مطالعہ فطرت کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ اس کی نظموں میں خصوصیت کے ساتھ فطرت جلوہ گر نظر آتی ہے۔

اس مجموعے کی فطرت نگاری کی خاص بات مغربی شاعری کی نری لفظیات، فطرت نگاری اور کھوکھلی فطرت پرستی کے برعکس جدت کی حامل تشبیہات، محاورات اور دیگر شعری لوازم کے ساتھ ساتھ معنویت کی لطیف تہہ اور سیال پن کی حامل معنوی فطرت نگاری ہے۔ڈاکٹر صاحب کے بقول:

> اقبال کے کلام میں ایسی نظمیں نہ ہونے کے برابر ہیں جن کا مقصد محض مسرت اندوزی اور حصول لطف و انبساط ہو۔کیوں کہ اقبال نے اپنی شاعری کو بہت بڑے انقلاب کا ذریعہ بنانا تھا۔اس لیے وہ آغاز ہی سے اس کی راہ ہموار کر رہے تھے۔انھوں نے اشیائے فطرت سے اپنی دلچسپی اور وابستگی کا اظہار نادرہ کار تشبیہات و استعارات کی ذریعے کیا ہے اور کائنات کی حسین و جمیل اشیاء سے شاعر نے مشابہتیں اور مماثلتیں تلاش کر کے پیش کی ہیں۔(ص ۱۰۹)

ڈاکٹر صاحب کے بقول اس مجموعے میں چند غزلیں بھی شامل ہیں مگر یہ غزلیں اپنے معیار اور فطرت نگاری کے اعتبار سے نظموں کا مقابلہ نہیں کر پاتیں۔بہر حال ''بانگِ درا'' میں فطرت نگاری کے مصور نمونے اور شاہکار موجود ہیں۔

اس مجموعے کی ایک نظم جسے مشرق و مغرب نے فطرت نگاری کا سب سے نادر نمونہ قرار دیا ہے ''ایک شام (دریائے نیکر کے کنارے پر)'' کے عنوان سے ہے۔اس نظم میں اقبال بلا خوفِ تردید فطرت نگاری کے حوالے سے ورڈز ورتھ سے کہیں آگے ہیں اور اسے ورڈز ورتھ کی بہترین نظموں میں سے ''West Minister Bridge'' پر تفوق حاصل ہے کیوں کہ اقبال کے ہاں موجود کیفیات کی گہرائی، خارجی ترفع اور باطنی تاثر ورڈز ورتھ کی سطحیت سے کہیں ماورا ہے۔اسی کے ذیل میں ڈاکٹر صاحب نے شام کے موضوع کے حوالے سے اقبال کی نظم ''بزمِ انجم'' اور ورڈز ورتھ کی ''شام'' کا تقابل کیا ہے۔پہلے ورڈز ورتھ کی نظم کی چند سطریں دیکھیں:

> It is beautious evening calm and free
> The holy time is quit as a nun
> Breathless with adoration

اب "بزمِ انجم" سے مصرعے:

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو
طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے
وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے
کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں تارے
محوِ فلک فروزی تھی انجمن فلک کی
عرشِ بریں سے آئی آواز اک ملک کی
اے شب کے پاسبانو! اے آسماں کے تارو
تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمھاری

صرف فطرت کی رعنائیوں کے حوالے سے اپنی اصل کے ہمراہ فطرت کی ایسی جلوہ گری ہمیں مغرب کے سرمایۂ شاعری میں عنقا نظر آتی ہے اور کلام کی تاثیر کا موازنہ "NUN" یعنی راہبہ (جو کہ المیہ علامت ہے) اور اقبال کے خیالات کی نزاکت سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اسی مجموعہ کی نظم "شیکسپیئر" جو کہ درحقیقت مغرب کے ایک بڑے فطرت نگار یعنی شیکسپیئر کو اقبال کا منظوم خراج عقیدت ہے، کے آخری شعر:

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
آشنا پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

سے فطرت نگاری کا وہ شاہکار نمونہ دریافت کیا ہے کہ اقبال شاعرانہ تصنع کے عناصر سے خالی اور شیکسپیئر سے کہیں بڑھ کر فطرت کے عکاس محسوس ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس نظم میں اقبال نے شیکسپیئر کو خراج عقیدت پیش کیا ہے مگر یہ نظم خود بھی فطرت نگاری کا ایک حسین نمونہ بن گئی ہے:

شفقِ صبح کو دریا کا خرام آئینہ
نغمۂ شام کو خاموشیِ شام آئینہ

برگ آئینۂ عارضِ زیبائے بہار
شاہدِ مے کے لیے حجلۂ جام آئینہ
حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن
دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ
ہے ترے فکرِ فلک رس سے کمالِ ہستی
کیا تری فطرتِ روشن تھی مآلِ ہستی

باب پنجم:

اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے زمانی ترتیب کے لحاظ سے اشاعت پذیر حضرت علامہ کے دوسرے اُردو مجموعے ''بالِ جبریل'' میں فطرت نگاری کوموضوعِ تحقیق بنایا ہے۔ واضح رہے کہ بانگِ درا اور بالِ جبریل کی اشاعت کے درمیان گیارہ سالہ وقفہ تھا اور اسی دوران علامہ کی فارسی کتاب جاوید نامہ شائع ہوئی۔ اس طرح فارسی کی چار کتب اسرارِ خودی، رموزِ بےخودی، پیامِ مشرق اور جاوید نامہ اور اُردو کی بانگِ درا، بالِ جبریل سے قبل شائع ہو چکی تھیں۔

اگر چہ بالِ جبریل میں فطرت نگاری علامہ کے افکار کی مضبوطی اور آفاقی پیغام کی افادیت کے باعث دبی دبی سی نظر آتی ہے تاہم بانگِ درا کی فطرت نگاری اگر ان کے پیغام کی ترویج کا وسیلہ تھی تو بالِ جبریل میں پیغام کی ضرورت کی صورت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کی مثال بالِ جبریل کی پیشانی پر درج اس شعر سے لی جا سکتی ہے:

اُٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں
نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

''بالِ جبریل'' میں مجموعی طور پر پینتیس نظمیں ہیں جن میں تین بڑی نظمیں ہیں: ''مسجدِ قرطبہ''، ''ذوق وشوق'' اور ''ساقی''۔ یہ نظمیں حقیقتاً اقبال کو شاعری کے اوجِ ثریا پر پہنچاتی ہیں اور دنیائے شاعری میں ان نظموں کے پائے کی نظمیں بلاشبہ آج تک تخلیق نہیں ہو سکیں۔ اس کے علاوہ بالِ جبریل میں متعدد چھوٹی نظمیں بھی شامل ہیں جو اپنی جگہ پر اہمیت کی حامل ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے بقول: ''اس مجموعے کی نظمیں بانگِ درا کی نظموں سے مرتبے میں کہیں بلند ہیں۔''

اس مجموعے میں فطرت نگاری کے حوالے سے الگ الگ نظمیں نہیں ملتیں مگر اکثر نظموں اور غزلوں میں مضامین فطرت کی بہار دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے ذیل میں ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر عبدالمغنی کی جو رائے نقل کی ہے، وہ سند کا درجہ رکھتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

> ''اس مجموعے میں وطنیت، اسلامیت اور انسانیت کے موضوعات پر الگ الگ تخلیقات نہیں ملیں گی۔ نہ فطرت ومحبت کے مضامین پر کوئی الگ تخلیق پائی جائے گی لیکن ان سبھی موضوعات کے انضمام وادغام سے روبہ پذیر ہونے والی متعدد اہم اور عظیم

نظمیں بالِ جبریل کو غزلوں کی طرح نظموں کا بھی بہترین اُردو مجموعہ ثابت کرتی ہیں۔"

اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے ورڈز ورتھ کی مشہورِ زمانہ نظم Daffodils کی فطرت بیانی کا موازنہ مبسوط دلائل کے ساتھ حضرت علامہ کی نظم "لالۂ صحرا" سے دلچسپی پیرائے میں کیا ہے اور تقابل کا صحیح معنوں میں حق ادا کیا ہے۔

"لالۂ صحرا" کے ضمن میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ایک منقولہ قول ملاحظہ ہو:

"فطرت اقبال کا وسیلۂ فن ہے اور ورڈز ورتھ کا مقصدِ فن بحیثیت شاعر یہی فرق اقبال کی مضبوطی کا سبب ہے اور ورڈز ورتھ کی کمزوری کا۔"

ایک اور مثال بلیغیات نظم "جاوید کے نام" کے ذیل سے:

"دل فطرت شناس کے بغیر مناظرِ فطرت اور مظاہرِ فطرت سے ہم کلام نہیں ہوا جا سکتا۔ نئے صبح و شام اور نیا زمانہ پیدا کرنے کے لیے اپنے مقام سے آگاہی ضروری ہے اور اسی کا نام خودی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے بالِ جبریل کی ایک اور خصوصیت کو نمایاں کیا ہے، کہ اس کی غزلوں کو جدید غزل کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے اور فطرت نگاری کے حوالے سے پہلی صدی عیسوی کے سنسکرت شاعر بھرتری ہری کے خیالات سے ماخوذ یہ شعر فطرت سے اثر پذیری کے حوالے سے خاصے کی چیز ہے:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

بابِ ششم:

اس باب کے جائزے میں ڈاکٹر صاحب نے حضرت علامہ کی ۱۹۳۶ء میں شائع ہونے والی کتاب "ضربِ کلیم" کے ساتھ ساتھ فارسی اُردو مجموعہ "ارمغانِ حجاز" کی اُردو غزلوں، نظموں، قطعات اور رباعیات وغیرہ میں فطرت نگاری کے حوالے سے شامل کیا ہے۔ "ضربِ کلیم" کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"علامہ اس کتاب کا نام "صورِ اسرافیل" رکھنا چاہتے ہیں جس کا پس منظر شاید یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کی بیداری کے نغمے ہیں۔ علامہ نے اس کتاب میں اپنے افکار براہِ راست بیان کیے ہیں۔ رموز و علائم کا سہارا بھی بہت کم لیا ہے۔ فطرت نگاری بھی براہِ راست انداز میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ تاہم جگہ جگہ فطرت کی زبان سے بات کی ہے اور اسے اپنے پیغام میں تمثیلی انداز پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ (ص ۲۹۶)

جبکہ "ارمغانِ حجاز کے اُردو کلام کا ایک چوتھائی حصہ فطرت نگاری کے عناصر پر مشتمل ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت علامہ نے مظاہرِ فطرت کی زبان میں بات ضرور کی ہے مگر وہ اس انداز میں ہے کہ پڑھنے اور سننے والا براہِ راست اُن مناظر میں کھو جانے کے بجائے اشعار کے اصل پیغام پر اپنی توجہ مرکوز رکھے۔

اسی باب میں مغربی رومانوی اور فطرت نگار شعرا کے ساتھ تقابل میں ایک منقولہ قول آپ کے ذوقِ سلیم کی نذر:

> ''کرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج ہونے کی شاعرانہ مثال اقبال سے بڑھ کر کسی دنیائے ادب میں قائم نہیں کی ہے۔ وہ انگریزی کے مابعد الطبیعی شعرا (Metaphysical Poets) سے بدرجہا شدت سے اپنے افکار کو محسوس کرتے ہیں اور اسی شدت احساس کو اپنی زبردست فن کاری سے نغمۂ فن میں ڈھال دیتے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب کے بموجب چونکہ اقبال کا فلسفۂ خودی بھی فطرت سے اخذ تاثر کا نتیجہ ہے۔ اس لیے ضربِ کلیم کی نظمیں اور کئی قطعات فطرت نگاری کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر توقیر احمد خان کا ایک قولِ بلیغ نقل فرمایا ہے جو تقابلِ اقبال ورڈز ورتھ کی اہمیت کے پیشِ نظر من وعن یہاں نقل کیا جاتا ہے:

> ''جوئے کوہستان کا پیکرِ فطری پیکر تراشی کا نمونہ ہے۔ اقبال نے فطرت سے جو لگاؤ اور نسبت قائم کی ہے، وہ حسن آفریں نہیں ہے بلکہ اُن کے یہاں ان اشیاء کا تصور فکری اور مقصدی رجحانات کے زیرِ اثر ملتا ہے۔ اس طرح اقبال کی فطرت نگاری، ورڈز ورتھ کی فطرت نگاری سے جدا ہے۔''

بابِ ہفتم:

اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے اقبال کی فطرت نگاری کے ہم عصر شعراپر سہ جہتی اثرات کا سراغ لگایا ہے۔ یہ ہم عصر شعرا بزرگ شعرا، نوجوان ہم عصر، کم سن ہم عصر ہیں مگر ڈاکٹر صاحب نے اس طویل اور بے نتیجہ بحث میں پڑنے کے بجائے ایسے ہم عصروں میں اقبال کی فطرت نگاری کے اثرات ڈھونڈے ہیں جو یا تو اُن کے ہم عمر ہیں یا عمر میں چھوٹے۔ ان شعرا میں ریاض خیرآبادی، نازش بدایونی، فانی، نادر کاکوروی، مولانا ظفر علی خان سے لے کر سیماب اکبرآبادی، اصغر گونڈوی، یاس یگانہ چنگیزی، خوشی محمد ناظر، جگر مرادآبادی، جوش، فراق، شکیل بدایونی اور حفیظ جالندھری جیسے شعرا شامل ہیں۔ فطرت نگاری کے ضمن میں جدید اُردو شعراء پر علامہ اقبال کے اثرات کے اثبات میں ڈاکٹر صاحب نے کلامِ شعرا سے جستہ جستہ مثالوں اور شرح وبسط کے ساتھ عمیق مطالعہ کے بعد شاملِ تحقیق کیے ہیں۔ حتیٰ کہ جوش جیسے اقبال مخالف کے کلام سے بھی بہت مضبوط دلائل فراہم کیے ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا حسرت موہانی کا خصوصی مطالعہ بھی اس باب میں شامل ہے۔ جس میں کسی حد تک اقبال اور حسرت کی فطرت نگاری کا موازنہ کیا گیا ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ اقبال کا اپنے ہم عصروں سے موازنہ کسی طور نہ تو ممکن ہے اور نہ جائز۔ کیوں کہ اقبال کے ہم عصر شعرا کی فطرت نگاری اقبال کے زیرِ اثر تھی۔ تاہم اُن کے ہاں وہ قوت اور لہجے کی انفرادیت پیدا نہ ہو سکی جو اقبال کا خاصہ ہے کیوں کہ اقبال نے فطرت نگاری کو فکری ترفع عطا کیا ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقبال کے زیرِ اثر فطرت نگاری نے باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کی۔ جو کہ ہمیں اُن کے معاصرین میں رواں دواں نظر آتی ہے۔ انھی میں اقبال کی تقلید کی کوششیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں مگر اس مشکل راستے پر چلنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ کیوں کہ اقبال کے لیے جو کام اُن کی ذہنی وفکری دسترس اور اُپج کے باعث آسان، دلکش و دل نشین تھا، وہ دوسروں کے لیے ہمالہ عبور کرنے کے برابر تھا۔

خلاصہ کلام:

اس پورے تحقیقی مقالے سے اگر ہم چیدہ چیدہ نکات جمع کریں تو انھیں کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اقبال نے فطرت نگاری کو وجدانی احساسات سے ہم کنار کر کے ایک منفرد مقام حاصل کیا۔

۲۔ انھوں نے فطرت کے جس مظہر کو بھی موضوعِ سخن بنایا، اس میں اپنے فن اور فکر سے جان ڈال دی اور ایسی جان ڈالی کہ خود فطرت بھی اپنے اوپر رشک کرے۔

۳۔ مشرق و مغرب کے تمام نظریاتِ فطرت کا اقبال نے بغائر مطالعہ کیا اور نہ صرف یہ کہ ہر فلسفے کو تنقیدی و تحقیقی انداز میں پرکھا بلکہ اس کا تاریخی شعور بھی جانچا۔

۴۔ شاعری میں فطرت نگاری کو جس انداز میں حضرت علامہ نے برتا ،مشرق و مغرب میں اس کی مثال ملنا محال ہے اور دورِ جدید کے مشرقی و مغربی ناقدین و محققین نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ نہ صرف حضرت علامہ کا اُسلوب ،فطرت سے مستعار لیا ہوا ہے بلکہ حضرت علامہ نے اپنے تصورات بھی فطرت سے اخذ کیے ہیں۔

۵۔ اقبال کے فلسفیانہ تصورات بھی فطرت سے اخذ شدہ ہیں۔اس طرح انھوں نے فطرت نگاری سے عظیم کام لیا ہے۔

۶۔ اپنے پیغام اور فکر کی ترسیل و ترویج کے لیے بھی فطرت نگاری کو ایک اہم ذریعے کے طور پر استعمال کیا ہے۔

۷۔ ہماری ذہنی مرعوبیت اور افسوس ناک تساہل کے باعث ہم فطرت نگاری کے ضمن میں
اقبال کی شاعری کو پوری دنیا کے سامنے اُس طرح پیش نہ کر سکے جیسے حق بنتا تھا۔ورنہ یورپ میں فطرت نگاری کے حوالے سے اقبال کو سراہے جانے کا کام انھی کے دور سے شروع ہو چکا تھا اور اس کی بڑی مثال مشہور مغربی نقاد البرائٹ کا اعترافی بیان ہے کہ اقبال، ورڈز ورتھ اور شیکسپیئر سے بڑے شاعر ہیں۔

۸۔ کلامِ اقبال میں فطرت پرستی (جوکہ ورڈز ورتھ وغیرہ مغربی شعرا کی عام روش ہے) کی بجائے جذبۂ تسخیرِ فطرت جو کہ ان کے نظریۂ خودی سے پیوستہ ہے، پوری طرح جلوہ گر نظر آتا ہے۔

تفہیمِ اقبال اور کلامِ اقبال میں فطرت نگاری کے ضمن میں ڈاکٹر سید منور ہاشمی کی یہ کاوش اُردو ادب میں ایک جاندار تقابلی روایت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تحقیقی مقالے کو نہ صرف بہترین انداز میں شائع کر کے اُردو دان طبقے کے سامنے لایا جائے بلکہ انگریزی ترجمے کی صورت میں انگریزی دان حضرات کے استفادے کی راہ بھی ہموار کی جائے۔

روداد تقریب بحوالہ اقبالیات:

عالمی اُردو مرکز کی مجلس اقبال کے زیرِ اہتمام جدہ کی تاریخ کی ایک عدیم النظیر اور منفرد تقریب منعقد ہوئی۔ غرض وغایت اس تقریب کی یہ تھی کہ علمی وادبی دنیا کی ہر دلعزیز شخصیت، مشہور اسکالر، شاعر اور محقق پروفیسر منور ہاشمی پر عقیدت کے پھول نچھاور کیے جائیں جنھوں نے حال ہی میں "علامہ اقبال کی فطرت نگاری" کے موضوع پر تحقیقی کام مکمل کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ تقریب کی صدارت عالمی شہرت یافتہ پاکستانی شخصیت بابائے انشورنس ڈاکٹر محمد اسحاق جان نے کی جبکہ مفکرِ اسلام علامہ محمد اقبال کے پوتے بیرسٹر آزاد اقبال مہمانِ خصوصی تھے۔ اس تقریب میں پاکستانی سفارت خانے کی نمائندگی ڈاکٹر شعیب اکبر کر رہے تھے۔ تقریب کی خاص بات یہ تھی کہ شہر کے تمام پی ایچ ڈی اسکالر اس میں شریک ہوئے اور ڈاکٹر منور ہاشمی کی علمی وادبی کاوشوں کی بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا۔ تقریب کی حاضری سے اندازہ ہوتا تھا کہ ڈاکٹر منور ہاشمی سے عقیدت اور محبت رکھنے والے اہلِ علم وادب کی تعداد اندازوں اور گمانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ تقریب سبزر ریسٹورنٹ کے وسیع ہال میں منعقد ہوئی جس کی نظامت کے فرائض ریڈیو پاکستان کے کمپیئر اور اناؤنسر محمد اشفاق نے کی۔ تقریب کے باقاعدہ آغاز کے لیے معروف قاری محمد آصف نے تلاوتِ کلام اور ترجمہ پیش کیا۔ ممتاز نعت خوان محمد نواز جنجوعہ نے اس موقع پر حضرت اقبالؒ کا نعتیہ کلام پیش کیا۔

نعتِ رسول مقبولؐ کے بعد عالمی اُردو مرکز کے نائب صدر ممتاز صحافی شاہد نعیم نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ عالمی اُردو مرکز پاکستان سے آنے والی بڑی بڑی ادبی شخصیات کی پذیرائی کے لیے تقریبات منعقد کرتا ہے مگر ہمارے لیے فخر کی بات یہ ہے کہ ان بڑی شخصیات سے بھی بڑی شخصیت ہماری اپنی صفوں میں منور ہاشمی کی صورت میں موجود ہے۔ یہ تقریب ان کی علمی کاوشوں کے اعتراف میں منعقد کی جارہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج پہلی مرتبہ علمی وادبی شخصیات کا بہت بڑا اجتماع ہوا ہے اور یہ ڈاکٹر منور ہاشمی کی عظیم شخصیت کی بدولت ہے۔

تقریب کے میزبان، ناظمِ مجلسِ اقبال حبیب صدیقی نے اس موقع پر نثری اور منظوم خراجِ تحسین ڈاکٹر منور ہاشمی کو اس طرح پیش کیا:

آج کا دن کیجیے مردانِ باہمت کے نام
آج کی تقریب اہلِ علم کی عظمت کے نام
آیئے سید منور ہاشمی کو داد دیں
منصبِ علمی کے پانے پر مبارک باد دیں
خوب ہے تحقیقِ علمی کے لیے عنوانِ کار
شاعرِ مشرق بطورِ شاعرِ فطرت نگار

معروف شاعر آفتاب ترابی نے ڈاکٹر منور ہاشمی کے لیے اپنی عقیدت کے پھول کچھ اس انداز سے پیش کیے:

روشن ہے تری فکر تو اخلاق منور
لہجہ ترا ہر زہر کا تریاق منور
اقبال کے فن پر جو قلم تیرا اُٹھا ہے
لفظوں کی صداقت سے ہے اوراق منور

ممتاز سکالر پروفیسر ڈاکٹر فیض محمد (کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی) نے پی ایچ ڈی کے لیے ڈاکٹر منور ہاشمی کے تحقیقی مقالے کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی اور اسے بہت بڑا علمی کارنامہ قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اقبالیات میں تحقیق کر کے ڈاکٹر منور ہاشمی نے قومی و ملی تقاضے پورے کیے ہیں۔ ڈاکٹر فیض محمد کے بعد ممتاز شاعر محسن علوی نے ڈاکٹر منور ہاشمی کی علمی وادبی خدمات کا منظوم اعتراف کیا:

خیال و فکر کو گر نسبتِ اقبال ہو حاصل
تو ایسے لوگ ہی قوموں کو خوابوں سے جگاتے ہیں
سند اقبالؒ پر پائی منور ہاشمی نے یوں
کہ محسنؔ شعر خود ہوکر منور جگمگاتے ہیں

محسن علوی کے بعد منفرد لہجے کے شاعر محمد مختار علی نے ڈاکٹر منور ہاشمی کو منظوم خراج تحسین پیش کیا:

حریم شب میں لاکر شمع امکانات رکھتا ہے
جہاں بھی جائے وہ اپنا تشخص ساتھ رکھتا ہے
سخن اقبال کے افکار سے پُرنور ہو جس کا
وہی شاعر شعورِ گردشِ حالات رکھتا ہے

معروف کالم نگار اور ادیب ڈاکٹر حسین احمد پراچہ نے اس موقع پر ڈاکٹر منور ہاشمی کے تحقیقی مقالے کے حوالے سے گرانقدر خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اقبالیات میں تحقیقی کام آسان نہیں ہے۔ منور ہاشمی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک عظیم اور وقیع موضوع پر قلم اٹھایا۔ انھوں نے کہا کہ سندھ یونیورسٹی کی طرف سے منور ہاشمی کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری خود یونیورسٹی کے لیے بھی اعزاز ہے کیوں کہ منور ہاشمی ایک نادرِ روزگار اور نامور شخصیت ہیں۔ ایسے لوگ اداروں کی عزت اور ناموس ہوا کرتے ہیں اور انھی کے دم سے ادارے اپنی پہچان بھی کرواتے ہیں۔ جدید لہجے کے شاعر اطہر عباسی نے اپنے خوب صورت اشعار میں ڈاکٹر منور ہاشمی کے لیے عقیدت اور محبت کا اظہار کیا:

تحریر ہے تری کہ ہے دانش کدہ کوئی
لگتا ہے ہر خیال نے ڈھونڈا ہے گھر ترا

حسنِ خیال تیرا دکھاتا ہے راستے
ہے دور تک جمالِ غزل میں اثر ترا

اُردو اور پنجابی کے معروف شاعر طاہر جمیل نے دونوں زبانوں میں ڈاکٹر منور ہاشمی سے محبت کا منظوم اظہار کیا:

وقت کے نقاد بھی اس بات کے ہیں معترف
شاعرِ آفاق ہے یہ اُردو مرکز کا امیر
شاعروں کی بزم میں ہے یوں منور ہاشمی
ایٹمی ٹیکنالوجی میں جس طرح عبدالقدیر

اس موقع پر معروف شاعر نسیم سحر نے بھی نثری اور منظوم خراج تحسین ڈاکٹر منور ہاشمی کی خدمت میں پیش کیا۔ معروف سائنسدان پروفیسر ڈاکٹر اطہر سعید نقوی نے علامہ اقبال کے فکر وفلسفہ اور ڈاکٹر منور ہاشمی کی خدمات کو موضوع بناتے ہوئے تفصیلی اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ اقبال عالمِ اسلام کا سرمایہ ہیں اور منور ہاشمی اقبالیات کا سرمایہ۔ اس موقع پر مشہور عرب شاعر شیخ عمر سالم السیدوس نے عربی اور اُردو زبان میں ڈاکٹر منور ہاشمی کے لیے محبت کے پھول پیش کیے۔ ان کے ایک شعر کا اُردو ترجمہ:

''منور ہاشمی اور ان کا خاندان علم و ادب کا سرمایہ ہیں۔ منور ہاشمی عظمتِ علمی کا ایک مینارۂ روشن ہے۔''

معروف صحافی امیر محمد خان نے اس موقع پر ڈاکٹر منور ہاشمی کے تحقیقی مقالے سے ایک اقتباس پڑھ کر سنایا اور کلامِ اقبال بھی پیش کیا۔ حامد اسلام (ناظم تقریبات عالمی اُردو مرکز)، سید اشتیاق احمد (ممبر منتظمہ) اور مہتاب (ممبر منتظمہ) نے بھی ڈاکٹر منور ہاشمی کے تحقیقی مقالے سے اقتباسات پیش کیے اور داد حاصل کی۔

اب باری تھی صاحبِ شامِ اعزاز ڈاکٹر منور ہاشمی کی جو تالیوں کی گونج میں ڈائس پر تشریف لائے۔ انھوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال امامِ فلسفہ ہیں لیکن مصورِ فطرت کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ مشرق و مغرب میں سب سے بڑا ہے۔ انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال ایسے پارس ہیں کہ ان کے ساتھ مس ہونے والے لوہے کے سب ٹکڑے سونے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے مادرِ علمی سندھ یونیورسٹی کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر منور ہاشمی نے اقبالیات سے متعلق متعدد سوالوں کے جوابات بھی دیے۔ اس کے بعد مہمانِ خصوصی بیرسٹر آزاد اقبال نے اقبالیات میں پی ایچ ڈی کرنے پر ڈاکٹر منور ہاشمی کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر منور ہاشمی کا تحقیقی کام عظیم قومی خدمت کا درجہ رکھتا ہے۔ انھوں نے اس موقع پر منور ہاشمی کو منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا۔ پاکستانی سفارت خانے کی نمائندگی کرتے ہوئے ڈاکٹر شعیب اکبر نے کہا کہ ڈاکٹر منور ہاشمی جیسی علمی و ادبی شخصیات معاشرے کی عظمتوں کا معیار ہوتے ہیں۔ انھوں نے بھرپور لفظی خراج پیش کیا۔ صدرِ تقریب، بابائے انشورنس ڈاکٹر محمد اسحاق خان نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ علامہ اقبال کے فکر وفن کی مختلف جہات پر بہت سا تحقیقی کام ہو چکا ہے لیکن ابھی تک بہت سے پہلو تشنۂ تحقیق ہیں۔ ڈاکٹر منور ہاشمی نے ایک اچھوتے اور نادر موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اس لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر منور ہاشمی

بطور محقق

ڈاکٹر منور ہاشمی بطورِ محقق

پروفیسر رابعہ تبسم

جب میں نے مندرجہ بالا عنوان پہ مضمون پہ لکھنے کا ارادہ کیا تو ڈاکٹر صاحب کا مسکراتا ہوا چہرہ میری یادوں کی سکرین پہ چھن سے لہرایا جب وہ ڈاکٹر فاروق کو اپنی کتاب ''تجزیات'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) پیش کر رہے تھے اور فاروق صاحب ان سے کہہ رہے ہیں اس میں میرے بارے میں بھی کچھ لکھا ہے تو ڈاکٹر صاحب اپنی مخصوص دھیمی دھیمی آواز اور مسکراہٹ سے جواب دیتے ہیں ''ساری کتاب ہی آپ کے نام ہے'' ''انتساب والا صفحہ دکھاتے ہیں۔ جس کے ساتھ ہی کمرے کی فضا ایک اپنائیت بھری خوشی سے مہک سے اُٹھتی ہے۔ پھر میں نے ایک ہی نشست میں ساری کتاب پڑھ ڈالی۔ گیارہ مضامین پر مشتمل یہ کتاب نہ صرف عام قاری کی تشنگیٔ علم کی تشفی کرتی ہے بلکہ تحقیق کے طالب علم کی بھی کماحقہٗ رہنمائی کرتی ہے۔ عنوانات کا چناؤ اور مضامین کی ترتیب مصنف کی پختہ کاری کا بین ثبوت ہے۔ ہر مضمون کی تیاری میں دس سے لے کر تیس تک حوالہ جات سے استفادہ کیا گیا ہے جو لکھاری کی محنت، عرق ریزی اور وسیع مطالعے کا مظہر ہے۔ علم کے بحرِ بیکراں سے سُچے موتیوں کو چُن چُن کر ایسے پرویا ہے کہ قطار در قطار جگمگاتی لڑیاں پڑھنے والے کو مسحور کرتی چلی جاتی ہیں۔ اپنی بات کو بیان کرنے کے لیے خوبصورت لفظوں کا انتخاب، لفظوں کو سمجھانے کے لیے اُن کے تمام ممکنہ معانی کا استعمال قاری کے لیے سوچ کے نئے نئے زاویے وا کرتا جاتا ہے مثلاً ''اقبال کا تصورِ فطرت'' میں فطرت کے وہ تمام معانی اور استعمال جمع کر دیے گئے ہیں جو کسی بھی شاعر یا مضمون نگار نے موقع کی مناسبت سے استعمال کیے ہیں یوں ایک طالب علم اس لفظ کو اس کی تمام تر گہرائیوں سے با آسانی سمجھ سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر اس لفظ کو قرآن و احادیث میں جس طرح استعمال کیا گیا ہے اس کا حوالہ بلاشبہ لاجواب ہے۔ اقبال کے وہ تمام اشعار جو فطرت کی نمائندگی کرتے ہیں، پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اقبال کے شعروں میں فطرت کے استعمال کی ایک دلنشیں تشریح ملاحظہ فرمائیں:

> ''اب اقبال اور فطرت دونوں ایک دوسرے کا درد محسوس کرتے ہیں۔ شناسائی آشنائی کی سرحدوں سے گزر کر گہری محبت کا روپ دھار لیتی ہے، اب شاعر کا ذوقِ آرائش جمالِ فطرت کے گیسو سنوارنا چاہتا ہے صرف انسان ہی فطرت سے محبت نہیں کرتا فطرت بھی انسان سے محبت کرتی ہے۔''

''حالی اور شبلی کے فکری اشتراکات'' میں حالی اور شبلی کو یوں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

> ''مولانا حالی دہلوی مزاج اور تہذیب وثقافت جبکہ مولانا شبلی لکھنوی طرزِ زندگی کا ایک نمونہ تھے۔ دونوں میں عمروں کا فرق ضرور تھا مگر ذہنی طور پر برابر محسوس ہوتے تھے کیونکہ ایک مشن پر ایک ہی جذبے کے تحت کام کا آغاز کیا تھا۔ حصولِ علم، خدمتِ ملت کے اسی جذبے نے انہیں علی گڑھ کا راستہ دکھایا تھا۔ علی گڑھ کے جوہری نے انہیں اپنے حلقۂ رفاقت میں فوری طور پر داخل کیا اور ان سے بڑے بڑے کام لینے کی منصوبہ بندی کی۔ یہ ایک بحرانی دور تھا۔ اس بحران نے امتِ مسلمہ کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ ہر طرف مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ ہندو اور انگریز جو مسلمان قوم کو زبوں حالی میں دھکیلنے کی سازش میں برابر کے شریک تھے، یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب قوم کا ابھرنا ناممکن ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ بحرانوں کی کوکھ سے ہی شخصیات ابھرتی ہیں جو انقلابات کا باعث بنتی ہیں۔ سرسید نے ایسے ہی نابغے اپنے اردگرد جمع کر لیے تھے۔''

''حسرت موہانی پر اقبال کے اثرات'' میں حسرت کی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوے رقمطراز ہیں:

''حسرت کی طبیعت اثر پذیری کی خو رکھتی تھی اور بہت جلد متاثر ہوتی تھی۔ حوالے کے لئے یہ شعر پیش کیا:

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

عشق کا تصور حسرت کے ہاں اساتذہ قدیم سے اخذ کیا ہوا تھا۔ ان کا محبوب ایک گوشت پوست کا انسان تھا جس کے اعضائے جسم کی تعریف ان کے تصورِ عشق کا ایک انداز تھی مگر ایک وقت آیا کہ وہ اقبال کے تصورِ عشق کے بہت قریب ہو گئے۔''

''ابنِ دبیر: جدید مرثیہ نگاری کا نقشِ اول'' سے قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام کی فصاحت و بلاغت، جامعیت، مضامین، موضوعات کی وسعت اور جذبات و احساساتِ عقیدت کی فراوانی کے باعث پہلی دفعہ مرثیے کو صنفِ ادب کا درجہ ملا۔ پورا مضمون بار بار پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ابنِ دبیر یعنی مرزا اوج کی شاعری سوچوں کی کن بلندیوں کو چھوتی ہے یہ پیرہ دیکھئے:

''اوج نے اپنے دور کے سماجی مسائل اور اخلاقی پہلوؤں کو مرثیے میں شامل کیا۔ سماجی تنقید کے تمام تر زاویے اوج کے سامنے تھے۔ جن کا ہر لحہ اسے احساس تھا۔ اس کو یہ بھی خیال تھا کہ مرثیہ کسی ایک طبقے یا قوم کے لیے مخصوص و محدود نہیں ہونا چاہئے لہٰذا اس نے دنیا کی بے ثباتی، احساسِ فرض، تہذیب و ثقافت، سلیقہ، ہنر مندی، مادری زبان میں حصول تعلیم کی ترغیب کے مضامین اپنے مرثیے میں شامل کئے۔ اس طرح مرثیے کو اصلاح قوم کا ذریعہ بنایا۔ ابنِ دبیر کا ایک سنہری جملہ، مذہب کی تبلیغ الفاظ سے نہیں کردار سے ہونی چاہئے۔''

ڈاکٹر صاحب جس طرح عام زندگی میں نرم گفتار ہیں وہی خوبی ان کی تحریر میں بھی پائی جاتی ہے۔ دیکھئے متضاد باتوں کو کیسے ہلکے پھلکے انداز میں بیان کرتے ہیں۔

''بعض نقادوں کے خیال میں انیس، دبیر سے بڑے شاعر تھے جبکہ تجربے کے مطابق دبیر کا مرتبہ بھی کم نہیں ہے بلکہ بعض خصوصیات کے باعث دبیر کا مقام انیس سے بھی بہتر قرار دیا گیا ہے۔''

مجید امجد کے بارے میں کہتے ہیں:

''ناقدین مجید امجد کی شاعری کا موازنہ فیض، میرا جی اور ن۔م۔راشد کے ساتھ کرتے ہیں۔ میرا یہ مقصود ہرگز نہیں کیونکہ میں ان تینوں کو بہت اہمیت دیتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ جو آفاقیت فیض کے ہاں پائی جاتی ہے وہ مجید امجد کے ہاں شاید نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ بڑا نظم گو ہے کیونکہ اس کی شاعری کا خمیر اپنی مٹی سے وجود میں آیا ہے اس نے انتہائی چھوٹے چھوٹے پیش پا افتادہ مضامین کو اہمیت دی ہے اور اپنی شاعری کے ذریعے غیر اہم کو بھی اہم ثابت کیا ہے۔''

میرے خیال میں اس کتاب کا سب سے اہم باب ''ادب، معاشرہ اور وحدتِ فکر'' ہے۔ ادب کی تین قسموں کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''میرے خیال میں ادب کی تخلیق کا واحد مقصد معاشرے میں فکری وحدت کا فروغ ہے جس کے ذریعے ایک معاشرے کو پاکیزہ نظریاتی اور مستحکم معاشرہ بنایا جا سکتا ہے۔ ادب جب سوچ کو کوئی ایک زاویہ دینے کے بجائے مختلف زاویوں میں تقسیم کر دے

گا۔ ذہنی و فکری توڑ پھوڑ کا ذریعہ بنے گا اور یقیناً ایسا ادب معاشرے کے لیے زہرِ قاتل بن جائے گا۔
تمام صوفی شعرا کے کلام کا مرکزی نقطہ محبت ہے۔ یعنی انسانوں کی آپس کی محبت اور ان کی دیگر مخلوقات سے محبت یہی وہ نقطہ ہے جو تمام انسانوں کو یگانگت عطا کرتا ہے۔"

"دیارِ عشق میں میں اپنا مقام پیدا کر" ایک ایسا مضمون ہے جو قاری کو عشق اور خودی کی نئی لذتوں سے آشنا کرتا ہے کہتے ہیں:

"خودی کے لفظ کو فکرِ اقبال سے وابستہ ہونے سے پہلے انتہائی ناپسندیدہ معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ سرسید کے مطابق، خودی ایک برباد کرنے والی چیز ہے، جب یہ چپ چاپ سوئی ہوتی ہے تو خوشامد اسے بیدار کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس اقبال نے اسی لفظ کو وہ شوکتِ مفہوم عطا کی ہے کہ دنیا عش عش کر اٹھی۔ یہ لفظ زمین کی تہوں سے نکل کر آسمان کی رفعتوں میں پہنچا انہوں نے خودی کو نیابتِ الٰہی قرار دیا: جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے اپنے رب کو پہچان لیا۔"

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

اقبال نے عشق کو ایک مقدس ترین لفظ بنا کر کچھ اس طرح رفعت آشنا کیا:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

یوں اقبال نے ایک عامیانہ سمجھے جانے والے لفظ کو مقدس و مطہر بنا دیا۔"

اور "اقبال کی نظم شکوہ، جوابِ شکوہ کا تجزیاتی مطالعہ" تو پوری ایک نشست کا تقاضا کرتا ہے لہٰذا اس کو کسی اور موقع کے لیے چھوڑتی ہوں۔ اب ڈاکٹر صاحب ایران جا پہنچے ہیں اور ایران کی سرزمین پہ انقلاب کے بیج بونے والے ڈاکٹر شریعتی جنہیں جلاوطن کر کے شہید کر دیا گیا تھا، سے اقبال کی خودی کے بارے ہم کلام ہیں اور ان کے افکارِ دلپذیر سے قاری کو فیضیاب کر رہے ہیں، فرماتے ہیں:

"اہلِ ایران کو افکارِ اقبال سے روشناس کرانے میں ڈاکٹر شریعتی کا سب سے زیادہ کردار ہے۔ انہوں نے مشہد میں اقبال کے افکار کی تشریح و توضیح کے لیے باقاعدہ خطبات کا اہتمام کیا اور ان خطبات پر مشتمل دو کتابیں تصنیف کیں جن کے سینکڑوں ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر شریعتی نے اقبال کو "علی نما" کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ ڈاکٹر شریعتی اقبال کے فلسفۂ خودی سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ وہ اس فلسفے کو کائنات کی بہت بڑی قوت خیال کرتے تھے اور یہ اقبال کے اثرات کا نتیجہ تھا۔ شریعتی کے جسم میں اقبال کی روح کا حلول کر جانا فلسفۂ خودی کے راستے ہی ممکن ہوا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ خودی میں اصل قوت ہے جس کے ذریعے ملتِ اسلامیہ اپنے آپ کو منوا سکتی ہے اور انفرادی طور پر بھی ایک انسان خدا کے ساتھ رابطے مستحکم کر کے عظمت و جلالت کا حامل ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اس نظریے کو "بازگشت بہ خویشتن" کا نام دیا۔"

عشق کے بارے میں شریعتی کا قول ہے "عشق طاقت و حرارت ہے جو ان کیلوریز اور پروٹینز جو بدن میں داخل ہوتی ہیں، سے پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک نامعلوم سا منبع رکھتا ہے جو تمام بدن میں آگ لگا دیتا ہے اور اسے پگھلا دیتا ہے۔ کتاب کے نویں باب میں نثری نظم کا تجزیہ اہلِ علم کے حوالے سے یوں کرتے ہیں:

''جو لوگ نثری نظم کو نظم کہنے پر مصر ہیں وہ فن اور اصطلاح فن کے گلے پر چھری پھیر رہے ہیں اور اس طرح شاید ان کے دل و دماغ کو تسکین مل رہی ہے۔''

بقول منثور نظمِ منثور محض ایک دماغی عیاشی ہے۔ اسی طرح اور بہت سی مثالوں اور اقوال سے نثری نظم کا ایسا پوسٹ مارٹم کیا ہے کہ قاری کا ذہن واردات کی حقیقت تک آسانی سے پہنچ جاتا ہے۔

''غالب کے فارسی خطوط کی تدوین'' کے عنوان سے ایک ایسا مضمون تحریر کیا گیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ جو پڑھنے والے کی ذہنی تسکین کا باعث بننے کے ساتھ ساتھ پرتو روہیلہ کے عظیم الشان ادبی و علمی کام جو انہوں نے غالب کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ کر کے کیا ہے، سے آگہی فراہم کرتا ہے۔ جس کی لذت اور سحر انگیزی قاری کو روح کی گہرائی تک محسوس ہوتی ہے۔ اس کی عظمتِ شان میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے نقل کی گئی ہے ''غالب کے تمام فارسی مکتوبات کا اردو ترجمہ کرنے پرتو روہیلہ نے ایک پہاڑ جیسا کام کیا ہے، اس عظیم کارنامے پر میں پرتو روہیلہ کو کھڑے ہو کر سلام پیش کرتا ہوں۔''

کتاب کا آخری مضمون ''حالی کی کتاب یادگارِ غالب پر ایک نظر'' میں جہاں حالی کی بے شمار ادبی خدمات پر طائرانہ روشنی ڈالی گئی ہے، وہاں یادگارِ غالب کے کچھ اوجھل گوشوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ادبی خدمات کے حوالے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ حالی ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے حیاتِ سعدی لکھ کر اردو سوانح نگاری کی پہلی اینٹ رکھی جبکہ یادگارِ غالب میں شاگرد ہونے کے ناطے حالی نے استاد کی بہت سی خامیوں کو نہ صرف چھپانے کی کوشش کی بلکہ مختلف توجیہات سے ان کو درست ثابت کرنے کی سعی بھی کی ہے۔ نمونے کے لیے ایک پیرہ نقل کرتی ہوں:

''مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار انھوں نے مقرر کر لی تھی، اس سے زیادہ کبھی نہ پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اس کی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی اور اس کو سخت تاکید تھی کہ رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھ کو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا اور کنجی مجھ کو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے اور نشے کی موج میں داروغہ کو برا بھلا کہتے تھے مگر داروغہ نہایت خیر خواہ تھا، ہرگز کنجی نہ دیتا۔ اول تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے دوسرے اس میں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے۔''

یوں حالی استاد کی وکالت کرتے ہوئے شراب کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ جیسے وہ اس حرام شے کو حلال بنا کر پیتے تھے۔ آخر میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر یونس حسنی سے اتفاق کرتے ہوئے میں یادگارِ غالب کو اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود اردو سوانح نگاری کی تاریخ میں ایک سنگِ میل قرار دیتا ہوں۔''

اور میں بھی آخر میں ڈاکٹر منور ہاشمی کی اس کتاب کو اردو کے میدان میں تحقیق کرنے والوں کے لئے باوثوق قرار دیتی ہوں کہ انھوں نے ''کوگل کو سم میں سمو دیا ہے'' اور ڈاکٹر صاحب کے حلقہ احباب کا ایک فرد ہونے پہ فخر محسوس کرتی ہوں نیز جس طرح ڈاکٹر جمیل جالبی نے پرتو روہیلہ کی کاوش پہ اُن کو سلام پیش کیا ہے اسی طرح اس عظیم الشان تخلیق پر کھڑے ہو کر پاکستان کے اس بطلِ جلیل اردو کو سلامِ عقیدت پیش کرتی ہوں۔

ڈاکٹر منور ہاشمی: محقق اور نقاد

ڈاکٹر اے ایم چشتی

ڈاکٹر منور ہاشمی عصرِ حاضر کے اُردو غزل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ اُن کی سب سے منفرد خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر اُس منظر کا حصہ بن جاتے ہیں جس کا وہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ پھر کشید کردہ منظر کو فکر و فلسفہ کے خوبصورت ملغوبے میں گوندھ کر، فن کی کسوٹی پر چڑھا کر لفظوں کے مخصوص سانچوں میں ڈھال دیتے ہیں جس سے خوبصورت غزلوں کے خوشبودار گلدستے تخلیق پاتے ہیں۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کی غزل خارجی حُسن کے بجائے داخلی ارمان و احساسات کا خوبصورت اظہار ہے۔ غزل کے روشن لفظ اپنی حدت کے ذریعے قاری کی روح کو تازگی فراہم کرتے ہیں جس سے قاری کا حوصلہ بڑھتا ہے اور اس کے اندر مثبت تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ دراصل ڈاکٹر صاحب کی غزل غزلیت کے بھرپور رنگ میں رچی ہوئی ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر منور ہاشمی کو اپنی فنی صلاحیتوں کا خوب ادراک ہے اور اس کا اظہار انہوں نے مختلف اوقات میں مختلف انداز میں اپنی شاعری کے ذریعے کیا ہے۔ چند اشعار عرض ہیں:

زمانے بھر کو خبر ہے کہ میں منوّر ہوں
مرا وجود ضروری ہے روشنی کے لیے(۱)

اک ستارہ ہے منوّر یہ جبینِ فن پر
کیسے ممکن ہے میرا نام مٹایا جائے(۲)

میں تو خود اک پیڑ گھنا ہوں یہ کیسے ہے ممکن
چھوٹے موٹے پودوں کے میں سائے میں دب جاؤں(۳)

لوگوں کو راس آ گئی کوتاہ قامتی
ہم اپنے طولِ قد سے پریشان ہیں بہت(۴)

مندرجہ بالا اشعار سے بعض اوقات گمان گزرتا ہے کہ شاعر نے اپنے لیے فخریہ کلمات کہے ہیں۔ لیکن ہم ان غزلوں کا مجموعی تنقیدی جائزہ لیں جن سے اشعار منتخب کیے گئے ہیں، تو یہ کلمات فخریہ تاثر پیش نہیں کرتے، بلکہ شاعر خیال پیش کرتے ہوئے وجدان کے اُس مقام پر جا پہنچتا ہے جہاں اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ اب اُس کے کلام میں مکمل پختگی آ گئی ہے، اب یہ کلام فنی معیار کے تمام مجوزہ اصولوں کے ترازو میں تولا جا سکتا ہے، تو وہ اپنے اندر خودی کے جوہر کو بلند کرنے کے لیے تعریفی کلمات کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ ڈاکٹر منور ہاشمی موجودہ دور کے صفِ اوّل کے غزل گو شعرا میں شامل ہیں، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اُن کی شخصیت ایک دارالعلوم کی مانند ہے جس میں مختلف شعبۂ اصناف ادب اپنا اپنا رنگ بکھیرے ہوئے ہیں۔ وہ عصرِ حاضر کے نامور محقق، بہترین نقاد، ماہرِ اقبالیات، عہد ساز شاعر، باشعور صحافی، تجربہ کار ماہرِ تعلیم اور اعلیٰ پائے کے دانشور ہیں۔ میری نظر میں اُن کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو ایک نشست میں بیان کرنا یا پھر ایک مضمون میں سمو لینا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے یہاں پر میں صرف اُن کی شخصیت کے دو اہم پہلو، ڈاکٹر منور ہاشمی بطور محقق اور نقاد پر روشنی ڈالنا چاہوں گا۔

ڈاکٹر منور ہاشمی کی تحقیق اور تنقید سے متعلق دو کتب شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی کتاب ''عملی صحافت (تحقیق وتنقید)'' صحافت سے متعلق تحقیقی اور تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے، دوسری کتاب ''تجزیات'' ہے۔ تجزیات وجود کے اعتبار سے بہت مہین، لیکن وسعت کے اعتبار سے بہت وسیع ہے۔ یہ کتاب صرف گیارہ مضامین پر مشتمل ہے۔ دراصل یہ گیارہ مضامین فقط مضامین نہیں، بلکہ گیارہ اہم موضوعات ہیں جن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ محقق نے اپنے موقف کو سچ ثابت کرنے کے لیے متعدد دلیلیں اور ثبوت پیش کیے ہیں۔ دلیل پیش کرتے وقت مناسب تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس عمل نے ڈاکٹر منور ہاشمی کو نامور محققین اور بہترین ناقدین کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

میرے خیال میں مناسب یہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق وتنقید پر بات کرنے سے پہلے مختصراً یہ واضح کر دیا جائے کہ تحقیق اور تنقید کیا ہے اور ادب میں اس کی ضرورت کیوں محسوس کی جاتی ہے۔

تحقیق دراصل سچائی تلاش کرنے کا عمل ہے۔ یہ کھوج لگانے کا عمل ہے۔ جیسے ایک ماہر کھوجی پیروں کے مختلف نشانات شناخت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اور وہ ان نشانات کا کھوج لگاتے اُس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں اُس کا مقصود چھپا ہوا ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک محقق ادب کے ڈھیر میں دبے ہوئے مختلف حقائق تلاش کرتا ہے۔ اپنے موضوع کو مستند اور مسلم بنانے کے لیے مختلف حوالہ جات پیش کرتا ہے۔ اگر وہ شخص تحقیق کے اس عمل میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ محقق کہلائے گا۔ تحقیق کے اس عمل سے ادبی ذخیرے میں اضافہ ہوتا ہے۔ بلکہ نئے نئے نکات زیرِ بحث آتے ہیں جس سے ایک نئی تحقیق کا آغاز ہوتا ہے۔

ایسے ہی نقد کے ذریعے ادبی فن پارے کا مقام ومرتبہ متعین کیا جاتا ہے۔ نقد عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں کھرا یا کھوٹا معلوم کرنا۔ اُردو زبان میں عموماً نقد کی جگہ تنقید کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ تنقید کا مطلب ہے جانچ پڑتال کرنا۔ کسی فن پارے کا معیار مقرر کرنا۔ عموماً جب کسی فن پارے سے متعلق تحقیق کی جاتی ہے تو وہاں کہیں نہ کہیں تنقید کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے تاکہ نتائج میں شفافیت کا عنصر زیادہ واضح ہو سکے۔ تحقیق، تنقید کے بغیر ادھوری تصور کی جاتی ہے۔

دراصل تحقیق اور تنقید لازم وملزوم ہیں۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لیکن بعض معاملات میں تحقیق اور تنقید کا دائرہ کار مختلف ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ تحقیق اور تنقید کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ ایسا صرف اُس وقت ہوتا ہے جب

ہم کسی فن پارے کا صرف ادبی معیار متعین کرنے کے لیے تنقیدی جائزہ لے رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ادب میں عموماً جب کوئی فنکار کسی مخصوص موضوع پر بات کر رہا ہوتا ہے تو وہ اس موضوع کی ہر دو صورتوں تحقیقی اور تنقیدی حوالوں سے چھان پھٹک کرتا ہے تاکہ موضوع کو ہر لحاظ سے مستند اور مسلم ثابت کیا جا سکے۔

جہاں تک ڈاکٹر منور ہاشمی کی تحقیق اور تنقید کا تعلق ہے تو اس حوالے سے اُن کا مرکزی موضوع اقبال کی شاعری اور شاعری میں بیان کیے گئے موضوعات ہیں۔ چونکہ ہاشمی صاحب ماہر اقبالیات ہیں اس لیے انھوں نے اقبال کے تصورِ فطرت، فلسفۂ خودی اور فلسفۂ عشق کو موضوع بنایا ہے اور اپنی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ اقبال نہ صرف اُردو ادب کا نمائندہ شاعر ہے بلکہ وہ پوری مسلم امہ کا نمائندہ شاعر ہے، تھا، اور ہمیشہ رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے ایک مضمون ''اقبال کا تصورِ فطرت'' میں لکھتے ہیں:

> ''علامہ اقبال کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت کئی حیثیتوں کی حامل شخصیت ہیں۔ ایک مفسرِ قرآن، مفکرِ اسلام، دانائے راز، حکیم الامت، شاعرِ مشرق، شاعرِ اسلام، ترجمانِ خودی، راز دارِ بے خودی، مردِ قلندر، امام فلسفہ اور اس کے علاوہ بھی بہت سی حیثیتیں۔ یہ اس لیے کہ اُن کے فکر و فلسفہ کی جہتیں ہی بہت سی ہیں۔ اقبال نے اپنے کلام سے انقلاب کا کام لیا۔ ایک ملتِ خوابیدہ کو چشمِ بیدار اور ایک دلِ مردہ کی حامل قوم کو دلِ زندہ عطا کیا۔ اقبال اسی ہستی کا نام ہے جن کے فکر و فلسفہ پر دنیا میں سب سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود بہت سے پہلو ابھی تشنۂ تشریح طلب ہیں۔''(۵)

ڈاکٹر منور ہاشمی اپنی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کی شاعری اور شاعری میں موجود فکر و فلسفہ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''گویا ان کا شعر محض شعر نہیں بلکہ ایک فکر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر شعر ایک فن پارہ ہے جس کی تشریح و توضیح کے لیے بڑی بڑی کتابیں بھی ناکافی ہیں۔''(۶)

ڈاکٹر صاحب کا خیال یہ ہے کہ اقبال کا شعر محض ایک شعر نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک فکر کی حیثیت رکھتا ہے، ایک ایسی فکر جس کی تشریح و توضیح کے لیے بڑی بڑی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ ہر شعر میں ایک فن پارے ایسی وسعت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف جامعات میں اقبال کی شاعری کی تشریح و توضیح اور تحقیق کے لیے شعبہ اقبالیات الگ موجود ہے۔ جن میں مختلف سکالرز اقبال پر نہ صرف ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھ رہے ہیں بلکہ ماضی میں سینکڑوں مقالے لکھے جا چکے ہیں۔

اقبال کے فلسفۂ عشق پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر منور ہاشمی نے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ زبان و بیان کی سند ہمیشہ شاعری میں تلاش کی جاتی ہے۔ کیونکہ شعرا ہی وہ اہم ہستیاں ہیں جو کسی زبان میں نئے نئے الفاظ تخلیق کرتے ہیں۔ پھر ان الفاظ کی تشریح و توضیح کے لیے نئی نئی فرہنگیں تیار کی جاتی ہیں۔ اس سے ادبی ذخیرہ میں اضافہ کے ساتھ ساتھ نئی فکر اور فلسفہ کے نئے نئے در وا ہوتے ہیں جو مختلف معاشروں کو نئی راہیں متعین کرنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ یہی

فکر اور فلسفہ ایک کامیاب قوم کی میراث ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر منور ہاشمی کے ایک مضمون ''دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر'' سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''زبان و بیان کی سند ہمیشہ شاعری میں تلاش کی جاتی ہے۔ اساتذہ نے جس لفظ کو جس انداز اور جس تلفظ کے ساتھ استعمال کیا آنے والے ادوار کے لغات اور فرہنگیں اس کی پیروی کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ مگر اس روش سے ہٹ کر بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ایک شاعر کے کلام کی تفہیم کے لیے جدید فرہنگیں مرتب کرنی پڑتی ہیں کیونکہ اس نے اپنے پیش رووں سے ہٹ کر زبان کو نئے الفاظ اور تراکیب سے مالا مال کر دیا ہوتا ہے۔ کسی بھی زبان کی تاریخ یہ بتا سکتی ہے کہ ایسے شعرا کی تعداد بہت کم ہوتی ہے اور ایسے شعرا کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے جنھوں نے زبان کو نئے الفاظ و مرکبات سے نوازنے کے ساتھ ساتھ پرانے الفاظ و مرکبات کو نئے مفاہیم و معانی سے بھی ہم کنار کیا ہو'' (۷)

ڈاکٹر منور ہاشمی کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جب بھی کسی فن پارے یا پھر کسی موضوع کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہیں تو وہ اپنی بات کو مستند ثابت کرنے کے لیے موازنے اور مقابلے کا انداز اپناتے ہیں جس سے مقصود نتائج زیادہ بہتر طریق سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ دراصل ایک ذی شعور محقق کا بنیادی کام ہی یہ ہے کہ وہ ادب کے ڈھیر میں سے کسی اہم فن پارے یا موضوع کو اٹھائے، اپنے تجربے اور تحقیق سے اس کی اہمیت واضح کرے، اس عمل کے دوران وہ منتخب کردہ فن پارے یا موضوع کا تنقیدی جائزہ بھی لے جس سے اس کی اہمیت اور وسعت کا اندازہ ہو اور اس کا مقام و مرتبہ متعین کرنے میں آسانی رہے اور بعد ازاں مطالعہ کے دوران قاری کو اس کی اہمیت سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے، یعنی تجزیاتی انداز اپنایا جائے۔ یہی وجہ ہے ڈاکٹر منور ہاشمی نے موضوعات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے تجزیاتی انداز اپنایا ہے۔ مثلاً:

> ''بہر حال ہم دونوں شاعروں یعنی میر انیس اور دبیر میں سے کسی کو بڑا یا چھوٹا قرار نہیں دے سکتے۔ دونوں نے مرثیے کو عمومی سطح سے بلند کر کے ادبی سطح پر فائز کیا۔ اب یہ ایک ایسی صنف ادب ہے جو مذہب کی نمائندگی کے ساتھ خود ہمارے ادب کی نمائندگی کا حق بھی ادا کر رہی ہے۔ اسے معیار اور اہمیت کے اعتبار سے کسی بھی دوسری صنف کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔'' (۸)

دراصل ڈاکٹر منور ہاشمی نے جب ''ابنِ دبیر: جدید مرثیہ نگاری کا نقشِ اوّل'' کے موضوع پر بات کرنا چاہی تو انہوں نے سب سے پہلے ادب کے نامور مرثیہ گو شعرا کے فن پر روشنی ڈالی تاکہ موضوع پر تعمیر کی جانے والی عمارت مضبوط اور خوبصورت ہو اور پڑھنے والوں کے لیے متاثر کن بھی۔ اس عمل سے اپنا نقطۂ نظر کسی دوسرے فرد کو سمجھانے میں آسانی رہتی ہے۔ منور ہاشمی کے نزدیک مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی دبستانِ دبیر کے سب سے اہم رکن اور مرزا دبیر کے اکلوتے صاحبزادے تھے۔ چونکہ اوج لکھنوی نے اپنے گھر کے آنگن میں ہی مرثیے کی بہاریں دیکھیں تھیں اس لیے انہیں مرثیے کی اہمیت کا خوب اندازہ تھا۔ انہوں نے مرثیہ میں تاریخ کو اہمیت دی، فکر اور فلسفہ کو شامل کیا اور مبالغہ آرائی کو ختم کیا۔ مقصدیت کو فروغ دیا۔ اوج لکھنوی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ جب میر انیس اور مرزا دبیر کے بعد مرثیہ زوال پزیر ہوا تو انہوں نے مرثیہ کی گرتی ہوئی

دیوار کو سہارا فراہم کیا اور اپنے بزرگوں کے چھوڑے ہوئے نقش کو مزید مضبوط کیا، بلکہ اسے نئے رخ پر ڈالا۔

دو فن پاروں یا دو شخصیات کا موازنہ و مقابلہ ڈاکٹر منور ہاشمی کا ہمیشہ سے خاصہ رہا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب کے قابلِ ذکر مضامین ''اقبال کی نظم شکوہ، جوابِ شکوہ کا تجزیاتی مطالعہ''، ''حسرت موہانی پر اقبال کے اثرات'' اور ''حالی اور شبلی کے فکری اشتراکات'' بہت اہم ہیں۔ ڈاکٹر منور ہاشمی نے اپنے ایک اہم مضمون ''ادب، معاشرہ اور وحدتِ فکر'' میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ فکری وحدت معاشرے یا قوم کو متحد کرنے میں کردار ادا کرتی ہے۔ اس لیے کسی بھی قوم کے ادیب اور شعرا کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی قوم کو متحد رکھنے کے لیے کسی ایک نظریے کو اپنی گفتگو کا شعار بنائیں، تاکہ قوم انتشار سے بچی رہے۔ اختلافِ رائے ایک دوسری بات ہے۔ کسی کی رائے سے اختلاف کرنا کوئی بری بات نہیں لیکن اپنی رائے کو کسی دوسرے پر زبردستی نافذ کر دینا درست نہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر منور ہاشمی کے مضمون ''ادب، معاشرہ اور وحدتِ فکر'' سے ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے:

> ''جس معاشرے میں ادب اور ادیب مختلف گروہوں میں تقسیم ہوں وہاں ایسا ادب تخلیق پائے گا جو معاشرے کے اذہان کو تقسیم کرنے کا باعث بنے گا۔ سوچ کو کوئی ایک زاویہ دینے کے بجائے مختلف زاویوں میں تقسیم کر دے گا۔ ذہنی و فکری توڑ پھوڑ کا ذریعہ بنے گا اور یقیناً ایسا ادب معاشرے کے لیے زہر قاتل بن جائے گا۔ تو گویا معاشرے کی تقسیم کو روکنے کے لیے ادب اور ادیب کے اندر فکری وحدت کی ضرورت ہے۔ یہ فکری وحدت صرف اس صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب ادب کسی ایک نظریے پر استوار ہو۔''(۹)

بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ڈاکٹر منور ہاشمی کسی موضوع پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک نقطہ نظر سے اختلاف کرتے ہیں تو کسی دوسرے مقام پر اُس کی حمایت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون ''نثری نظم: تجزیاتی مطالعہ'' میں نثری نظم پر گفتگو کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نثری نظم کا شاعری سے کوئی تعلق نہیں، اس سے متعلق انہوں نے مختلف ناقدین کے حوالے بھی پیش کیے ہیں۔ اُن کے نزدیک نثری نظم، نثرِ لطیف تو ہو سکتی ہے مگر نثری نظم نہیں۔ کیونکہ ہیئت کے اعتبار سے نثری نظم شاعری کے کسی بھی اصول پر پورا نہیں اترتی۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے بھی اپنی کتاب ''اصنافِ ادب'' میں نثری نظم کو حصہ نثر میں شامل کیا ہے اور اسے نثرِ لطیف کہا ہے۔(۱۰)

لیکن اس نقطۂ نظر کے باوجود ڈاکٹر منور ہاشمی نے اپنے ایک مضمون ''غالب کے فارسی خطوط کی تدوین'' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ غالب کے خطوط شاعرانہ رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، اس لیے ہم انہیں دورِ جدید کی نثری نظمیں بھی شمار کر سکتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> جب بھی جدید اردو نثر کے ارتقا کی بات کی جائے گی آغاز غالب کے خطوط سے ہوگا۔ یہ خطوط بلاشبہ شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاہم مجھے کہنے میں کوئی باک نہیں کہ انہوں نے شاعری میں جو معیار قائم کیا ان کے خطوط اس معیار تک نہیں پہنچ سکے۔ البتہ ان کی شاعری میں موجود مکالماتی انداز ان کے خطوط میں زیادہ شدت کے ساتھ آیا ہے۔ ان کے اردو خطوط اپنی جگہ شاعرانہ

رنگ بھی رکھتے ہیں۔ ہم انہیں دورِ جدید کی نثری نظمیں بھی شمار کر سکتے ہیں۔ (۱۱)

میرے خیال میں غالب کے خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے جب ڈاکٹر صاحب نے مذکورہ خطوط کو نثری نظم کا درجہ دیا تو انہیں فوراً احساس ہوا کہ میں نے تو اس نقطۂ نظر، یعنی نثری نظم کو شاعری کا حصہ ماننے پر اختلاف کیا ہے، تو انہوں نے فوراً اپنی گفتگو کا رخ بدلا اور یہ جملہ دے مارا کہ "اگر نثری نظم شاعری ہے تو ان (غالب) کے سارے خطوط منظوم قرار پائیں گے۔" (۱۲)

دراصل اس نقطے کا یہاں پر بیان کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جب کوئی محقق یا نقاد کسی موضوع پر بات کرتے ہوئے اس حد تک باریک بینی سے کام لیتا ہے تو اس کی تحقیق اور تنقید کا معیار بہت بلند ہو جاتا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے ڈاکٹر صاحب کی ذاتی رائے تو یہ ہے کہ نثری نظم کا شاعری سے کوئی تعلق نہیں، لیکن اگر ناقدینِ ادب کی اکثریت کوئی ایسا اصول وضع کر لیں جس سے نثری نظم شاعری کے دائرہ میں شامل ہو جائے تو غالب کے خطوط، منظوم نظمیں کہلائیں گی اور انہیں شاعری کی ذیل میں شامل کر لیا جائے گا، اور کسی محقق اور نقاد کی ایسی رائے اسے اپنے ہم عصر محققین و ناقدین سے منفرد و اعلیٰ مقام پر لا کھڑا کرتی ہے، کیونکہ حقائق کو تسلیم کر لینا ہی اعلیٰ شعور کی نشانی ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ واضح ہوا کہ ڈاکٹر منور ہاشمی نے جس موضوع کو بھی چھوا، اسے تحقیق اور تنقید کے مجوزہ اصولوں کی کسوٹی پر چڑھا کر خوب چھان پھٹک کی، موضوع کی اہمیت اور اصلیت پر مکمل روشنی ڈالی، پھر ایک مخصوص نکتہ ترتیب دیا، ایک ایسا نکتہ جو حلقۂ ادب کے ذی شعور محققین اور ناقدین کے لیے خاص اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس سے مزید تحقیق و تنقید کے در وا ہوتے ہیں اور پھر ادب کے میدان میں نئے نئے فکری مباحث کا آغاز ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ منور ہاشمی، ڈاکٹر، غزل اے غزل (کلیاتِ غزل)، مرتب: ڈاکٹر قمر الطاف، دنیائے اُردو پبلی کیشنز، اسلام آباد، فروری ۲۰۱۶ء، ص ۱۵۳

۲۔ ایضاً، ص ۲۷۱ ۳۔ ایضاً، ص ۷۱ ۴۔ ایضاً، ص ۱۲

۵۔ منور ہاشمی، ڈاکٹر، مضمون: اقبال کا تصورِ فطرت، مشمولہ: تجزیات (تحقیقی و تنقیدی مضامین)، دنیائے اُردو پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۱۲، ۱۳

۶۔ ایضاً، ص ۱۳

۷۔ منور ہاشمی، ڈاکٹر، مضمون: دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر، مشمولہ: تجزیات (تحقیقی و تنقیدی مضامین)، ص ۰۷

۸۔ منور ہاشمی، ڈاکٹر، مضمون: ابنِ دبیر: جدید مرثیہ نگاری کا نقشِ اول، مشمولہ: تجزیات (تحقیقی و تنقیدی مضامین)، ص ۴۱

۹۔ منور ہاشمی، ڈاکٹر، مضمون: ادب، معاشرہ اور وحدتِ فکر، مشمولہ: تجزیات (تحقیقی و تنقیدی مضامین)، ص ۶۳

۱۰۔ رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹۳

۱۱۔ منور ہاشمی، ڈاکٹر، مضمون: غالب کے فارسی خطوط کی تدوین، مشمولہ: تجزیات (تحقیقی و تنقیدی مضامین)، ص ۱۱۳

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۱۳

’’حکایتِ ہاشمی‘‘ کا جائزہ:

میرے دل میں ہے

ناصر زیدی

منور ہاشمی میرے دوست ہیں، میں انھیں ایک اچھے غزل گو شاعر کی حیثیت سے برسوں سے جانتا ہوں، اب اچانک انھوں نے اپنی زیرِ نظر نثری کاوش پڑھنے اور کچھ لکھنے کو دی تو وہ ایک اور رخ سے میرے سامنے عیاں ہوئے۔ روزمرہ کے ان سادہ، سیدھے، سچے واقعات میں انور مسعود صاحب کی طرح میں بھی کہیں کہیں شریک ہوں۔ عملی طور پر منور ہاشمی میں موجود چھوٹی سے چھوٹی مگر اہم انسانی صفات کا میں بچشمِ خود شاہد رہا ہوں۔ منور ہاشمی بلا شبہ عالمِ باعمل قسم کے انسان ہیں یعنی:

ع:　کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق

منور ہاشمی محض کہتے نہیں، کرتے بھی ہیں جو ان کے ضمیر کی آواز سے ہم آہنگ ہو۔ ’’حکایاتِ ہاشمی‘‘ کی اصل خوبی یہی ہے کہ زبان و بیان کے چٹخارے ان میں شامل نہیں ہیں۔ مختصر مختصر سی، سادہ و پُرکار تحریریں قاری کے ذہن کو ایک لمحے کے لیے ہی سہی، چونکاتی ضرور ہیں۔ منور ہاشمی اپنی ان حکایات میں براہِ راست تلقین، نصیحت یا وعظ کرتے نظر نہیں آتے ہیں تاہم غیر محسوس طریقے پر پڑھنے والے کے دل میں ضرور اُتر جاتے ہیں:

ع: میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جائے عبرت ہے خاکدانِ جہاں

انور مسعود

منور ہاشمی نے انشائیے نہیں لکھے اور یہ بہت اچھا کیا۔ ایسے پھڈے میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی جس کی تعریف (DEFINATION) کرتے کرتے عمریں بیت جائیں اور کچھ ہاتھ نہ آئے۔

منور تجرید کی دُھند سے بھی گریزاں رہا۔ اس لیے کہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اس نے سادہ زبان میں روزمرہ کے سچے واقعات تحریر کیے ہیں۔ اس کا ایک واضح مقصد یہ ہے کہ قاری پر سوچ کے کچھ دریچے کھل جائیں اور اس کے اندر ایک ذمہ دارانہ روش اختیار کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔

ان واقعات کے پس منظر میں خوفِ خدا سے لبریز ایک جاگتا ہوا ضمیر دکھائی دیتا ہے۔ ایک قلبِ حساس نظر آتا ہے جو کسی کو دکھ میں نہیں دیکھ سکتا۔ ایک ایسی روح کا احساس ہوتا ہے جو برائی سے بیزار ہے اور نیکی سے والہانہ پیار کرتی ہے۔ وہی برائی جسے ''منکر'' کہا گیا ہے کہ انسانی فطرت اُس سے کراہت محسوس کرتی ہے۔ وہی نیکی جسے ''معروف'' کہا گیا ہے کہ ساری دنیا اچھا سے جانتی اور پہچانتی ہے۔

منور ہاشمی ان واقعات میں دردمندی اور بے لوثی کی تلقین کرتا ہے۔ اُسے اپنا وہ فائدہ ہرگز عزیز نہیں جس میں کسی دوسرے کا ذرہ برابر بھی نقصان ہو۔ ''دوسرے'' کا لفظ میں نے استعمال کیا ہے۔ منور ہاشمی کے ہاں ایسی کوئی تفریق نہیں۔ اُس کا ایمان ہے کہ:

ع: بنی آدم اعضائے یک دیگرند

وہ چاہتا ہے کہ انسان وقتی اور ناجائز منفعت کے بدلے ابدی خسارے کا سودا نہ کرے۔ اس لیے کہ یہ اس کے شرفِ انسانی کی توہین ہے۔ ہر واقعہ خیال انگیز بھی ہے اور غفلت میں پڑے ہوئے مرکبِ جان کے لیے مہمیز بھی۔ بعض واقعات کے مطالعے سے میر کا یہ شعر بے ساختہ یاد آتا ہے:

جائے عبرت ہے خاکدانِ جہاں
تُو کہاں منہ اٹھائے جاتا ہے

مشاہداتِ ہاشمی

علامہ ابوالوفا حجازی

میں حضرت محشر رسولنگریؒ کے عقیدت مندوں میں سے ہوں۔ منور ہاشمی کے ساتھ میری پہلی ملاقات کوئٹہ میں کئی سال پہلے ہوئی تھی اور وسیلہ اس ملاقات کا حضرت محشر ہی تھے۔ میں نے ان کی زبان سے کسی اور شخص کی اتنی تعریف نہیں سنی جتنی منور ہاشمی کی۔ منور ہاشمی ان دنوں کوئٹہ کے ایک روزنامہ میں ادارت کے فرائض ادا کرتے تھے۔ میں کوئٹہ جب بھی جاتا، ان سے ضرور ملتا بلکہ اپنے قیام کے دوران کئی کئی دفعہ ملتا اور منور ہاشمی جب کبھی یہاں آتے، مجھے ضرور ملتے۔ ہمارا یہ تعلق دل اور روح کا تعلق تھا۔

محشر صاحب کی محفل میں وہ اپنی غزلیں سنایا کرتے تھے اور محشر صاحب بھی جب کبھی کوئی شعر کہتے، انھیں ضرور سناتے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ منور ہاشمی کی شہرت کا ذریعہ ان کی شاعری ہے اور شاعری میں غزل ان کا خاص میدان ہے۔ اپنے انفرادی رنگ اور لہجے کے باعث وہ ملک کے اندر اور باہر شہرت رکھتے ہیں۔ میرے ساتھ ان کی جو تازہ ترین ملاقات کراچی میں ہوئی، اس میں بھی میں نے ان کی پرانی غزلیں فرمائش کر کے سنیں۔ وہ بیرونِ ملک مشاعروں میں شرکت کر کے آرہے تھے اور میں اندرونِ ملک ہی عازمِ سفر ہو رہا تھا۔ انھوں نے اس موقع پر مجھے "حکایاتِ ہاشمی" کا مسودہ دیا۔ انھوں نے مجھے ہرگز ہرگز نہیں کہا کہ میں اس پر کچھ لکھوں، میں نے کچھ واقعات پڑھنے کے بعد از خود انھیں خط لکھا کہ میں ان کے بارے میں کچھ تاثرات قلم بند کروں گا اور اگر آپ کتاب چھاپیں تو میرے تاثرات اس میں ضرور شامل کریں۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ "حکایاتِ ہاشمی" کو ضرور شائع ہونا چاہیے۔ ان کے پڑھنے سے وہ شخص ضرور حیران ہوگا جو منور ہاشمی کو صرف ایک شاعر کی حیثیت سے جانتا ہے اور ایک صحافی کی حیثیت سے پہچانتا ہے کیوں کہ آج کے دور کے صحافیوں اور شاعروں کی اکثریت کے بارے میں سب جانتے ہیں۔ شاعروں، صحافیوں اور ادیبوں میں اچھائی کردار لوگ بھی موجود ہیں، جن کے باعث ان شعبوں کی عزت بھی کی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے لوگوں کی ایک ممتاز مثال منور ہاشمی کی شخصیت ہے۔ وہ ایک نوجوان ہیں مگر میں تو ان کو بزرگوں سے زیادہ متفکر دیکھتا ہوں۔ آج کا نوجوان جس بے راہ روی کا شکار ہے، اس نے معاشرے کو تباہی سے ہم کنار کر دیا ہے مگر خدا کا شکر ہے کہ نوجوانوں کے گروہ میں بھی کوئی سیدھے راستے کا مسافر مل جاتا ہے۔

''حکایاتِ ہاشمی'' پڑھ کر اس شخص کو کوئی حیرانی نہیں ہوتی جو منور ہاشمی کو ذاتی طور پر جانتا ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی حکایات ہیں جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا، جو کسی کا دل نہیں دکھاتا، جو اپنے آپ کو پریشانی میں مبتلا کر کے دوسروں کو خوشیاں دیتا ہے، جو زندگی کو ایک امانت اور ذمہ داری سمجھتا ہے، جو قیامت کے دن کی حقانیت کو دل میں بٹھائے رکھتا ہے۔ جو اللہ سے ڈرتا ہے اور اللہ کے پیارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے دلی وابستگی رکھتا ہے، جس کو وطن کے ذرّے ذرّے سے پیار ہے اور جس کا وطن کے نظریے پر پختہ ایمان ہے۔

کیا اس معاشرے میں ایسے شخص کی تلاش ممکن ہے جس نے زندگی میں ایک مرتبہ بھی کھڑے ہو کر پیشاب نہ کیا ہو اور وہ صرف اسی جگہ پیشاب کرتا ہو جہاں طہارت کے لیے پانی دستیاب ہو اور جو بینک میں صرف کرنٹ اکاؤنٹ کھولتا ہو۔ یہ ایک معمولی سی بات ہے مگر ہم کبھی اس کا خیال نہیں رکھتے اور جو شخص اس جیسی معمولی سے معمولی باتوں کا بھی خیال رکھتا ہو، اس کے کردار کے بارے میں مزید کسی شہادت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ''حکایاتِ ہاشمی'' منور ہاشمی کی اپنی زندگی کے واقعات ہیں جنھیں انتہائی سادگی اور بغیر کسی ادبی چاشنی کے پیش کر دیا گیا ہے۔ شاید اس لیے کہ ان کے اندر موجود پیغام ہر پڑھنے والے تک آسانی سے پہنچ جائے۔ حالانکہ منور ہاشمی اگر چاہتے تو ان واقعات کو افسانوں میں ڈھال کر ادبی شہ پارے بنا کر پیش کر سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ وہ ان سچے واقعات کو افسانوی رنگ دے کر ان کی اہمیت کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب میں میرے نام کی اشاعت میرے لیے سعادت سے کم نہیں ہوگی۔

میری دلی دعا ہے کہ اللہ منور ہاشمی کے پیغام اور کلام میں برکت عطا فرمائے اور انھیں ہر قدم پر کامیابیوں سے نوازے۔ آمین

منظوم خراجِ تحسین:

"عظیم الشاں"، قبیلے کا نگیں ہے

سعادت حسن آس

"عظیم الشاں" قبیلے کا نگیں ہے
منور ہاشمی صد آفریں ہے
خلوص و پیار کے کھلتے چمن میں
مہکتی زندگی کی گل زمیں ہے
وہ بولے تو زباں سے شہد ٹپکے
سراپا عجز ہے، خندہ جبیں ہے
عقیدت ہی عقیدت اس کا شیوہ
محبت ہی محبت اُس کا دیں ہے
جو اس کو دیکھ لے ہوجائے اُس کا
ہر اک خُو اُس کی ایسی دلنشیں ہے
مثال اس کی کہاں سے لے کے آؤں
وہ ہر اک شخص کے دل میں مکیں ہے
جسے مل جائے آسؔ اس کی محبت
ضرورت اُس کو پھر کچھ بھی نہیں ہے

خراجِ عقیدت پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی کے لیے

ڈاکٹر محمود حیدر
(جدہ، سعودی عرب)

ظلمتِ فن میں روشن اختر ایک منور ہاشمی
جادۂ فن کا نقشِ خوش تر ایک منور ہاشمی
اس کے سارے شعروں سے ایک وجود اُبھرتا ہے
ایک حقیقت ، ایک سخنور ، ایک منور ہاشمی
شعر و سخن کی دنیا میں تختِ سخن پر بیٹھا ہے
عزم و عمل کا روشن پیکر ، ایک منور ہاشمی
رشکِ سخن ، مہتابِ منور، جس دل میں بھی اُترے تو
رہتا ہے تا دیر منور ، ایک منور ہاشمی
جو بھی اوڑھے اپنے من پر، اس کی زینت بڑھ جائے
شعر و ادب کی دل کش چادر ، ایک منور ہاشمی
شعر و سخن کی شمع ہے جو جلتی ہے ادراک کے ساتھ
روشن جس سے سارے ہم سر ، ایک منور ہاشمی
چرچے ہیں اب شہر میں اس کے، شہرت اس کی علم و ہنر
علم و ہنر تہذیب کا دفتر ،ایک منور ہاشمی
چمکا ہے تحسینِ سخن کے دامن میں اکثر حیدرؔ
عظمتِ فن کا یکتا گوہر ، ایک منور ہاشمی

خراجِ عقیدت

آفتاب ترابی

(جدہ، سعودی عرب)

شہرِ افکار میں تُو تنہا قلندر ٹھہرا
اور دنیائے سخن میں تو سمندر ٹھہرا

فن کا ضرغام ہوا ، علم کا صفدر ٹھہرا
تو کہ ملبوسِ غزل میں بھی غضنفر ٹھہرا

تیرے اشعار سے اقبال کی خوشبو آئے
بعد اقبال ، خودی کا تو پیمبر ٹھہرا

لفظ کی بھیک ہزاروں کو عطا کرتا ہے
دورِ اخلاص میں تو سب سے تونگر ٹھہرا

روحِ اقبال نے بھی تیری پذیرائی کی
میری آنکھوں میں ابھی تک ہے وہ منظر ٹھہرا

جب بھی یلغار ہوئی علم کے ایوانوں پر
تُو کہ تنہا تھا مگر وقت پہ لشکر ٹھہرا

تُو ہی مہتاب ہے افلاکِ سخن کا بے شک!
جو اماوس کی شبوں میں بھی منور ٹھہرا

محترم ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب کے لیے چند اشعار

(تقریب بر موقع جدہ سے پاکستان مستقل منتقلی)

محمد مختار علی

دل میں یوں تیری محبت کا دیا روشن ہے
آتشِ رنگ سے جیسے یہ فضا روشن ہے

اُس سے کیا ہے مرا رشتہ مجھے معلوم نہیں
جس سے مل کر مرے ہونٹوں پہ دعا روشن ہے

تم چلے جاؤ گے اور ہم یہ پکاریں گے کہ ہاں!
اب کہیں دُور وہ قندیلِ وفا روشن ہے

کوئی تو واقفِ تہذیبِ سخن بھی ہے یہاں
شہرِ خاموش میں کوئی تو صدا روشن ہے

بڑھتے جاتے ہیں سبھی منزلِ اُردو کی طرف
ہر قدم پر ترا نقشِ کفِ پا روشن ہے

تُو نے جو بات بھی کی، اُس میں عجب حکمت تھی
تُو نے جو لفظ بھی لکھا، بخدا روشن ہے

تیرے جگراتے بناتے رہے جو منظرِ خواب
نامکمل ہی سہی ، پھر بھی بڑا روشن ہے

نورِ اخلاص ہے اطراف میں جس کے مختارؔ
اُس سے مل کر مری سادہ سی قبا روشن ہے

ڈاکٹر سید منور ہاشمی کی جدہ سے روانگی کے موقع پر

شوکت جمال

منوّر ہاشمی کی رخصتی کا وقت آیا ہے
دعاؤں میں ذرا دریا دلی کا وقت آیا ہے
لگا کر دل وہ ہم سے، جا رہے ہیں اب وطن اپنے
وہاں والوں سے بھی اب دل لگی کا وقت آیا ہے
بڑی مدت گزاری آپ نے ان رہگزاروں میں
سو اب نتھیا گلی کا اور مری کا وقت آیا ہے
معقّب کی نہیں ہوگی سہولت اُس جگہ بالکل
بدستِ خود ہی اپنی پیروی کا وقت آیا ہے
گئے اہلِ قلم جدہ سے کتنے سُرخ رو ہو کر
لو اب شوکتؔ منور ہاشمی کا وقت آیا ہے

ہدیۂ تہنیت

(پروفیسر سید منور ہاشمی کے پی ایچ ڈی مکمل کرنے پر اُن کی تقریب تہنیت میں پڑھی گئی)

حبیب صدیقی

زیست ہے گریاں مسلسل یورشِ آلام پر
عزم لیکن خندہ زن ہے گردشِ ایام پر
آسماں میں بستیاں تعمیر کرلینے کا عزم
جگمگاتی کہکشاں تسخیر کرلینے کا عزم
اپنا سکہ سارے عالم میں رواں کرنے کا عزم
چند روزہ زندگی کو جاوداں کرنے کا عزم
علم کی بنیاد پر تعمیر ہوتے ہیں یہ خواب
علم سے شرمندۂ تعبیر ہوتے ہیں یہ خواب
جذبۂ صادق کو ذوقِ گفتگو دیتا ہے علم
فکرِ انسانی کو عزمِ جستجو دیتا ہے علم
لب پر ''اقرا'' آتے ہی در کھل گیا وجدان کا
اپنے خالق سے تعارف ہوگیا انسان کا
آج کا دن کیجیے مردانِ باہمت کے نام
آج کی تقریب اہلِ علم کی عظمت کے نام
آیئے سید منور ہاشمی کو داد دیں
منصبِ علمی کے پانے پر مبارک باد دیں
خوب ہے تحقیقِ علمی کے لیے عنوانِ کار
شاعرِ مشرق بطورِ شاعرِ فطرت نگار
نسبتِ اقبال نے یہ تہنیت لکھوائی ہے
اور اسی نسبت سے فکر و فن کی یہ رعنائی ہے

ڈاکٹر منور ہاشمی کے لیے

محمود ناصر

پیار لہجے میں تو ہونٹوں پہ دعا رکھی ہے
زندگی آپ نے گلزار بنا رکھی ہے

جو بھی آتا ہے، وہ جاتا ہے منور ہوکر
آپ نے بزم ہی کچھ ایسی سجا رکھی ہے

شاعری ہو کہ ہو تحقیق کہ تنقید ،نہ پوچھ
ہر جگہ آپ نے پہچان جدا رکھی ہے

روشنی آپ کے اک ایک سخن سے لے کر
اپنے افکار کی قندیل جلا رکھی ہے

دن کا کچھ ذکر نہیں، رات کی کچھ بات نہیں
اُس نے آنکھوں میں نئی صبح بسا رکھی ہے

اُس کی مرضی ہے وہ جب آئے، جدھر سے آئے
''میں نے ہر سمت سے دیوار گرا رکھی ہے''

اُس کے اندازِ تکلم پہ فدا ہوجائیں
اُس نے ہر سامع پہ کیا دھاک بٹھا رکھی ہے

دشمنِ جاں کو بھی سینے سے لگایا ناصرؔ
تُو زمانے میں بھی سادات نے کیا رکھی ہے

میرا باطن بھی منور ہو گیا

عزیز طارق

''قرب جب اس کا میسر ہو گیا''
میرا باطن بھی منور ہو گیا

یہ تری چشمِ کرم کا فیض ہے
ایک ذرّے سے میں گوہر ہو گیا

ابر ہے یہ، پیڑ ہے یا پیار ہے
جس کا سایا میرے اوپر ہو گیا

تم سے مل کر مطمئن ہوں اس طرح
جیسے کوئی معرکہ سر ہو گیا

حبس جب زندان کا حد سے بڑھا
ایک دم دیوار میں در ہو گیا

اظہارِ عقیدت استادِ محترم
ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب کے لیے

شمسہ نورین

عمدہ ہے وہ شاعر بھی تو انساں بھی بڑا ہے
وہ عجز کی ،اخلاص کی مٹی سے گندھا ہے
مونس ہے، وہ غم خوار ہے اور راہ نما ہے
استاد ہے، پیغمبری پیشے سے جڑا ہے
مالائیں سدا علم کی اس نے ہیں پروئیں
اور کتنے ہی اذہان کو خوشبو سے بھرا ہے
نعتوں کے چراغ اس نے جلائے ہیں بہت سے
گلزارِ غزل کتنے ہی پھولوں سے لدا ہے
یوں تو ہیں بہت نام یہاں علم وسخن میں
اس جیسا مگر کم ہی کوئی دیکھا سنا ہے
ہو علم و ہنر دانش وحکمت میں اضافہ
ہو عمرِ خضر تجھ کو عطا ،میری دعا ہے

نذرِ منور

حسین امجد

رحمت کی گھٹا برسے ہر اک آن منور
پورے ہوں تیرے دل کے بھی ارمان منور

مہتاب کی رنگت میں ڈھلا تیرا سراپا
خورشید بکف ہے ترا وجدان منور

الفاظ ترے ابرِ گہربار کی صورت
احساس میں ڈوبا ہوا دیوان منور

چہرے کی ضیا پر تری ، آنکھوں کی حیا پر
سو بار دل و جان سے قربان ، منور !

اتریں ترے آنگن میں سدا رنگ بہاریں
خوشبو سے مہکتا رہے دالان منور

صد شکر مدینے کا انھیں اذن ملا ہے
صد شکر وہاں کے رہے مہمان منور

انتخابِ کلام ڈاکٹر منور ہاشمی:

نعت رسولِ مقبولؐ

حشر کے روز اگر مجھ کو اُٹھایا جائے
لا کے سرکار قدموں میں گرایا جائے
جس میں رہتا ہو کوئی سیدِ عالم کا غلام
ایسے گھر کا مجھے دربان بنایا جائے
بارہا آپ کی رحمت نے بلایا ہے مجھے
بارہا اور مجھے در پہ بلایا جائے
آپ کے نقشِ کفِ پا سے رہے جو روشن
اک مدینہ مرے سینے میں بسایا جائے
زندگی ایک سفر اور مدینہ منزل
اس سے آگے کوئی رستہ نہ دکھایا جائے
خاک اُٹھی ہے مدینے سے منوّر میری
خاک کو میری مدینے میں سلایا جائے

سلام

حسین دل ہے حرم کا ، حسین جانِ حرم
حسین شانِ حرم تاجِ دودمانِ حرم

حرم سے نور کا اک کارواں روانہ ہوا
اور ایک نور ہے سالارِ کاروانِ حرم

جگہ جگہ یہ ہے خطبہ قدم قدم پہ دعا
چلے ہیں جانبِ کوفہ مسافرانِ حرم

فرشتے جس کی عبادت پہ رشک کرتے ہیں
حسین کون ہے؟ سلطانِ عابدانِ حرم

خدائی بھول چکا تھا رسول کا دشمن
یزید کون تھا؟ سردارِ باغیانِ حرم

مرا نصیب منوّر ہے رشک کے قابل
ہوا ہوں شاملِ فہرستِ شاعرانِ حرم

''غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسمٰعیل''

غزلیں

(۱)

دلِ حزیں میں جو ارمان کوئی مرتا ہے
پلک سے گر کے کوئی خواب بھی بکھرتا ہے
نبی نہیں ہوں، ولی بھی نہیں مگر پھر بھی
ہر ایک رات مرے دل میں کچھ اُترتا ہے
اگر وہ اُٹھ کے سحر دم نہ آئینہ دیکھے
تو آئینہ بھی مچلتا ہے، یاد کرتا ہے
زمانے بھر میں کسی کا بھی ڈر نہیں اُس کو
وہ خالی ہاتھ جو اپنے خدا سے ڈرتا ہے
رہِ غلط پہ چلا ہوں اگر میں سہواً بھی
مرا ضمیر مجھے انتباہ کرتا ہے
غمِ حیات ہے مجھ کو عزیز رشتے سے
اسی سے ذوقِ تغزل مرا نکھرتا ہے

(۲)

اسی سے زیست کا سارا نظام چلتا ہے
جو ہم نے داغِ تمنا سنبھال رکھا ہے
نہ جانے کون ہے، کب اور کہاں سے آئے گا
وہ درد مند کہ جس سے لپٹ کے رونا ہے
فلک پہ چاند ہمیشہ یہ سوچتا ہوگا
زمیں پہ کون سرِ شام جگمگاتا ہے
ہے عکسِ چہرۂ گل جس کو صبح کہتے ہیں
میں جس کو کہتا ہوں گل وہ تمھارا چہرہ ہے

(۳)

اگر ہم زندگی کے خواب سے بیدار ہوجاتے
اجل کی قوتوں سے برسرِ پیکار ہوجاتے

اجازت ہم کو گر ملتی نئے رستے بنانے کی
ہمارے سامنے کہسار بھی ہموار ہوجاتے

بہت آسان تھے ہم اس لیے سستے ملے تم کو
بڑھا سکتے تھے ہم قیمت اگر دشوار ہوجاتے

ہمارے گرد چہروں کی اگر پہچان ہوجاتی
ہمارے نام نقشِ ہر درو دیوار ہوجاتے

بہت ایفائے وعدہ کے لیے تکرار کی ان سے
کبھی گلنار بن جاتے کبھی تلوار ہوجاتے

تمھارے بارِ غم سے ہے توازن زندگانی کا
نہ تم ملتے تو اپنے آپ پر ہم بار ہوجاتے

کبھی خود کو منوؔر دیکھتے ہمدرد نظروں سے
کبھی اپنی محبت میں بھی کچھ اشعار ہوجاتے

(۴)

اداس دل میں یہ ارماں بہت پرانے ہیں
جو خواب لکھ نہیں پائے تمھیں سنانے ہیں

ہماری دانش و بینش کہیں نہ کام آئی
گھروں میں جن کے ہیں دانے، وہی سیانے ہیں

یہ ابرو باد، یہ رم جھم، یہ شام کا منظر
تمھاری یاد کے کیسے حسیں بہانے ہیں

ہر ایک مصرعہ نئی داستاں سناتا ہے
یہ میرے شعر نہیں ہیں، ترے فسانے ہیں

ابھی کچھ اور بھی کرنا ہے اعتبارِ وفا
ابھی کچھ اور بھی ہم کو فریب کھانے ہیں

مرے وجود کی تفہیم ہو رہی ہے ابھی
جو آنے والے ہیں سارے مرے زمانے ہیں

ہزار شہر بسے ہیں دعاؤں سے جن کی
ان اہلِ فقر کے جنگل میں آستانے ہیں

(۵)

وسعتِ کائنات اپنی جگہ
میری اپنی بساط اپنی جگہ
بڑھتی جاتی ہے دل کی تنہائی
رونقِ شش جہات اپنی جگہ
ہم تو آئے ہیں دیکھنے تجھ کو
کاروبارِ حیات اپنی جگہ
تبصرے اک طرف زمانے کے
آپ کی اپنی بات اپنی جگہ
زندگی آرزوئے وصل کا نام
ہجر کے غم کی رات اپنی جگہ
گلشنِ دل کے پھول پژمردہ
خوشبوؤں کی برأت اپنی جگہ

(۶)

دل یہ چاہے ہے کہ محبت کو نئی شان ملے
تو جو آجائے تو اک جسم کو اک جان ملے
قریۂ جاں میں ذرا بھیس بدل کر جائیں
وہ کسی اور کے دھوکے میں ہمیں آن ملے
اس کی یادوں کا خزانہ مرے ہاتھ آیا ہے
جیسے نادار کو ہیروں کی کوئی کان ملے
نیک نامی ہو کہ رسوائی ہو، جو کچھ بھی ہو
میری خواہش ہے ترے نام سے پہچان ملے
ہم فقیروں کو ترے در کی گدائی درکار
یہی منصب ،یہی رتبہ ہو یہی شان ملے

(۷)

زندگی کے نقش میں ترمیم کرنے کے لیے
آ بھی جاؤ پیار کی تجسیم کرنے کے لیے

اک خطِ تنسیخ کی مانند ہے ہر اک سڑک
ساکنانِ شہر کو تقسیم کرنے کے لیے

کوہساروں کی طرح کا حوصلہ درکار ہے
یہ شکستِ جسم و جاں تسلیم کرنے کے لیے

صاحبانِ تخت کو نیچے اُترنا چاہیے
اہلِ عجز و فقر کی تعظیم کرنے کے لیے

اے سفیرانِ محبت، ایک مدت چاہیے
دل کے اندر درد کی تنظیم کرنے کے لیے

(۸)

کس کو معلوم غمِ دل کی حقیقت کیا ہے
ہجر کی رات بتاتی ہے محبت کیا ہے
اس نے دیکھا ہے مجھے آنکھ اٹھا کر اک بار
اس سے بڑھ کر بھری محفل میں سخاوت کیا ہے
ہم نے سوچا تھا کہ جو دل میں ہے، جا کر کہہ دیں
جا کے سوچا وہاں ،اب دل کو شکایت کیا ہے
خواب میں دیکھا ہے اک روئے منور میں نے
رات معلوم ہوا مجھ کو، تلاوت کیا ہے
ایک مشہور ہے دنیا میں حکایت دل کی
ایک مستور ہے دل میں وہ حکایت کیا ہے؟
وہ یہ کہتا ہے اسے بھی ہے محبت مجھ سے
میرے احوال یہ کہتے ہیں صداقت کیا ہے؟

(۹)

خانۂ دل میں جس قدر غم ہے
وہ مرے ظرف سے بہت کم ہے
اس کے کوچے کا اب یہ عالم ہے
کوئی بے دل ہے، کوئی بے دم ہے
تم مرے پاس ہو، تسلی کو
پھر مری آنکھ کس لیے نم ہے
جل رہا ہے چراغ ہستی کا
روشنی ہے اگرچہ کم کم ہے
آج پھر زندگی ہے الجھی ہوئی
آج پھر زلف کوئی برہم ہے
جس پہ تصویر ہے منوّر کی
عصرِ نو کی غزل کا پرچم ہے

(۱۰)

تری راہ میں کھڑا ہوں ، کسی کام کے بہانے
کہ ذرا سی بات کر لوں میں سلام کے بہانے
مجھے کون جانتا ہے ، مجھے کون مانتا ہے
مرا نام ہو رہا ہے ترے نام کے بہانے
کوئی تیرا عہد و پیماں کبھی ہو سکا نہ پورا
کبھی صبح کے بہانے ، کبھی شام کے بہانے
تری جاں بھی چھوٹ جائے ، مری جاں بھی چھوٹ جائے
مجھے زہر ہی پلا دے کسی جام کے بہانے
سرِ راہ روشنی ہو رُخِ یار کی منوؔر
جو مری گلی میں آئے ، وہ خرام کے بہانے

(۱۱)

خیال و خواب کی دنیا سے ہم گذر بھی گئے
جہاں ٹھہر نا تھا ہم کو وہاں ٹھہر بھی گئے

ہمارے ساتھ رہے زندگی کے ہنگامے
جہاں جہاں سے بھی گذرے جدھر جدھر بھی گئے

ترے خیال کا دریا اُتر نہ پایا مگر
ترے خیال کے دریا میں ہم اُتر بھی گئے

زمانہ لاکھ ہماری مخالفت میں رہا
جو کام کرنا تھا ہم کو وہ کام کر بھی گئے

محبتوں میں بھی لازم ہے اعتدال کا رنگ
خلوص حد سے بڑھا جب تو لوگ ڈر بھی گئے

تمھارا نام اسی واسطے تو زندہ ہے
تمھارے نام پہ مرنا تھا جن کو مر بھی گئے

غمِ زیاں کے سوا کچھ نہیں ہے منزل پر
سفر کا لطف گیا اور ہم سفر بھی گئے

ہم ایسے لوگ منوّر کہاں سے آئیں گے
جو پستیوں میں رہے اور فراز پر بھی گئے

(۱۴)

سب کی آواز میں آواز ملا رکھی ہے
اپنی پہچان مگر سب سے جدا رکھی ہے
جانے کس راہ سے آ جائے وہ آنے والا
میں نے ہر سمت سے دیوار گرا رکھی ہے
ایسا ہوتا ہے کہ پتھر بھی پگھل جاتا ہے
تُو نے سینے میں مگر چیز یہ کیا رکھی ہے
زخم خوردہ سہی ، افسردہ سہی اپنی جبیں
جیسی بھی ہے تیری دہلیز پہ لا رکھی ہے
اُس نے مجھ سے بھی تری ساری کہانی کہہ دی
جس نے تجھ کو مری ہر بات سنا رکھی ہے
میرے سینے میں منوّر ہے اُسی شوخ کا غم
جس کے سینے میں میرے غم کی دوا رکھی ہے

(۱۳)

اِک اجنبی کو اپنا بنانے کے واسطے
ہم نے دیے ہیں سارے زمانے کے واسطے

میرے لہو کی اس کو ضرورت ہے آج کل
کچھ رنگ چاہیے ہے فسانے کے واسطے

جو اُس نے اپنے گھر کا بتایا ہے راستہ
آنے کے واسطے ہے نہ جانے کے واسطے

میری نظر میں کچھ بھی نہیں ہے سوائے دل
سارے جتن ہیں اس کو منانے کے واسطے

یہ سوچنے میں اس نے گزاری ہے زندگی
کیا کیا کرے وہ مجھ کو ستانے کو واسطے

کتنے ہی جھوٹ گھڑ کے سنائے گئے مجھے
بس ایک جھوٹ مجھ سے چھپانے کے واسطے

روتے ہیں اس لیے کہ خوشی دشمنوں کو ہو
ہنستے ہیں دوستوں کو ہنسانے کے واسطے

اس کی نظر کا رنگ نظر میں ملا لیا
اپنی نظر سے خود کو گرانے کے واسطے

لائیں کہیں سے تازہ خیالات روز روز
تازہ غزل کسی کو سنانے کے واسطے

ہونا پڑا ہے مجھ کو منوّر زمیں سے پست
اس کا مقام خود سے بڑھانے کے واسطے

(۱۴)

ایک ہی مسئلہ تا عمر مرا حل نہ ہوا
نیند پوری نہ ہوئی خواب مکمل نہ ہوا

شہرِ دل کا جو مکیں ہے وہ بچھڑتا کب ہے
جس قدر دُور گیا آنکھ سے اوجھل نہ ہوا

آج بھی دل کی زمیں خشک رہی ، تشنہ رہی
آج بھی مائلِ الطاف وہ بادل نہ ہوا

روشنی چھَن کے تیرے رُخ کی نہ مجھ تک پہنچے
ایک دیوار ہوئی یہ کوئی آنچل نہ ہوا

جن کو اک عمر کا نذرانہ دیئے بیٹھے ہیں
آج تک اُن سے تعارف بھی مفصّل نہ ہوا

اُن سے ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں پھر ملتے ہیں
زندہ رہنے کا عمل ہم سے مسلسل نہ ہوا

جس پہ رکھنی تھی مجھے اپنی اساسِ ہستی
اپنی قسمت میں منوّر وہی اک پل نہ ہوا

(۱۵)

خود کو پھر تیرے طلب گاروں میں شامل کرتے
پہلے ہم دل کو ترے درد کے قابل کرتے

اپنی گردن کے برابر کوئی شمشیر لیے
ہم سرِ صبح طوافِ کوئے قاتل کرتے

کل جو پندار کی دستار لیے پھرتے تھے
تیرے کوچے میں وہی پھرتے ہیں دل دل کرتے

ہم کو مل سکتا جو تو کد و کاوش کے بغیر
یہ بھی ممکن تھا کہ ہم تجھ کو نہ حاصل کرتے

ہم جو فطرت کو بدل دینے کی رکھتے قدرت
موجِ بے تاب کو آسودۂ ساحل کرتے

دل کا کشکول لیے در پہ صدا دیتے رہے
اور کیا تیری گلی میں تیرے سائل کرتے

زیست کو اپنی ہی کوشش سے بنایا دشوار
کام آسان بھی ہوتا اسے مشکل کرتے

اس کے دل میں بھی منور ہے بچھڑ جانے کا غم
ورنہ آنکھوں میں ستارے سے نہ جھلمل کرتے

پشتو تراجم:

غزل

سفر حیات کا کچھ اس طرح تمام ہو گیا
ہوئی ہے رات جس جگہ، وہیں قیام ہوگیا

ملا بھی وہ تو اس کے ساتھ مل سکے نہ ٹھیک سے
کبھی سلام تک رہے، کبھی کلام ہوگیا

تری گلی میں قتل ہو گیا ہوں میں تو ٹھیک ہے
ترا بھی کام ہو گیا، مرا بھی کام ہو گیا

مری نظر میں تو نہیں تری نظر میں ،میں نہیں
عجیب طرز فکر شہر بھر میں عام ہو گیا

یہاں تک آ گئے ہیں اس کی تہمتوں کے سلسلے
ہوا بھی تیز چل پڑی تو میرا نام ہوگیا

میں ہاشمی نہیں مروں گا مر کے بھی یہ دیکھنا
مرے دوام کا سبب مرا کلام ہو گیا

غزل

دل میں تیرے خیال کی خوشبو
ہجر میں ہے وصال کی خوشبو

دل کے جذبے جوان رکھتی ہے
تیرے حسن وجمال کی خوشبو

کاش! تیرے جواب سے آئے
میرے ہر اک سوال کی خوشبو

کاش! تجھ کو بھی ہو کبھی محسوس
میرے ناگفتہ حال کی خوشبو

مجھ کو اپنے زوال میں سے بھی
آرہی ہے کمال کی خوشبو

ہم فقیروں سے دور رہتی ہے
حشمت و جاہ و مال کی خوشبو

پھول سے آرہی ہے جو سب کو
اصل میں ہے نہال کی خوشبو

ہے منور تمھارے ہونٹوں میں
اک پری رُخ کے خال کی خوشبو

منظوم ترجمہ

زړه کښې لرمه ستا د خیال خوشبو
هجر خوږه لری وصال خوشبو

د زړه جذبې مې هم ودانې لري
ستا د خاحست أو د جمال خوشبو

کاش! چې ستا د جوابونو راشي
زما د هر یو مشکل سوال خوشبو

کاش! چې تاته هم احساس اوشي لک
زما د دښې خراب حال خوشبو

ماته د خپل زواله هم رارسي
ستا د ښائست أو د کمال خوشبو

زمونږ غریبو په قسمت کښې نشته
د رعب أو داب أو د جلال خوشبو

ن د دې ګلو نه راغلې دلته
خو ده په اصل د نهال خوشبو

شته منوره! ستا په شونډو بالدې
د ښاپېرۍ د تک شین خال خوشبو

عبید غیور

منظوم ترجمہ

د ژوند سفر مې څه دا رنګې تمام شو
چې کوم ځائے شهه راغله نو هلته کښې قيام شو

ملاو شوئے ورسره لا پوره نه يم
صرف يو نيمه خبره اؤ سلام شو

ستا کوخه کے که مې ژوند بانيلو نو خير دے
ن د دوارو دغه يو ارمان تمام شو

مونګه دواړه د يو بل نظر کښې نه يو
دا عجيب انداز په ښار کښې ن دير عام شو

تر دې حده سلسله د تهمت راغله
ن سبا د هر چا خله باندې مې نام شو

زه هاشمي به نه مر کيرم دا به وينې
دا شعرونه مې سبب د خپل دوام شو

عبید غیور

Dhanak Rang (5)

Daud Tabish, Sajjad Hussain Sarmad

"دھنک رنگ" کے مدیرِ اعلیٰ، منفرد لب و لہجے کے شاعر

داؤد تابش کا دوسرا شعری مجموعہ

نواحِ درد

عنقریب منصۂ شہود پر آجائے گا۔